پیغمبر اسلام ﷺ
اور
بنیادی انسانی حقوق
جناب حکیم محمود احمد ظفر
بیت العلوم

پیغمبرِ اسلام ﷺ

اور

بنیادی انسانی حقوق

پیغمبر اسلام ﷺ

اور

بنیادی انسانی حقوق

جناب حکیم محمود احمد ظفر

بیت العلوم

۲۰- نابھہ روڈ، پرانی انارکلی، لاہور۔ فون [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب

پیغمبر اسلام ﷺ
اور
بنیادی انسانی حقوق

مؤلف

جناب حکیم محمود احمد ظفر

باہتمام

سید محمد ناظم اشرف

ناشر

بیت العلوم
۲۰- نابھہ روڈ، پرانی انارکلی لاہور

فہرست

تقدیم

اس وقت دنیا میں انسانی حقوق کا شور مچا ہوا ہے اور دنیا میں مختلف تنظیمیں اور این جی اوز اس بات کا دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم نے دنیا میں انسانی حقوق کو روشناس کرایا، حالانکہ آج سے چودہ سال قبل رسول اللہ ﷺ نے مختلف قدغنوں اور پابندیوں زنجیروں میں گرفتار دنیا کو انسانی حقوق سے آشنائی بخشی اور انہیں انسانیت کی قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حقوق کی دو قسمیں بتائیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد، حقوق اللہ سے مراد عبادات ہیں یعنی اللہ کے فرائض، اور حقوق العباد، باہم انسانوں کے معاملات اور تعلقات کا نام ہے۔ اسلام میں حقوق العباد کی اہمیت حقوق اللہ سے بھی کئی لحاظ سے زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہے۔ اس نے کفر اور شرک کے سوا ہر گناہ کو اپنے ارادہ اور مشیت کے مطابق معافی کے قابل قرار دیا ہے کیونکہ اس کی رحمت کا دروازہ کسی نیک و بد پر بند نہیں ہے، لیکن حقوق العباد یعنی انسانوں کے باہمی اخلاقی فرائض کی کوتاہی کی معافی اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں نہیں رکھی بلکہ انسانوں کے ہاتھ میں رکھی جن کے حق میں ظلم و تعدی ہوئی ہے اور جو دنیا میں اس کے ظلم کو سہتے رہے اور اللہ تعالیٰ سے فریاد کناں رہے۔ اب اللہ نے ان لوگوں کی معافی یا نامعافی کا معاملہ ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا جن پر ظلم ہوا، جن کے حقوق کو دنیا میں پامال کیا گیا، جن کا مال کھایا گیا، جن کی عزت و آبرو کو تاخت و تاراج کیا گیا، جن کی کشکول حیات کا سارا سرمایہ ان لوگوں نے لوٹ لیا، جنہوں نے زندگی بھر ان کو ایک لمحہ بھی آرام سے نہ بیٹھنے دیا۔ اللہ تو ارحم الراحمین ہے، وہ اپنے بندوں کے وہ تمام گناہ بخش سکتا ہے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی

ہدایات کی نافرمانی کرتے ہوئے کیے، لیکن بندے اتنے رحیم و کریم نہیں کہ وہ ان لوگوں کو معاف کر دیں جنہوں نے ان کے انسانی حقوق پر دنیا میں ڈاکہ ڈالا۔ وہ اس کا بدلہ ضرور لیں گے کیونکہ دنیا میں تو وہ بدلہ لینے کی ہمت اور استطاعت نہ رکھتے تھے لیکن آج تو احکم الحاکمین نے انہیں کھلی چھٹی دے رکھی ہے، لہٰذا وہ حقوق کو پامال کرنے والوں سے ضرور بدلہ لیں گے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا ہو تو اس ظالم بھائی کو چاہیے کہ اسی دنیا میں اس مظلوم بھائی سے اس کو معاف کرا لے، ورنہ وہاں تاوان ادا کرنے کے لیے کسی کے پاس کوئی درہم و دینار نہ ہوگا، صرف اعمال ہوں گے، ظالم کی نیکیاں مظلوم کو مل جائیں گی، اور اگر نیکیاں نہیں ہوں گی تو مظلوم کی برائیاں ظالم کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جائیں گی''۔ (بخاری)

اسلام میں ہر انسان پر دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں تک کے حقوق رکھے گئے ہیں جنہیں ہر انسان کو اپنے امکان کے مطابق ادا کرنا از حد ضروری قرار دیا گیا۔ علماء نے لکھا ہے کہ انسان کو دنیا کی ہر اس چیز سے جس سے اس کا کچھ بھی تعلق ہے یا جس سے اس کو کچھ بھی نفع اور فائدہ پہنچتا ہے، اس تعلق اور فائدہ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقی اور حفاظت میں کوشش کی جائے۔ اس شے سے وہ فائدہ اور نفع اٹھایا جائے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا۔ اس کو ہر اس پہلو سے بچایا اور محفوظ رکھا جائے جس سے اس کی نفع رسانی کو نقصان پہنچتا ہے۔ پھر یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ ان چیزوں کو ان مواقع پر صرف کیا جائے جہاں اللہ نے اس کے صرف کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس ذمہ داری کا نام شریعت کی اصطلاح میں حق ہے۔ جس کو ادا کرنا از حد ضروری ہے۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ انہی معنوں میں کئی مقامات پر استعمال ہوا ہے۔

چونکہ انسان کا تعلق پوری کائنات سے ہے اور اس کائنات ارضی کی ہر چیز سے وہ نفع حاصل کرتا ہے، لہٰذا اس کی ذمہ داری بھی اس کی ہر چیز سے متعلق ہے۔ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسانوں کو بے سبب کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے اور ان کے ہر قسم کے آرام و آسائش کا خیال رکھا جائے، بلکہ اسلام میں تو خود انسان کے ہر ہر عضو کا اس پر حق رکھا گیا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم ﷺ نے سیدنا عبداللہ بن عمرو بن

العاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ:

''مجھے پتہ چلا ہے کہ تم دن میں مستقل طور پر روزہ رکھتے ہو اور رات کو نوافل پڑھتے ہو، کیا یہ صحیح ہے؟ انہوں نے عرض کی: ''ہاں، یا رسول اللہ!'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایسا نہ کرو، روزہ بھی رکھو اور کچھ دن روزہ نہ بھی رکھو، سوؤ بھی اور نوافل بھی پڑھو، تم پر تمہارے بدن کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھوں کا بھی حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے اور تمہارے مہمانوں اور ملاقات کرنے والوں کا بھی حق ہے۔'' (مسلم، رقم:۱۱۵۹، بخاری، رقم:۱۹۷۵)

معلوم ہوا کہ اسلام نے حقوق کو بہت وسعت دی ہے کہ نہ صرف کائنات ارضی کے حقوق انسان کے ذمہ ہیں بلکہ خود انسان کے وجود کے ہر عضو کا حق بھی اس کے ذمہ رکھا گیا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے ''خلق لکم مافی الارض جمیعاً'' کے تحت تمام چیزوں کو انسان کے لیے پیدا کیا ہے تو انسان کا فرض ہے کہ ان سے وہی کام لے جس کے لیے وہ وجود میں لائی گئی ہیں تا کہ وہ انسان کو صحیح فائدہ پہنچا سکیں۔ اس کی مثال حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی کہ ایک دفعہ ایک شخص بیل پر سوار جا رہا تھا کہ دفعتاً اس بیل نے منہ پھیر کر اس سوار سے کہا کہ میں تو سواری کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ میں تو کھیتی اور زراعت کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔ (بخاری: ۱/۳۱۲)

اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز جس مقصد کے لیے پیدا کی گئی ہے اس سے وہی کام لیا جائے، اگر اس کے علاوہ کوئی اور کام لیا گیا تو یہ اس چیز پر ظلم ہوگا۔

پھر اسلام نے ان حقوق کی درجہ بندی کی ہے۔ یہ درست ہے اسلام کے حقوق کا دائرہ انسانوں سے آگے جمادات تک جاتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک شخص صرف اس لیے بخشا گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا۔ لیکن اسلام نے حقوق وفرائض کو ہر انسان کے تعلقات کی کمی بیشی اور دور ونزدیک کی ترتیب وتدریج کے ساتھ متعین کیا ہے اور ہر ایک کا درجہ الگ الگ کر دیا ہے، مثلاً ایک حیوان کے مقابلہ میں ایک انسان کی اعانت، ایک اجنبی کے مقابلہ میں ایک دوست کی اور غیروں اور بیگانوں کے مقابلہ میں عزیزوں اور

رشتہ داروں کی مدد، پھر رشتہ داروں اور قرابت داروں میں دور و نزدیک کی ترتیب رکھی گئی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خرچ کرنے کے لحاظ سے سب سے افضل دینار وہ ہے جو آدمی اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتا ہے۔'' یہ ترتیب حق کے ساتھ ہے کہ اگر کوئی عزیز باطل پر ہے خواہ وہ کتنا ہی نزدیکی کیوں نہ ہو، اور اس کے مقابلہ میں ایک غیر اور بیگانہ اگر حق پر ہے تو اس کی امداد و اعانت فرض ہے۔ جو مدد صرف قریبی اور عزیز ہونے کے ناطے باطل پر کی جاتی ہے، اسلام میں اس کو ''عصبیت'' کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان پر جو حقوق دوسرے کے مقرر کیے ہیں، ان کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ بعض حقوق ایسے ہیں جو واجب ہیں اور ان کی عدم ادائیگی سے آدمی نہ صرف گنہگار ہوتا ہے بلکہ اس کو دنیا میں سزا بھی ملتی ہے جیسے حدود و تعزیرات۔ اگر یہ سزائیں نہ ہوں تو انسان کے لیے زندگی گذارنا مشکل ہو جائے۔ بعض حقوق ایسے ہیں جن کی عدم ادائیگی پر دنیا و آخرت میں عذاب ہوگا، دنیا میں ندامت و بدنامی کا اور آخرت میں جہنم کا۔ جیسے دوسروں کی غیبت، چغل خوری، والدین کی نافرمانی وغیرہ۔ پھر کچھ حقوق ایسے ہیں جو خاندان کے افراد سے متعلق ہیں جیسے خاوند کے حقوق، بیوی کے حقوق، والدین، اولاد، رشتہ دار، غلام و ملازم، پڑوسی، اور مہمان کے حقوق وغیرہ، ان سب حقوق کا بھی شریعت نے تحفظ کیا ہے۔

ان حقوق کی ادائیگی سے ایک انسان بزرگی کے بام عروج پر پہنچتا ہے، اور ان مکارم اخلاق کو پالیتا ہے جس کی تکمیل کے لیے سرکار دو عالم ﷺ کی اس دنیا میں بعثت ہوئی، جن کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ''جو تو اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی اپنے بھائی کے لیے پسند کر، جو تجھ سے برائی کرے تو اس کے ساتھ بھلائی کر، جو تجھے محروم کرے تو اسے عطا کر، جو تجھ سے قطع تعلق کرے تو اس سے جڑ جا، اور جس کو تو پہچانتا ہے اور جس کو تو نہیں پہچانتا دونوں کو سلام کر۔'' یہ وہ مکارم اخلاق ہیں جن کے شگوفے فنِ حقوق سے پھوٹتے ہیں، اور اللہ نے ان پر اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔

جس زمانہ میں سرکار دو عالم ﷺ نے انسان کے بنیادی حقوق کا تحفظ کیا اس وقت دنیا کے تمام ممالک اور دنیا کی تمام قومیں انسانی بنیادی حقوق کے تصور سے یک قلم

نا آشنا تھیں۔ موجودہ دور کو حقوق کے شعور کا ارتقائی اور دور سمجھا جاتا ہے، اس میں بنیادی حقوق کی جدوجہد کا آغاز گیارہویں صدی عیسوی میں برطانیہ میں ہوا جہاں 1037ء میں بادشاہ کانریڈ ثانی (Conrad II) نے ایک منشور جاری کیا جس میں پارلیمنٹ کے اختیارات کو محدود کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں پارلیمنٹ نے اپنے اختیارات کی توسیع کے لیے اپنی کوششیں شروع کر دیں۔ آخر 1188ء میں بادشاہ الفانسونہم (Alfonso IX) سے حبس بے جا کا اصول منظور کرا لیا گیا۔ انگلستان میں بادشاہ جان (King John) نے 1215ء میں جو میگنا کارٹا جاری کیا، وہ دراصل اس کے امراء (Barons) کے دباؤ کا نتیجہ تھا۔ اس میں زیادہ تر امراء ہی کا مفاد ملحوظ رکھا گیا تھا۔ اس قانون کی رو سے تحقیق جرم روبروئے مجلس قضاء حبس بے جا کے خلاف دادرسی اور ٹیکس لگانے کے اختیارات انگلستان کے باشندوں کو حاصل تھے۔ لیکن اس میں صرف امراء کے مفادات کا تحفظ رکھا گیا تھا۔ ہنری مارش (Henry Marsh) کے مطابق ایک معاہدہ کی حیثیت بڑے بڑے جاگیرداروں کے ایک منشور کے سوا اس کی اور کوئی حیثیت نہ تھی۔ 1350ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے میگنا کارٹا کی توثیق کر کے قانونی چارہ جوئی کا قانون منظور کر لیا جس کی رو سے کسی شخص کو عدالتی کارروائی کے بغیر زمین سے بے دخل یا قید نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی اسے سزائے موت دی جا سکتی تھی۔

چودھویں صدی سے سولھویں صدی عیسوی تک قریباً پوری دنیا میں بادشاہت اور آمریت حاوی تھی اس وجہ سے بنیادی انسانی حقوق کے لیے کسی جدوجہد کو نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ لہٰذا انسانی حقوق کی آواز اٹھانے والی تحریکیں نیم مردہ ہو کر رہ گئیں۔ سترھویں صدی میں پھر انسانی حقوق کی طرف توجہ کی گئی اور 1679ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے حبس بے جا کا قانون منظور کر لیا۔ جس سے تمام شہریوں کو تحفظ فراہم ہوا اور 1689ء میں پھر قانون حقوق (Bill of Rights) منظور کیا جو برطانیہ کی دستوری تاریخ کی ایک اہم دستاویز سمجھی جاتی ہے اسی دور میں برطانوی اور فرانسیسی مصنفین نے نظریہ عمرانی کی وضاحتوں اور تشریحات پر کتابیں لکھیں جن پر فرد کے حقوق پر سیر حاصل بحث کی، چنانچہ مشہور فرانسیسی مفکر اور دانشور روسیو (Rousseaue) نے

معاہدہ عمرانی کے عنوان پر ایک کتاب لکھی جس میں ہالس اور لاک کے معاہدۂ عمرانی تصور کا جائزہ لیا گیا۔

اٹھارویں صدی میں انقلاب فرانس نے لوگوں میں شعور کی ایک لہر پیدا کی جس کے نتیجہ میں 1789ء میں حقوق انسانی کا منشور Declarartion of The Rights of Man وجود میں آیا جس میں قوم کی حاکمیت، آزادی، مساوات، ووٹ کا حق، حقوق ملکیت، قانون سازی کا اختیار، ٹیکس عائد کرنے کے اختیارات اور مجلس قضا کے روبرو تحقیق جرم وغیرہ کو واضح کیا گیا اور یہ سب حقوق لوگوں کو دیے گئے۔ اس کے بعد پھر عوام میں حکومتی سطح پر مسلسل کاوشیں ہوتی رہیں۔ اس میں امریکی اعلان آزادی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ پھر 1789ء میں قومی اسمبلی میں انسانی حقوق کا منشور منظور کیا گیا۔ 1792ء میں تھامس پین (Thomas Paine) نے ایک کتابچہ انسانی حقوق (The Right of Man) کے عنوان سے شائع کیا۔ مختصر یہ کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمنی اور متعدد یورپی ممالک میں جو آج اپنے کو حقوق انسانی کا علم بردار کہتے ہیں۔ بنیادی حقوق کو دساتیر میں شامل کیا گیا۔

یورپی ممالک اور امریکہ میں انسانی حقوق کا سارا دارومدار معاہدہ عمرانی پر ہے جو ایک موہوم تصور ہے جو فرد اور معاشرہ کے تعلق کو واضح کرنے کے لیے سیاسی مفکرین نے پیش کیا (The Cocial Contract, P.4) اس معاہدہ عمرانی پر جن لوگوں نے لکھا انہوں نے واضح طور پر اس چیز کو بیان کیا کہ ریاستیں اور حکومتیں ارادتاً کسی معاہدہ کے تحت وجود میں نہیں آئیں بلکہ فطری طور پر ایک خاندان، قبیلہ کی طرف ابتدائی گروہ بندیوں سے بتدریج وجود میں آئی اور قائم ہوئی ہیں۔

(Protection of Human Right under The Law, P.3)

پروفیسر الیاس نے تو بڑے واضح اور صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ "پوری انسانی سیاسی تاریخ میں ایک واقعہ یا ایک مثال بھی ڈھونڈے سے ایسی نہیں ملتی جس میں ریاست کی تشکیل کے لیے عمرانی معاہدہ کو استعمال کیا گیا ہو۔

(The Cocial Contract and The Islamic State, P.1)

یہی وجہ ہے کہ مغربی حکومتوں نے جب چاہا انسانی حقوق کو نظر انداز کر دیا اور لوگوں پر ظالمانہ کاروائیاں کرنا شروع کر دیں۔ آج بھی ان کی تقلید میں ایشائی حکومتیں ایسا کرتی ہیں اور ایمرجنسی لگانا بھی اس کی ایک شکل ہے۔ موجودہ دور میں امریکہ نے بنیادی انسانی حقوق کو کمزور قوموں کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کیا اور انہیں مسلسل دباؤ میں رکھ کر سیاسی اور معاشی اور اقتصادی فوائد حاصل کیے اور جب چاہا اپنے آپ کو بالاتر سمجھ کر ان حقوق کی بے دریغ پامالی کی۔ افغانستان، عراق اور فلسطین اس کی زندہ مثالیں ہیں۔

انسانی بنیادی حقوق کے حصول کی یہ جدوجہد ابھی اختتام پذیر نہیں ہوئی۔

لیکن اس جدوجہد کے نتیجے کے طور پر جمہوری فلسفہ کے تحت UNO نے بہت سے مثبت اور تحفظاتی حقوق کے متعلق قرار دادیں پاس کیں اور بالآخر "عالمی منشور حقوق انسانی" وجود میں آیا جس میں وہ تمام حقوق سمو دیے گئے جو مختلف یورپی ممالک کے دستوروں میں درج تھے۔ دسمبر 1948ء میں نسل کشی کے انسداد کے لیے ایک قرار داد اقوام متحدہ کی اسمبلی میں پاس کی گئی۔ 12 جنوری 1951ء کو اس قرار داد کا نفاذ ہوا۔ عالمی منشور کی قرار کے حق میں 48 ووٹ آئے جب کہ روس سمیت 8 ممالک نے رائے شماری میں حصہ نہ لیا۔ بالآخر دسمبر 1948ء کے منظور شدہ "عالمی منشور حقوق انسانی" کے دیباچہ میں یہ الفاظ مذکور ہیں:

"بنیادی انسانی حقوق" میں فرد انسانی کی عزت و اہمیت میں مردوں اور عورتوں کے مساویانہ حقوق میں اعتقاد کو موثق بنانے کے لیے۔"

عالمی انسانی حقوق کا یہ منشور ایک اعلان ہے معاہدہ نہیں ہے۔ لیکن اس سے چند باتیں یہ معلوم ہوتی ہیں کہ اول تو مغرب میں انسانی حقوق کے تصور کی تاریخ صرف چند صدیوں پر محیط ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس کے پیچھے کوئی سند نہیں ہے۔ اس کے برعکس اسلام نے اسلام حقوق کا جو چارٹر پیش کیا ہے اس کی سند تو قرآن حکیم ہے جو دنیا میں اسلام کی طرف سے انسانی بنیادی حقوق کا منشور ہے اور جس کا خلاصہ سرکار دو عالم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان فرمایا، وہ ان مغربی ممالک اور امریکہ سے قدیم بھی بہتر بھی۔ اور یہ منشور دنیا میں چودہ سو سال تک عملاً قائم بھی رہا اور اس کی بے مثل نظریں بھی

دنیا میں موجود ہیں۔

(مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو کتاب "روزن تاریخ سے" تالیف قاری عبدالرحمن صاحب ایم۔اے)

حقوق انسانی کی اہمیت سے اس دنیا میں کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ انسانی معاشرہ میں انسانی حقوق کی اہمیت کا اندازہ پروفیسر لاسکی کے اس فقرہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے لاسکی لکھتا ہے۔

Right, in fact are these couditions of Socical life without which no man can seek, in general, to be himself at his best. (Gammar of Polities, P.91)

اسلام نے انسان کے اپنے بارے میں افراط وتفریط کی غلط فہمی کو ختم کر کے اس کو اس کے صحیح مقام سے آشنا کیا اور اس کو شرف انسانیت سے آگاہی بخشی۔ اس کو بتایا کہ وہ اس کارگاہ حیات میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ جس کو مسجود ملائکہ بنایا گیا۔ اس کو خشکی اور تری کی مخلوق کو عزت وتکریم عطا فرمائی اور دنیا کی ہر شے اس کے لیے بنائی اور اس کو صرف اپنے لیے بنایا۔ اور جس امانت خداوندی کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اس کو صرف انسان نے اٹھایا۔

انسانی شرف سے آشنا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حقوق کے اسلامی تصور سے اس کو آگاہ کیا اور بتایا کہ انسان کے کچھ حقوق تو پیدائشی ہیں اور کچھ ریاست کے عطا کردہ ہیں۔ اجتماعی بہبود کا لحاظ بھی ضروری رکھا گیا اور اخلاقی حدود کا خیال بھی ناگزیر بتایا گیا۔ اس لحاظ سے حقوق اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہیں اور کوئی فرد، سوسائٹی اور ریاست ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ پھر ان سب کے مابین توازن کا ایک خط کھینچا گیا۔ یہ سب باتیں وحی والہام کی غیر جانبدارانہ تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔

اگرچہ انسان کو یہ بتایا گیا کہ تمام کائنات اس کے لیے بنائی گئی ہے، لیکن اس کے انسان کو یہ بھی بتایا گیا کہ اس دنیا میں جمادات، نباتات اور حیوانات جو اس سے اگرچہ درجہ میں کم تر ہیں، ان کا بھی لحاظ رکھا جائے اور ان کے حقوق کو ضائع نہ کیا جائے۔

مثلاً نباتات کو بے مقصد نہ کاٹا جائے، حیوانات کو بے سبب تکلیف نہ دی جائے۔ پھر جہاں تک انسانوں کے حقوق کا تعلق ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے فرد سے آغاز کر کے اجتماعیت اور معاشرہ کے نقطۂ عروج تک ان کا خیال رکھا۔ پھر ان حقوق کی اقسام بیان کیں اور ان کو اخلاقی، قانونی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقوق میں تقسیم کیا۔ پھر ان سب حقوق کو قانونی تحفظ عطا فرمایا اور جو شخص ان حقوق کا لحاظ نہیں کرتا اس کے لیے حد اور سزا کو قانون میں بیان کیا۔ حقوق کا تحفظ کرتے ہوئے پیغمبر اسلام ﷺ نے شخصی آزادی کے حق کو برقرار رکھا۔ چنانچہ ایک مقدمہ کے سلسلہ میں سیدنا عمرؓ نے فرمایا:

﴿واللہ! لا یوسر رجل فی الاسلام بغیر العدل﴾ (مؤطا:۳/۲۰۷)

''خدا کی قسم! اسلام میں کوئی شخص عدل کے بغیر قید نہیں کیا جا سکتا۔''

پھر اسلام میں یہ ایک واضح قانون رکھا گیا کہ ہر شخص بلا امتیاز قانون کے سامنے جواب دہ ہے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے کو ماوراء نہ رکھا۔

(بخاری، رقم:۶۷۸۷،۶۷۸۸)

اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی ہماری اس بات کی تائید کرتا ہے کہ ایک مرتبہ سیدنا عمرؓ گورنروں کے فرائض پر گفتگو فرما رہے تھے اور اس بارے میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ زیادتی کرنے والے شخص سے ضرور قصاص لیں گے۔ اس پر سیدنا عمرو بن العاصؓ نے کہا: ''امیر المومنین! فرض کیجیے کہ ایک گورنر اگر کسی شخص کو سزا دیتا ہے تو کیا آپ اس سے بھی قصاص دلوائیں گے؟'' یہ سن کر سیدنا عمرؓ نے فرمایا:

﴿والذی نفسی بیدہ ولقد رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقص من نفسہ﴾ (کتاب الخراج، ص ۶۶)

''اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! میں اس گورنر سے بھی قصاص لوں گا کیونکہ میں خود دیکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو خود اپنی ذات کے خلاف قصاص لینے کا موقع فراہم فرماتے تھے۔''

سیدنا عمرؓ نے اپنی اس بات کو عملی شکل بھی دی۔ چنانچہ سیدنا انسؓ بیان کرتے ہیں:

ایک مصری سیدنا عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: ''امیر المومنین! میں ظلم سے آپ کی پناہ پکڑنے آیا ہوں۔'' سیدنا عمرؓ نے فرمایا: ''میں نے تجھے پناہ دی۔'' اس شخص نے کہا: ''میں نے گورنر مصر عمرو بن العاصؓ کے بیٹے کے ساتھ روڑ میں بازی لگائی اور میں اس سے آگے نکل گیا۔ اس نے غصہ میں آ کر مجھے کوڑے سے مارنا شروع کیا اور وہ کہتا تھا: ''میں بڑے آدمی (گورنر مصر) کا بیٹا ہوں۔'' یہ شکایت سن کر سیدنا عمرؓ گورنر مصر سیدنا عمرو بن العاصؓ کو لکھا کہ ''اپنے بیٹے کو لے کر بارگاہ خلافت میں حاضر ہوں۔'' سیدنا عمروؓ اپنے بیٹے کو لے کر مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ سیدنا عمرؓ نے فرمایا: ''وہ مصر کا رہنے والا کہاں ہے؟'' جب وہ حاضر ہوا تو فرمایا: ''یہ لے کوڑا اور اس بڑے آدمی کے بیٹے کو اسی طرح مار جس طرح اس نے تجھے مارا تھا۔'' اس مصری نے کوڑا لے کر اس کو مارنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس نے اپنا بدلہ لے لیا۔ اس بعد سیدنا عمرؓ نے فرمایا: ''اب عمرو بن العاصؓ کی چندیا پر بھی کوڑے مار۔'' مصری نے کہا: ''امیر المومنین! اس کے بیٹے نے مجھے مارا ہے، انہوں نے نہیں مارا، اور اس سے میں اپنا بدلہ لے چکا ہوں۔'' آپ نے فرمایا: ''مار اس کو بھی کیونکہ اسی کی شہ پر تو اس نے تجھے مارا تھا۔'' پھر آپ نے عمرو بن العاصؓ سے فرمایا: ''کب سے تم نے لوگوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا؟''

سیدنا عمرو بن العاصؓ نے جواب دیا: ''مجھے اس واقعہ کا کچھ علم نہیں اور نہ یہ آدمی شکایت لے کر میرے پاس آیا۔'' (کنز العمال ۱۲/۶۶۰)

ایک مرتبہ سیدنا عمرؓ کے گورنر نے کسی شخص کو مارا۔ سیدنا عمرؓ نے اس سے قصاص دلوایا۔ اس پر سیدنا عمرو بن العاصؓ نے کہا: ''امیر المومنین! آپ اپنے گورنروں سے بھی قصاص لیں گے؟'' فرمایا: ہاں۔'' عمرو بن العاصؓ نے کہا: ''پھر ہم آپ کے گورنر نہیں بنیں گے۔'' سیدنا عمرؓ نے فرمایا: ''چاہے تم میرے گورنر نہ ہو۔''

(المصنف عبدالرزاق ۹/۴۶۳، ۴۹/۲، مسند احمد ۱/۴۱، المغنی لابن قدامہ ۷/۶۹۳)

سیدنا عمرؓ نے تو ایک مرتبہ خود کو سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ کے سامنے قصاص کے لیے پیش کر دیا۔ (المصنف عبدالرزاق ۹/۴۶۹)

سیدنا عمرؓ کا واقعہ تو 14 سو سال پرانا ہے۔ مؤرخ بریڈ لے برٹ Bradelay Birt نے اپنی کتاب میں ایک واقعہ غیاث الدین کا نقل کیا ہے جو پہلے تو بنگال کا گورنر تھا لیکن بعد میں اس نے خودمختار حکومت قائم کرلی تھی۔ لکھا ہے کہ ایک روز غیاث الدین تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا۔ اتفاق سے اس کے تیر سے ایک بیوہ کا اکلوتا بیٹا زخمی ہوگیا۔ بیوہ کو معلوم نہیں تھا کہ یہ تیر بادشاہ نے چلایا ہے۔ وہ قاضی کے پاس شکایت لے کر گئی۔ قاضی نے اپنی فراست سے اندازہ لگایا کہ یہ تیر بادشاہ کا ہی چلایا ہوا تھا۔ وہ دیر تک متذبذب رہا کہ بادشاہ کے خوف اور اللہ کے خوف میں سے کس کو ترجیح دے۔ بالآخر اللہ کا خوف قاضی پر غالب آگیا اور اس نے بادشاہ کو جواب دہی کے لیے سمن جاری کر دیے۔ بادشاہ کو جونہی سمن پہنچے تو وہ بلا کسی تامل اور پس و پیش کے قاضی کی عدالت کی طرف روانہ ہوا، لیکن اس نے اپنے کپڑوں میں ایک چھوٹی سی تلوار بھی چھپالی، قاضی صاحب نے عدالت میں بادشاہ کا کسی قسم کا کوئی احترام نہیں کیا بلکہ ملزموں کی طرح اس عورت کے سامنے کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ معاملہ کی جانچ پڑتال میں یہ ثابت ہوگیا کہ وہ تیر واقعی بادشاہ کا چلایا ہوا تھا۔ قاضی نے بادشاہ کو حکم دیا کہ وہ اس بیوہ عورت کو معقول مالی معاوضہ دے کر اپنا قصور معاف کرائے۔ بادشاہ غیاث الدین نے بے چوں و چرا قاضی صاحب کے اس حکم کی تعمیل کی اور بیوہ عورت کو ایک بڑی رقم پیش کر کے اس سے اپنا قصور معاف کرایا۔

مقدمہ ختم ہونے کے بعد قاضی صاحب اپنی کرسی عدالت سے اٹھ کر بادشاہ کے سامنے باادب کھڑے ہوگئے۔ بادشاہ نے فوراً انہیں اپنے سینے سے لگالیا اور وہ تلوار ان کو دکھائی جو وہ اپنے کپڑوں میں چھپا کر لایا تھا، اور کہا: ''یہ تلوار میں اس لیے لایا تھا کہ اگر تم میرے اس مقدمہ میں شریعت کے حکم سے ذرا بھی روگردانی کرتے تو میں تمہارا سر اڑا دوں گا، لیکن تم نے شریعت کی پاس داری کرتے ہوئے اپنا فیصلہ صادر کرنے میں کوئی خوف نہیں کیا، اس لیے تم انتہائی اعزاز کے مستحق ہو۔

(DACCA: The Romance of one Eastern Copital. P.55-56)

مختصر یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بلند معیار انسانی حقوق کا جاری کر دنیا کے

سامنے پیش کر دیا۔ اور یہ وہ حقوق ہیں جو مسلمان کو بھی دیئے جائیں گے اور دوسری اقوام کو بھی، دوستوں کو بھی اور دشمنوں کو بھی یہاں تک کہ جمادات، نباتات اور حیوانات کو بھی اس کے جائز حقوق دیے جائیں گے۔

اس قسم کے بے شمار حقوق قرآن و حدیث میں موجود ہیں، کیونکہ اسلام خاتم الادیان ہے، ان حقوق کی تشریحات رسول اللہ ﷺ نے اپنی احادیث میں چودہ سو سال پہلے بیان فرمائی تھیں اور مسلمان ابھی تک ان کو اپنائے ہوئے ہیں، لیکن اس مادی دور میں مال کی محبت نے لوگوں کو کچھ ایسا بنا دیا ہے کہ ایک مسلمان مسلمان کہلاتے ہوئے ان تمام حقوق و فرائض اور اخلاق نبوت کو بھول گیا ہے۔

جمادات سے انسان تک کے حقوق قرآن و سنت میں بکھرے پڑے ہیں، احقر نے ان کو مختلف کتابوں سے اکٹھا کر کے اس کتاب میں جمع کر دیا ہے جو حقوق و فرائض کی ایک دستاویز کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اور اس میں مختلف ابواب بھی قائم کر دیئے گئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ قارئین کرام اس کتاب کے مطالعے سے یہ ذہن نشین کر لیں گے کہ انسانی حقوق جن کے دعوے موجودہ دور میں مختلف انسانی حقوق کی تنظیموں کی طرف سے کیے جاتے ہیں، وہ غلط ہیں بلکہ یہ حقوق موجودہ تنظیموں سے بھی زیادہ اسلام نے انسان کو چودہ سو سال پہلے دیئے ہیں۔ مجھے یہ بھی امید ہے کہ قرآن و سنت اور آثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے احقر نے جو کچھ اس کتاب میں ترتیب دیا ہے، قارئین اس کو پسند فرمائیں گے۔

﴿اسأل اللہ تعالیٰ ان یجعلہ عملاً صالحاً خالصاً بوجہ الکریم، ان یتجاوز عنی فی کل ھفوۃ صدرت بغیر قصد منی، انہ کریم علیم قدیر، وبالا جابۃ جدیر﴾

محتاج دعا: (حکیم) محمود احمد ظفر، سیالکوٹ

4-نومبر 2006ء / 11 : شوال المکرم 1427ھ

انسانی ضروریات

علماء نے انسانی ضروریات کی پانچ اہم ضروریات کو اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے جن پر انسان کی دینی اور دنیوی زندگی کا انحصار ہے۔ اس دنیا میں انسان کے وجود کا دارومدار اور آخرت کی نجابت وسعادت کا انحصار بھی انہی پانچ چیزوں پر ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو انسانی زندگی کا تمام نظام خطرہ اور اختلال میں پڑ جائے۔ وہ پانچ ضروریات حسب ذیل ہیں:

(1) حفظ الدین
(2) حفظ النفس
(3) حفظ العقل
(4) حفظ العرض (نسل وانساب)
(5) حفظ المال

ان سب میں حفظ الدین سب سے اہم ہے کیونکہ جو لوگ اپنے دین کی حفاظت کر لیتے ہیں ان پر پھر اپنے نفس اور مال کی حفاظت ضروری ہو جاتی ہے۔ اور نفس کی حفاظت عقل کی حفاظت سے زیادہ ضروری ہے، اور حفظ نفس بھی حفظ مال سے مقدم ہے۔ اسی وجہ سے صحرا میں بھوک کی وجہ سے دوسرے کا مال کھانا بھی مباح ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے علماء نے لکھا ہے کہ "الضرورات تبیح المحظورات"

(ملاحظہ ہو "حقوق الانسان فی الاسلام" للدکتور محمد الزحیلی ص ۸۱۔۹۸)

ایک انسان خواہ وہ عورت ہو یا مرد، اس کے کئی حقوق ہیں اور اس کے ذمہ بہت سے واجبات وفرائض بھی ہیں۔ جن کا ادا کرنا اس کے ذمہ ضروری ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی جان کی حفاظت کرے اور کسی دوسرے کی کسی طریقہ سے جان

نہ لے۔ اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرے اور کسی دوسرے کی عزت و آبرو پہ دست درازی نہ کرے اور نہ ہی کسی کی عزت و آبرو کو مجروح کرے۔ اپنے مال کی اچھی طرح حفاظت کرے اور دوسرے کے مال پر دست تطاول نہ بڑھائے۔ اپنے دین کی حفاظت کرے اور اپنا دین بغیر کسی جبر واکراہ کے اختیار کرے، اور اگر وہ اپنی مرضی سے دین اسلام کو قبول کرلے تو پھر اس پر حرام ہے کہ وہ ایمان کو چھوڑ کر کفر اختیار کرے اور اب کسی دوسرے کو بھی اس کے دین کے بارے میں اس پہ جبر واکراہ کا حق نہیں ہے۔ اس کے ذمہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی عقل کی حفاظت کرے اور منشیات اور مخدرات سے یک قلم اجتناب واحتراز کرے۔

یہ وہ حقوق ہیں جو ہر مسلمان پر اسلام کی طرف سے لاگو ہوتے ہیں، کیونکہ اللہ کے ہاں اب دین اسلام کے علاوہ اور کوئی دین قابل قبول نہیں۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ، وھو فی الآخرۃ من الخاسرین﴾ (آل عمران:۸۵)

''اور جس نے اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو طلب کیا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔''

بتایا یہ کہ جو شخص اسلام کو قبول نہیں کرے گا وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ نقصان کا مطلب ہوتا ہے ''اصل مال کا ضائع ہو جانا'' اور یہاں مراد یہ ہے کہ اس نے اس فطرت سلیمہ کو ضائع کر دیا جس پہ وہ پیدا کیا گیا تھا۔ کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہر مولود (بچہ) فطرت (اسلام) پہ پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی، نصرانی اور مجوسی بنالیتے ہیں جیسے جانور سے مکمل جانور پیدا ہوتا ہے لیکن تم اس میں کوئی نقص دیکھتے ہو۔''

(بخاری: ۱/۸۵، مسند احمد: ۲/۲۳۹)

مطلب یہ کہ ہر انسان کی فطرت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قبول اسلام کی صلاحیت رکھی ہے اور آخرت کی کامیابی اور فوز وفلاح حاصل کرنے کے لیے اس کے

پاس یہی اصل سرمایہ ہے، اور جب اس نے اسلام کے سوا کسی اور دین کو قبول کر لیا تو اس نے اپنے اصل سرمایہ کو بالکل ضائع کر دیا۔ اب اس کے پاس آخرت کی کامیابی و کامرانی کا اور کوئی ذریعہ نہیں لہٰذا اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اسے روز قیامت اسلام قبول نہ کرنے کا افسوس ہوگا اور دوسرے ادیان کے احکام پر عمل کرنے کی بے نتیجہ مشقت اٹھانے کی وجہ سے پشیمانی ہوگی۔

پھر اللہ کے بندے بھی سارے برابر نہیں۔ ان میں مومن بھی ہیں اور کافر بھی۔ ان میں کچھ اللہ تعالیٰ کے مطیع و فرمان بردار ہیں اور کچھ نافرمان، کچھ نیک ہیں اور کچھ برے۔ جو مسلمان ہیں وہ تو تمام انسانی حقوق کے مستحق ہیں اور جو گنہگار اور کافر ہیں وہ بہت سے انسانی حقوق سے محروم ہو جاتے ہیں، اور اپنے کفر اور نافرمانی کی وجہ سے وہ ان حقوق کے مستحق ہونے کے لائق نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حدود و تعزیرات کا نظام دنیا میں قائم کیا تاکہ دنیا میں امن و امان رہے۔ کوئی کسی کے حقوق پر دست درازی نہ کرے اور جو دست درازی کے جرم کا ارتکاب کرے وہ سزا کا مستحق ہو اور اس کی سزا دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ جو کسی کو قتل کرے وہ قصاص میں قتل کیا جائے، جو زنا کرے اور دوسرے کی عزت و ناموس میں زیادتی کرے اس کو کوڑے مارے جائیں، ایسے ہی جو شراب پئے اس کو بھی کوڑوں کی سزا دی جائے، جو چوری کرے اس کا ہاتھ کاٹا جائے۔ اس طرح ان حدود کو معاشرے میں قائم کرے، امن و سلامتی کی فضا ہموار کی جائے، کیونکہ اسلام امن و سلامتی کا دین ہے۔

حفاظت دین کا انسانی حق

حفاظت دین کے بارے میں اسلام نے مندرجہ ذیل حقوق رکھے ہیں:

1- دین حق صرف اسلام ہے:

اسلام میں دین حق کا اعزاز صرف اسلام کو حاصل ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں فرمایا:

﴿ان الدین عند الله الاسلام﴾ (آل عمران ۱۹)

"بے شک اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے۔"

کیونکہ دنیا میں جس قدر انبیاء علیہم السلام تشریف لائے ان کی آمد کا بنیادی مقصد اللہ تعالیٰ توحید کا دنیا میں پرچار تھا۔ آج بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو سوائے اسلام کے کوئی دین بھی توحید کا داعی نہیں ہے۔ کوئی تثلیث کا قائل ہے تو کئی ادیان میں بہت سارے معبود ہیں جن کی عبادت کی جاتی ہے لیکن دنیا میں صرف اسلام توحید کے مسئلہ کی دعوت دیتا ہے۔ اور اسلام کا معنی ہے اطاعت کرنا، سلامتی میں داخل ہونا اور اخلاص۔ جب انسان اسلام قبول کر لیتا ہے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتا ہے۔ ان کے احکام بجا لاتا ہے اور دنیا میں اس کی جان اور مال سلامتی میں رہتے ہیں اور آخرت میں بھی وہ عذاب جہنم سے محفوظ و مصئون رہے گا۔ اور جو شخص جتنا پکا مسلمان ہوگا اتنا ہی اس میں اخلاص ہوگا کیونکہ ایمان میں پختگی اخلاص سے آتی ہے۔

اور دوسرے مقام پر قرآن نے فرمایا کہ جو "اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین

کا طلب گار ہوگا، اس کا وہ دین قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ والوں میں سے ہوگا۔ (آل عمران: ۸۵)

2- دین میں کوئی جبر نہیں:

اسلام کسی غیر مسلم کو مجبور نہیں کیا کہ وہ ضرور اسلام قبول کرے البتہ قبول اسلام کی دعوت دی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں فرمایا:

﴿لا اکراہ فی الدین﴾ (البقرہ: ٦٥)

''دین میں جبر نہیں ہے۔''

یعنی جو لوگ کسی دین کو ماننے والے ہیں ان پر دین اسلام کو قبول کرنے کے بارے میں جبر نہیں کیا جائے گا اس بارے میں پیر کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں:

''اسلام جس طرح یہ گوارہ نہیں کرتا کہ کسی کو جبراً مسلمان بنایا جائے، اسی طرح وہ یہ بھی برداشت نہیں کرتا کہ کوئی اس کے ماننے والوں پر تشدد کر کے انہیں اسلام سے برگشتہ کرے یا جو خوشی سے اس کی برادری میں شریک ہونا چاہتے ہیں، ان کو ایسا کرنے سے زبردستی روکا جائے، اور اگر کہیں ایسی صورت پیدا ہو جائے تو اس وقت اسلام اپنے ماننے والوں کو حکم دیتا ہے کہ ایسی حالت میں وہ ظالم قوت کا مقابلہ کریں، اور یہی اسلام کا نظریہ جہاد ہے۔ اسلام کے بعض نکتہ چیں جہاد کو ''اکراہ فی الدین'' سے تعبیر کرتے ہیں اور اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں، وہ سن لیں کہ اسلام ان کی خوشنودی کا پروانہ حاصل کرنے کے لیے اپنے ماننے والوں کو دشمنان دین وایمان کے جور وستم کا تختۂ مشق بننے نہیں دے گا۔'' (ضیاء القرآن: ۱/۱۷۹)

البتہ اگر کوئی شخص مسلمان ہو کر پھر اسلام کو چھوڑ دے تو وہ مرتد ہے اور اس کی سزا اسلام میں قتل ہے۔ اس سزا میں کسی کو اختلاف نہیں، اور اس زمانہ کے جو بعض لوگ اختلاف کرتے ہیں وہ دین سے ناآشنا اور جاہل ہیں۔ اسی وجہ سے دین کی حفاظت ضروری قرار دی گئی، اور جو شخص دین کی حفاظت نہیں کرتا اور کسی وجہ سے دین کو ترک کر

دیتا ہے اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہے جو اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، البتہ تین شخص اس سے مستثنیٰ ہیں:

الثیب الزانی، والنفس بالنفس، والتارک لدینہ المفارق للجماعة

شادی شدہ زانی، کسی شخص کو قتل کرنے والا، اور دین اسلام کو ترک کر کے مسلمانوں کی جماعت سے مفارقت اختیار کرنے والا۔ (بخاری، رقم ۶۸۷۸)

بخاری ہی کی ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿من بدل دینہ فاقتلوہ﴾

(بخاری، رقم: ۶۹۲۲، رواہ ابوداؤد والترمذی فی الحدود والنسائی فی المحاربہ، سنن کبریٰ بیہقی: ۸/۱۹۵، سنن دارقطنی: ۳/۱۰۸، ابن حبان: ۱۰/۳۲۸، مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۰/۱۳۹، مصنف عبدالرزاق: ۱۰/۱۶۸، شرح السنہ بغوی: ۱۰/۲۳۸، مستدرک حاکم: ۳/۵۳۸، مسند احمد: ۱/۲۱۷، مسند حمیدی: ۱/۲۴۴، معجم کبیر طبرانی: ۳/۹۰، مسند ابی یعلیٰ موصلی: ۴/۳۰۹)

''جو اپنا دین (اسلام) تبدیل کر لے اس کو قتل کر دو۔''

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دعوت اسلام کو پھیلایا ہے کسی پر جبر کر کے اسلام کو نہیں پھیلایا۔ (اس بارے میں ہماری کتاب ''اسلام کی دعوتی قوت'' کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔) آج جو لوگ اسلام پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، انہیں یہ اعتراض کرنے سے پہلے یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے تو عیسائیت توپ کے زور سے پھیلی ہے۔ اندلس میں ان لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا، اور صلیبی جنگوں میں جب 15 جولائی 1099ء بروز جمعہ کو عیسائیوں نے یروشلم پر قبضہ کیا تو جمعہ کی نماز کے تھوڑی دیر بعد ایک اکیس سالہ نوجوان سردار ٹینکرڈ (Tanceerd) مسلح اشخاص کے ہمراہ یہاں نمودار ہوا۔ صلیبی جنگ جوؤں کو منزل مراد مل گئی تھی۔ یہ مسلسل جنگ و جدال، کشت و خون، ان تھک کوشش اور ان گنت قربانیوں کا حاصل تھی۔ آخر کار اس مقدس مقام پر جب ان کا قبضہ ہوا

تو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا؟ ایسی لوٹ مار اور قتل عام کیا کہ الامان والحفیظ۔ یہ میں نہیں کہہ رہا وہ غیر مسلم کہہ رہے ہیں ٹیری جونز اور ایلین اویرا، ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

''چالیس کے قریب چاندی کے شمع دان جن میں ہر ایک کا وزن 3500 ڈرام تھا۔ چاندی کا ایک جھاڑ جو 44 پونڈ وزنی تھا۔ چاندی کے پچاس شمع دان، خالص سونے کے بیس شمع دان اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ مال غنیمت کے طور پر قبضہ میں لے لیا گیا۔ مسلمان بھاگ کر مسجد اقصیٰ کے صحن میں اکٹھے ہو گئے۔ ٹینکرڈ نے انہیں مال کے بدلے جان کی امان دی۔ ڈوم آف راک پر صلیبیوں کا جھنڈا لہرانے لگا۔ اگلی صبح ان سب کو مسجد کے صحن میں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیا گیا۔ کل تعداد ستر ہزار تھی۔ اس میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ مسجد میں گھٹنوں گھٹنوں تک لاشوں کے ڈھیر اور خون کے لوتھڑے پڑے تھے۔'' (Crusades. P.3)

پھر یہی مصنف لکھتے ہیں کہ ''جب بھی کسی صلیبی جنگ کی ابتداء ہوئی، یہودیوں کے قتل عام سے ہوئی۔ آخر اس کی وجہ کیا تھی؟ شاید ایک تو مالی طور پر وہ عیسائیوں کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط ہوتے۔ دوسرا یہ کہ عیسائی یہودیوں کو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر ٹنگوانے کا ذمہ دار گردانتے تھے۔ بنیادی طور پر سیدنا عیسیٰ بھی یہودی تھے، البتہ بعد میں انہوں نے اپنا راستہ بدل لیا۔ یہی تضادات عیسائیوں کو پریشان کرتے۔ قاتل وہ نہیں یہودی تھے جنہوں نے خدا کے بیٹے کو مروایا۔ لالچی وہ نہیں یہودی تھے جو ہر وقت مال جمع کرنے کے چکر میں پڑے رہتے۔ ان گندی چیزوں سے خدا کی زمین کو پاک کرنا صلیبی لڑائیوں کی اہم اخلاقی اور مذہبی ذمہ داری تھی۔ (Crusades. P.22)

لہذا یہ کہنا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا سراسر غلط ہے البتہ عیسائیت تلوار کے زور سے پھیلی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے کسی شخص کو مجبور نہیں کیا کہ وہ دین اسلام کو قبول کرے بلکہ جو لوگ مسلمان ہوئے وہ مشرکین کی تلواروں کا لقمہ اجل بنے اور خون کے سمندر میں سے انہیں گزرنا پڑا یہاں تک کہ انہوں نے مکہ کو خیر باد کہہ کر حبشہ کی طرف

اور بعد میں مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ جہاں رسول اللہ ﷺ نے اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی اور اسلام کی دعوت سلیمہ مختلف لوگوں اور ملکوں تک پہنچائی۔ مختلف قبائل کی طرف اپنے ایلچی بھیجے، مختلف بادشاہوں کو خطوط لکھے۔ نتیجہ میں قبائل میں سے بہت سے لوگوں نے دعوت اسلام کو قبول کر لیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسلام کی روشنی کو ہر فرد و بشر تک پہنچایا تاکہ قیامت کے روز کوئی یہ حجت نہ کر سکے کہ مجھ تک اسلام کی روشنی اور دعوت و ہدایت نہیں پہنچی تھی۔ یہ ایک انسان کا حق ہے کہ وہ اس روشنی کو دیکھے پھر اسے اختیار ہے کہ وہ اس کو قبول کرے یا رد کرے، لیکن تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ اسلام کی یہ روشنی جب لوگوں تک پہنچی تو ہر ایک نے اسے قبول کیا سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے اس روشنی کو دیکھنے کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اسلام نے جس طرح ہر شخص کو حریت فکر عطا کی ہے اسی طرح حریت نظر بھی بخشی ہے۔ لوگوں نے اسلام کی اس روشنی سے اپنے دلوں کو منور کیا لیکن جن لوگوں نے روشنی اور اپنے درمیان تعصب کی دیوار کھڑی کر دی تھی وہ اس روشنی سے مستفیض نہ ہو سکے اور پوری زندگی کفر کے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے۔ جہاد میں بھی تین شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ دین اسلام کو قبول کر لو۔ اس صورت میں تمہارے اور ہمارے حقوق برابر ہوں گے یا پھر ہمارے باج گزار بن جاؤ۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے عقل سلیم عطا فرمائی تھی انہوں نے تنہائیوں میں مسلمانوں کی اس دعوت پر غور و فکر کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کا دین سچا ہے جب کہ ہم جس دین پر ہیں اس میں کوئی معقولیت نہیں۔ اپنے ہی ہاتھوں سے بت بنا کر پھر انہی کی عبادت کرنا کہاں کی دانش مندی ہے؟ چنانچہ دعوت سے اسلام اس قدر تیزی سے پھیلا کہ مدینہ کی دس سالہ زندگی میں مسلمانوں کی تعداد لاکھوں میں ہو گئی کیونکہ حجۃ الوداع میں آپ کے ساتھ قریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار نفوس قدسیہ تھے۔ اتنے انسان کسی نبی کے ہاتھ پر اتنی قلیل مدت میں ایمان نہیں لائے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان سب سے تین بار میدان عرفات یہ سوال کر کے "هل بلغت" کیا میں نے اللہ کے دین کی دعوت تم لوگوں کو پہنچا دی ہے؟ ان سب نے یک زبان ہو کر کہا "ہاں" اے اللہ کے رسول! اور پھر آپ نے فرمایا: "اللهم

اشہد" اے اللہ! گواہ رہنا تیرے بندے میری دا عیانہ محنت کی داد دے رہے ہیں۔
(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بخاری: ۶۳۱/۲، فتح الباری: ۱۰۳/۸۔ ۱۱۰، سیرت ابن ہشام: ۲۱۸/۴۔ ۲۲۰، عیون الاثر لابن سید الناس: ۳۵۹/۲)

غیر مسلموں کے لیے دینی آزادی کے حقوق:

جس طرح اسلام مسلمانوں کے دینی حقوق کی حفاظت و کفالت کرتا ہے، اسی طرح یہ دوسرے ادیان کے ماننے والوں کی دینی آزادی کا بھی انکار نہیں کرتا بشرطیکہ وہ دعوت اسلام کے معاملات میں مزاحمت نہ کریں چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے یہود مدینہ کو ان کی دینی آزادی کے پورے پورے حقوق دیے اور رسول اللہ ﷺ کے مدینہ منورہ تشریف سے قبل انہیں اپنے دینی شعائر کے بارے میں جو آزادی حاصل تھی، آپ ﷺ نے اس آزادی کو برقرار رکھا۔ (الروض الانف: ۱۶/۲۔ ۱۷)

اہل نجران کے بارے میں آپ نے جو معاہدہ فرمایا اس میں لکھا کہ محمد رسول اللہ (ﷺ) کی طرف سے اہل نجران اور ان کے حلیفوں کو ان کے اموال، جانوں، ان کی زمینوں، ان کی ملت، ان کے غائب اور ان کے شاہد (حاضر) ان کے قبیلے اور ان کی خرید و فروخت اور جو کچھ ان کے پاس ہے اور ان کی ملکیت خواہ وہ تھوڑی ہو یا زیادہ ان سب کو پورا پورا تحفظ دیا گیا ہے۔ مزید برآں نہ تو ان کا کوئی پادری، راہب اور کاہن اپنے عہدوں سے تبدیل نہ کیا جائے گا، نہ ان کے ذمہ کوئی جاہلیت کا خون ہوگا اور نہ ہی کوئی اور قصاص۔ (فتوح البلدان، بلاذری: ۷۵، ۷۶، زاد المعاد: ۶۳۴/۳)

یہ معاہدہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایک واضح ضمانت ہے کہ غیر مسلم اقوام کو ایک اسلامی ریاست میں اپنے دینی شعائر کی ادائیگی میں پوری پوری آزادی ہے اور اس بات کی بھی ضمانت ہے کہ ان کے دینی رؤساء اپنے اپنے مرکز میں آزادی کے ساتھ کام کرتے رہیں گے اور اسلامی ریاست ان کے دینی معاملات میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو اسلامی لشکر کا امیر بنا

کر بھیجا تو انہیں ہدایت فرمائی: ''تم ایک ایسی قوم کو پاؤ گے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو دین کے ساتھ محبوس کر رکھا ہے۔ آپ جیسا وہ سمجھتے ہیں اسی طرح انہیں سمجھنے دیں اور ان کے معاملات میں بالکل کوئی دخل نہ دیں۔ (موطا امام مالک: ص۲۹۶)

اسی طرح سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اہل ایلیاء[1] کو جو امان دی اس میں ان کے اموال، ان کے گرجوں اور ان کی صلیبوں کے بارے میں پورا تحفظ دیا گیا۔ یہ واقعہ 15ھ کا ہے۔ (طبری: ۳/۳۰۵)

اسی طرح اسلامی لشکر کے قائد سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اہل حیرہ کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا اس میں بھی یہ کہا گیا تھا کہ اہل حیرہ کا کوئی گرجا اور کنیسہ منہدم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی انہیں ناقوس بجانے سے روکا جائے گا، اور نہ اس کی عید پر انہیں صلیب نکالنے سے منع کیا جائے گا۔ اور اہل عانات سے جو معاہدہ کیا گیا تھا، اس میں کہا گیا تھا کہ وہ جس وقت بھی چاہیں اپنے ناقوس بجا سکتے ہیں، خواہ دن ہو یا رات، البتہ اوقات نماز میں وہ اپنے ناقوس نہیں بجا سکتے۔ نیز عید پر نہیں بھی صلیب نکالنے کی پوری پوری اجازت ہے۔ (کتاب الخراج لابی یوسف: ص۱۴۶، حقوق الانسان فی الحرب والسلام لطیار: ص۶۶)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے تو اس بارے میں وہ مثالیں قائم کیں جن کی نظیر دنیا میں ملنی مشکل ہے، اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا وہ قول بالکل صحیح ثابت ہوا جس میں آپ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: ''آپ نے اپنے بعد کے خلفاء کو مشقت میں ڈال دیا ہے۔''

(البدایہ والنہایہ: ۷/۱۳۶، سیرت عمر بن الخطاب لابن جوزی: ص۱۴۰)

آپ کی رعایا میں مسلمان بھی تھے اور دوسرے مذہب کے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگ بھی تھے۔ عموماً سربراہان مملکت دوسری قوموں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے لیکن آپ نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ وہ لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے اور آپ پر جان چھڑکنے لگے۔ ان کے عہد کا سب سے نمایاں وصف یہی ہے کہ شاہ و گدا، ادنیٰ و اعلیٰ، خویش و بیگانہ، شریف و رذیل اور مسلم و غیر مسلم

---

1. ایلیاء، دراصل ''بیت المقدس'' کا نام ہے۔ اس کو ایلیا اس کے بانی کے نام سے کہا جاتا ہے، اور ایلیا بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام نے اس شہر کو بنایا تھا۔ (حقوق الانسان فی الحرب والسلام للطیار: ص۲۶)

قانون کی نگاہ میں برابر تھے اور غیر مسلموں کو ہر قسم کی دینی اور معاشرتی آزادی حاصل تھی، آپ نے غیر مسلموں کے دینی، معاشرتی اور بنیادی حقوق کی پورے طور پر حفاظت کی۔ جہاں کہیں بھی غیر مسلموں سے معاہدہ کیا ان میں انہیں دینی آزادی، حریت فکر اور ان کو وہ تمام حقوق دیئے جو مسلمان رعایا کو انہوں نے دیئے ہوئے تھے اور یہی دین اسلام کا تقاضا تھا۔ چنانچہ اہل جرجان کے ساتھ ایک معاہدہ میں یہ لکھا گیا کہ "ان کی جان و مال اور مذہب و شریعت سب کو امان ہے، ان میں سے کسی شے میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔" یہ بات صرف الفاظ ہی تک محدود نہ تھی بلکہ عملی طور پر بھی ان شرائط کو پورا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ آپ اپنے گورنروں کو ان معاہدات کی پابندی کرنے کی وقتاً فوقتاً تاکید فرماتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو لکھا:

"مسلمانوں کو غیر مسلم رعایا پر ظلم کرنے، ان کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے اور بے وجہ ان کا مال کھانے سے روکو، جو شرائط معاہدہ میں ان سے طے کی گئی ہیں ان کو پورا کرو۔" (کتاب الخراج: ص ۸۲)

آپ کو غیر مسلمان رعایا کی دینی اور معاشرتی اقدار کا اتنا خیال تھا کہ اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو یہ وصیت فرمائی کہ:

"میں ان لوگوں (غیر مسلموں) کے حق میں جن کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ذمہ دیا گیا ہے، یہ وصیت کرتا ہوں کہ ان سے جو عہد کیا گیا ہے، اسے ہر حالت میں پورا کیا جائے، ان کی حمایت میں لڑا جائے، اور ان کی طاقت سے زیادہ ان کو تکلیف نہ دی جائے۔"

اپنی جان کی حفاظت اور دفاع کا انسانی حق:

انسانی جان اپنے پیدا کرنے والے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ملکیت ہے اور اس میں کوئی شخص اپنی مرضی سے کسی قسم کا کوئی تصرف نہیں کرسکتا۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی لله رب العالمین، لاشریک له وبذالک امرت و انا اول المسلمین﴾

''آپ کہہ دیجئے کہ بے شک میری نماز، میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور مجھے یہی حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔'' (الانعام: ۱۶۲-۱۶۳)

انسانی نفس اللہ کے حکم سے معصوم ہے اور اس کا زندہ رہنا اس کا بنیادی حق ہے، البتہ شرعی طور پر اگر اس سے کوئی ایسا جرم ثابت ہو تو ایک اسلامی حکومت مجرم کو قتل کر سکتی ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کسی انسانی نفس کو بغیر حق کے قتل کرنا حرام قرار دیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق، ذالکم وصکم بہ، لعلکم تعقلون﴾ (الانعام: ۱۵۱)

''اور جس کے قتل کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اس کو ناحق قتل نہ کرو، یہی وہ کام ہے جس کا اللہ نے تم کو موکد حکم دیا ہے تا کہ تم سمجھو۔''

اس آیت میں قتل ناحق کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ قتل ناحق کو سمجھنا اس پر موقوف ہے کہ یہ جان لیا جائے کہ قتل برحق کون کون سے ہیں۔ جو شخص نماز پڑھنے یا زکوٰۃ دینے سے انکار کرے اس کو قتل کر دیا جائے۔ اسی لیے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ سے قتال کیا تھا۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مجھے لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے حتیٰ کہ وہ یہ شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اگر انہوں نے یہ کر لیا تو انہوں نے مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو بچا لیا ماسوا ان کے حقوق کے، اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔ (بخاری، رقم ۲۵، مسلم، رقم [illegible])

اور مرتد، شادی شدہ زانی اور مسلمان کے قاتل کو بھی قتل کرنا برحق ہے۔
(بخاری، رقم ۶۸۷۸، مسلم، رقم ۱۶۷۶)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد

فرمایا: "کسی مسلمان شخص کو جو اس بات کی شہادت دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں (اس کو) قتل کرنا صرف تین میں سے ایک وجہ سے جائز ہے۔ شادی شدہ زانی ہو، کسی مسلمان کا قاتل ہو اور دین اسلام کو ترک کر کے مسلمانوں کی جماعت سے نکلنے والا ہو۔

(بخاری، رقم: ۶۸۷۸، مسلم: ۴۳۹۶، ابوداود، رقم: ۴۳۵۲، ترمذی، رقم: ۱۴۰۲، نسائی، رقم: ۴۰۱۶، سنن ابن ماجہ، رقم: ۲۵۳۴، ابن حبان: ۳۱۳/۹، سنن دار قطنی: ۸۲/۳، شرح السنۃ بغوی: ۱۴۷/۱۰، مسند ابی داؤد طیالسی: ۳۷، مسند احمد: ۳۸۲/۱)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تم جس شخص کو قوم لوط کا عمل کرتا دیکھو تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو۔

(سنن ابی داود، رقم: ۴۴۶۲، ترمذی، رقم: ۱۴۶۱، ابن ماجہ: ۲۵۶۱، سنن دار قطنی: ۱۲۴/۳، سنن کبری بیہقی: ۲۳۱/۸، معرفۃ السنن والآثار: ۳۵۰/۶، مستدرک حاکم: ۳۵۵/۴، شرح السنۃ بغوی: ۳۰۸/۱۰، مسند ابو یعلی: ۳۴۸/۴، مسند احمد: ۳۰۰/۱، معجم کبیر طبرانی: ۳۱۲/۱۱)

اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی جانور کے ساتھ بدفعلی کرے تو بدفعلی کرنے والے اور جانور دونوں کو قتل کر دو۔

(سنن ابی داود، رقم: ۴۴۶۴، ترمذی: ۱۴۶۰، سنن ابن ماجہ: ۲۵۶۴، سنن دار قطنی: ۱۲۶/۳، مستدرک حاکم: ۳۵۶/۴، معرفۃ السنن والآثار بیہقی: ۳۵۲/۶، مصنف عبدالرزاق: ۳۳۵/۷، مسند احمد: ۳۰۰/۱، معجم اوسط طبرانی: ۱۶۳/۱۰)

یہ سب صورتیں تو حق کے ساتھ قتل کرنے کی ہیں، اور ناحق قتل کرنا اسلام میں بہت بڑا جرم ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

﴿ومن یقتل مومناً متعمداً فجزاءه جهنم خالداً فیها، وغضب الله علیه ولعنه واعدله عذاباً عظیماً﴾ (النساء: ۹۳)

"جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اور اللہ اس پر غضب ناک ہوگا اور اس پر لعنت فرمائے گا، اور اللہ نے اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

اور حدیث میں آتا ہے جس کو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرکار

دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز مقتول اپنے قاتل کو پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر لائے گا اس حال میں کہ اس کی رگوں سے خون بہہ رہا ہوگا۔ وہ کہے گا کہ اے میرے رب! اس نے مجھے قتل کیا تھا حتیٰ کہ اس کو عرش کے قریب کھڑا کرے گا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سامنے لوگوں نے توبہ کا ذکر کیا تو انہوں نے اس آیت کی تلاوت کر کے فرمایا: "یہ آیت نہ منسوخ ہوئی ہے اور نہ تبدیل ہوئی ہے، اس کی توبہ کہاں سے ہوگی؟"

امام احمد، امام نسائی اور امام ابن المنذر نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر گناہ معاف فرما دے گا سوائے اس شخص کے جو کفر پر مرے اور سوا اس شخص کے جو کسی مومن کو عمداً قتل کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کو حرام قرار دیا ہے اور کسی کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ کسی کو ناحق قتل کرے یا جان سے مار دے اور نہ ہی کسی کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ کسی مسلمان پر کسی قسم کی کوئی زیادتی کرے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿لزوال الدنیا اھون علی اللہ من قتل مؤمن بغیر حق﴾

"پوری دنیا کو ختم کر دینا اللہ کے لیے زیادہ آسان ہے ایک مومن کو بغیر حق کے قتل کرنے کے مقابلہ میں۔"

(سنن ابن ماجہ، رقم: ۲۶۱۹، ترمذی، رقم: ۱۳۹۵، ترغیب و ترہیب: ۲۹۰/۳، الکامل لابن عدی: ۱۰۰۲/۳)

اور سرکار دو عالم ﷺ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

﴿ان دماء کم واموالکم واعراضکم علیکم حرام، کحرمۃ یومکم ھذا، فی بلدکم ھذا، فی شھرکم ھذا﴾

"(اے لوگو!) تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح تمہارے آج کے دن کی، اور اس شہر کی اور اس مہینہ ذی الحجہ کی حرمت ہے۔"

(بخاری، رقم: ۱۷۳۹/۴۴۴۲، ۲۱/۲۰۳، فتح الباری ۱۰۴/۸، ۱۱۰، ابن ہشام: ۲۰۱/۲، زاد المعاد: ۲۱۸، عیون الاثر: ۳۵۹/۲)

بلکہ اللہ تعالیٰ نے بغیر قصاص کے کسی شخص کو ناحق قتل کرنے کے بارے میں فرمایا کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے پوری انسانیت کو قتل کرنا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں فرمایا:

﴿من اجل ذالک کتبنا علی بنی اسرائیل انه من قتل نفساً بغیر نفس او فساد فی الارض، فکانما قتل الناس جمیعاً، ومن احیاها فکانما احیا الناس جمیعاً﴾ (المائدہ ۳۲)

''اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا کہ جس شخص نے بغیر جان کے بدلے کے یا بغیر زمین میں فساد پھیلانے کے کسی شخص کو قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا، اور جس نے کسی کو مرنے سے بچا لیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو مرنے سے بچا لیا۔''

گویا ایک بے قصور انسان کو عمداً قتل کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنا بڑا جرم ہے جتنا تمام انسانوں کو قتل کر دینا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک مسلمان کو عمداً قتل کرنے کی سزا جہنم مقرر کی اس پر اپنا غضب نازل کیا اور لعنت کی اور اس کے لیے عذاب عظیم تیار کیا۔ اور اگر کوئی شخص تمام انسانوں کو قتل کر دیتا تب بھی اس کی یہی سزا ہوتی۔ نیز اگر تمام انسان کسی ایک بے قصور انسان کے قتل میں عمداً شریک ہوں تو ان سب کو قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔ اس سے پتہ چلا کہ کسی ایک بے قصور انسان کو عمداً قتل کرنا اتنا سنگین جرم ہے جو تمام انسانوں کے قتل کرنے کے برابر ہے۔ اور جس شخص نے ایک انسان کو مرنے سے بچا لیا اس نے گویا تمام انسانوں کو بچا لیا، مثلاً اگر کوئی شخص آگ میں جل رہا تھا یا دریا میں ڈوب رہا تھا، اور کسی شخص نے اس کو اس مصیبت سے نکال کر اس کی جان بچالی تو اللہ کے نزدیک اس کی یہ نیکی اتنی عظیم ہے جیسے کسی شخص نے تمام انسانوں کو موت کے پنجہ اور چنگل سے آزاد کرا لیا ہو۔

انسانی جان کی عظمت کا اس حدیث سے بھی پتہ چلتا ہے جس میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: ''میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ بیت اللہ کا طواف فرما رہے تھے اور آپ نے بیت کو مخاطب کر کے فرمایا:

''تو کس قدر پاکیزہ ہے اور تیری خوشبو کس قدر پاکیزہ ہے، تو کتنا عظمت والا

ہے اور تیری حرمت کتنی عظیم ہے، لیکن قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے ایک مومن کی عزت وحرمت اللہ کے ہاں تیری عزت وحرمت سے کہیں زیادہ ہے۔'' (سنن ابن ماجہ، رقم: ۳۹۳۲)

قاتل کی سزا:

انسانی جان کی اس قدر وقیمت کے باعث اسلام نے قاتل کی سزا قتل رکھی ہے لیکن یہ تو دنیا کی سزا ہے، آخرت میں جیسا کہ بتایا گیا ہے، ناحق کسی مومن کو قتل کرنے والے کے لیے چار سزائیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے لیے جہنم ہے، دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کی غضب ناکی، تیسری یہ کہ اللہ کی لعنت اور چوتھی یہ کہ اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا گیا ہے۔ (النساء: ۹۳)

اسی طرح ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لایزال العبد فی فسحة من دینه مالم یصب دما حراما﴾

(صحیح جامع الصغیر، رقم: ۷۷۲۵)

''ایک مومن بندے کے دین میں ہمیشہ کشادگی اور وسعت رہتی ہے جب تک وہ ناحق خون نہ کرے۔''

یعنی دوسرے کبیرہ گناہوں سے اس کے دین میں ایسا خلل نہیں آتا کہ اللہ کی رحمت سے ناامیدی ہو۔ جب ناحق خون کیا تو خدا کی رحمت سے مایوس ہو گیا۔ بعض حضرات نے کہا فسحت سے یہ مراد ہے کہ ان کو اعمال خیر کی توفیق رہتی ہے مگر ناحق خون کرنے والا، اس کی شومی سے دوسرے اعمال خیر کی توفیق نہیں پاتا۔

اسلام میں انسانی جان کی حفاظت ایک جیسی ہے خواہ وہ جان کسی مسلمان کی ہو یا ذمی اور غیر مسلم کی جس کے ساتھ معاہدہ ہو چکا ہو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی معاہد کو جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی امان میں ہے قتل کرتا ہے، اس نے اس عہد کو توڑا جو اللہ اور اس کے رسول نے بندوں سے لیا تھا اور وہ جنت کی خوشبو تک نہیں سونگھ سکے گا جب کہ جنت کی خوشبو ستر خریف سے آ رہی ہو گی۔

(پہلے عرب لوگ فصل خریف سے سال کا حساب کیا کرتے تھے یہاں تک کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سن ہجری قائم کیا۔ بخاری، رقم ۳۰۴۳)

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اگرچہ بعض فقہاء کے نزدیک مسلمان ذمی کے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا لیکن امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور ابن ابی لیلیٰ کا موقف یہ ہے کہ مسلمان کو ذمی کے بدلہ میں بطور قصاص قتل کیا جائے گا۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اگر کوئی ذمی کسی ذمی کو قتل کر دے، پھر قاتل مسلمان ہو جائے تو اس کو قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے ہم خیال فقہاء فرماتے ہیں کہ خود رسول اللہ ﷺ نے اہل قبلہ میں سے ایک شخص کو ایک ذمی کے بدلہ میں قتل کیا اور فرمایا کہ یہ بات سب سے بڑھ کر میرے لائق ہے کہ میں عہد کا پابند رہوں۔ یہ روایت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جس حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ "مسلم کافر کے بدلہ میں قتل نہ کیا جائے" اس میں اگرچہ کافر کا لفظ عام ہے مگر یہ حدیث اسے کافر حربی کے معنی میں مخصوص کر دیتی ہے اور ذمی اس کے حکم سے خارج ہو جاتا ہے۔ نیز وہ اس سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کا مال چوری کر لے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، لہٰذا قیاس کا تقاضا بھی یہ ہے کہ جب ذمی کا مال، مال مسلم کے برابر ہے تو اس کی جان بھی ایک مسلمان کی جان کے برابر ہے۔ پھر قصاص کی نصوص میں بھی عموم ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ﴾ (بقرہ ۱۷۸)

"یعنی مقتولوں کے بارے میں قصاص تم پر فرض کیا گیا ہے۔"

اسی طرح سورۃ المائدہ میں فرمایا:

﴿وکتبنا علیھم فیھا ان النفس بالنفس الآیہ﴾ (المائدہ: ۴۵)

"اس بارے میں ہم نے ان پر فرض کیا تھا کہ جان کے بدلے جان۔"

ان آیات میں قاتل اور مقتول کے درمیان اور جان اور جان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے لہٰذا تخصیص اور قید کے دعوے دار کو دلیل اور ثبوت پیش کرنا چاہیے۔ پھر امام ابوحنیفہ کے دعویٰ کی دلیل میں بہت سی احادیث بھی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے

ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مسلمان کو ایک معاہد (وہ کافر جس سے معاہدہ ہوا ہو) کے بدلہ میں قتل کر دیا اور فرمایا جو لوگ اپنے معاہدہ کو پورا کرتے ہیں میں ان میں سب سے بڑھ کر کریم ہوں۔ (سنن دارقطنی، رقم: ۳۲۳۲، سنن کبریٰ بیہقی ۸: ۳۰)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ایک ذمی کے بدلہ میں اہل قبلہ کے ایک شخص کو قتل کر دیا۔ (سنن دارقطنی، رقم: ۳۲۳۴)

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس مسلمان سے قصاص لیا جس نے ایک یہودی کو قتل کر دیا تھا۔ راوی نے کہا کہ مسلمان سے ذمی کا قصاص لیا اور فرمایا:

''جو لوگ اپنے عہد کو پورا کریں میں ان میں سب سے زیادہ کریم ہوں۔''

(سنن دارقطنی، رقم: ۳۲۳۳)

قتل کے بارے میں اسلام بہت سخت ہے۔ چنانچہ اسلام کہتا ہے کہ قاتل کو قصاص میں قتل کر دیا جائے خواہ قاتل ایک ہو یا متعدد۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمر ؓ فرماتے ہیں کہ ایک لڑکے کو دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔ سیدنا عمر ؓ نے فرمایا اگر اس کے قتل میں تمام اہل صنعا شریک ہوتے تو میں ان سب کو قتل کر دیتا۔ (بخاری ۲: ۱۰۱۸)

علماء نے لکھا ہے کہ اگر بادشاہ اپنی رعیت میں سے کسی شخص پر زیادتی کرے تو وہ خود اپنی ذات سے قصاص لے گا کیونکہ بادشاہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مقتول کے سبب سے تمام مسلمانوں پر قصاص کو فرض کیا ہے۔ اگر کوئی بادشاہ کسی شخص کو بے قصور قتل کر دیتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ خود کو قصاص کے لیے پیش کرے۔ اس سلسلہ میں سیدنا ابوسعید خدری ؓ بیان فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ کوئی چیز تقسیم فرما رہے تھے۔ ایک شخص آپ ﷺ پر جھک گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو ایک چھڑی چبھوئی۔ اس نے ایک چیخ ماری۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو فرمایا: آؤ بدلہ لے لو۔ اس شخص نے کہا نہیں، یا رسول اللہ! میں نے معاف کر دیا۔'' (سنن نسائی ۲: ۲۴۲)

ایک اور روایت میں ہے کہ اس شخص کے چہرہ پر زخم لگ گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آؤ مجھ سے بدلہ لے لو'' اس نے کہا ''میں نے معاف کر دیا۔''

(ابوداؤد ۲: ۲۶۹)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ کو قصاص کے لیے پیش فرمایا۔ (نسائی: ۲/ ۲۴۴، مسند احمد: ۱/ ۴۱)

ابونضر وغیرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ ایک شخص نے سرخ رنگ کی خوشبو لگائی ہوئی تھی۔ آپ ﷺ کے ہاتھ میں ایک تیر تھا۔ آپ نے وہ تیر اس کو چبھو دیا اور فرمایا: ''کیا میں نے تم کو اس سے منع نہیں کیا تھا؟'' اس شخص نے کہا: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اور بے شک آپ ﷺ نے مجھ کو زخمی کر دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تیر اس کے آگے ڈال دیا اور فرمایا کہ ''تم اپنا بدلہ لے لو۔'' اس شخص نے کہا: ''یا رسول اللہ! جب آپ نے مجھے تیر چبھویا تھا تو میرے بدن پر کپڑا نہیں تھا اور آپ نے قمیض پہنی ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے پیٹ سے کپڑا ہٹا دیا۔ اس شخص نے جھک کر آپ کے بدن مبارک کا بوسہ لے لیا۔

(سنن کبریٰ بیہقی: ۸/ ۴۸)

سیدنا اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ بڑے ہنس مکھ اور مزاح کرنے والے انسان تھے۔ ایک روز وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے باتیں کر رہے تھے اور ان کو ہنسا رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی انگلی ان کی کوکھ میں چبھوئی۔ انہوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''بدلہ لے لو۔'' انہوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے قمیص پہنی ہوئی ہے اور میں نے قمیص نہیں پہنی ہوئی تھی۔'' رسول اللہ ﷺ نے اپنی قمیص اٹھا دی۔ وہ آپ کے بدن سے لپٹ گئے اور آپ کے پہلو کا بوسہ لے لیا اور کہنے لگے: ''یا رسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان، میرا یہی ارادہ تھا۔'' (سنن کبریٰ بیہقی: ۸/ ۴۹)

ابوفراس بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا: ''میں گورنروں کو اس لیے نہیں بھیجتا کہ وہ لوگوں کے جسموں پر ضرب لگائیں اور نہ اس لیے کہ وہ ان کا مال لیں۔ جس شخص کے ساتھ کسی حاکم اور گورنر نے ایسا کیا وہ مجھ سے شکایت کرے، میں اس سے قصاص لوں گا۔'' سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اگر کوئی شخص اپنی رعیت کو تادیباً مارے آپ پھر بھی اس سے قصاص لیں گے؟'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے

فرمایا: ''ہاں خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! میں اس سے قصاص لوں گا، اور بے شک میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے، آپ نے اپنے آپ کو قصاص کے لیے پیش کیا تھا۔'' (سنن ابوداود: ۲/ ۳۶۸، سنن کبریٰ بیہقی: ۸/ ۴۸)

جریر بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر دشمنوں پر غلبہ پایا اور مال غنیمت حاصل کیا۔ سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کو اس کا حصہ دیا اور تمام مال غنیمت نہیں دیا۔ اس نے کہا کہ وہ تمام مال غنیمت لے گا۔ سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کو بیس کوڑے مارے اور اس کا سر مونڈھ دیا۔ اس نے وہ تمام بال اکٹھے کیے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی شکایت کی اور وہ بال نکال کر دکھائے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے نام خط لکھا:

''سلام کے بعد واضح ہو کہ فلاں شخص نے مجھ سے تمہاری شکایت کی ہے اور میں نے یہ قسم کھائی ہے کہ اگر واقعی تم نے اس شخص کے ساتھ یہ زیادتی لوگوں کے مجمع میں کی ہے تو میں لوگوں کے مجمع میں تم سے اس شخص کا قصاص لوں گا، اور اگر تم نے تنہائی میں اس شخص کے ساتھ یہ زیادتی کی ہے تو میں تنہائی میں تم سے اس شخص کا قصاص لوں گا۔ لوگوں نے سفارش کی'' اور کہا کہ ابوموسیٰ کو معاف کر دیجیے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں، خدا کی قسم! میں کسی شخص کے ساتھ ہرگز رعایت نہیں کروں گا۔'' جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو وہ خط دیا اور قصاص لینے کے لیے تیار ہو گئے تو اس شخص نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہا: ''میں نے ان کو اللہ کے لیے معاف کر دیا۔'' (سنن کبریٰ بیہقی: ۸/ ۵۰)

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قاتل کوئی بھی ہو مقتول کا بدلہ اس سے ضرور لیا جائے گا کیونکہ مقتول کو یہ حق ہے، اگر ایسا نہ کیا جائے تو یہ دنیا فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن جائے گی اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو جائے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ولكم في القصاص حياة﴾ (بقرہ: ۱۷۸)

''اور تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔''

اور زندگی کا معنی ذمی کے بدلے مسلمان کے قتل میں زیادہ بہتر طور پر متحقق ہوتا

ہے بہ نسبت مسلمان کے بدلے مسلمان کے قتل میں، کیونکہ دینی عداوت اسے قتل پر اکساتی ہے خاص طور پر غصے کی حالت میں۔ اگر ذمی کے خون کی حرمت ہی نہ ہو تو پھر عقد ذمہ کے معنی آخر کیا رہ جاتے ہیں؟ نیز اہل ذمہ دار الاسلام کے شہری ہیں، ان کے حقوق وہی ہیں جو مسلمانوں کے ہیں اور ان کی ذمہ داریاں بھی وہی ہیں جو مسلمانوں کی ہیں۔

اگر مرد کسی عورت کو قتل کر دے تو اس کے بدلہ مرد اسی طرح قتل کیا جائے گا جس طرح ایک عورت کسی مرد کے قتل کرنے کے جرم میں قتل کی جائے گی کیونکہ بحیثیت انسان دونوں مساوی اور برابر ہیں اور دونوں کی جان یکساں محترم ہے۔

قاتل اور مقتول کے درمیان تعداد کی مماثلت شرط نہیں ہے، مماثلت تو فعل میں فعل کے مقابلہ میں شرط ہے تاکہ دوسروں کو زجر ہو۔ پھر تلافی مافات کے لیے شرط ہے۔ چنانچہ ایک جماعت اگر کسی ایک شخص کو قتل کر دے تو قصاص میں وہ سب قتل کیے جائیں گے اگرچہ فرد واحد اور اس کے درمیان کوئی عددی مماثلت نہیں پائی جاتی، تاہم فعل یعنی قتل اور مافات میں زجر اور تلافی (Copmensation) کے طور پر مماثلت موجود ہے۔ اگر جماعت فرد واحد کو قتل کرے تو اس پر قصاص کو لاگو کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ قتل تو عام طور پر باہم تعاون سے اور مل کر ہی کیا جاتا ہے، لہٰذا اگر اس پر قصاص لاگو نہ کیا جائے تو قصاص کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا کیونکہ پھر تو یہ ہوگا کہ جو شخص بھی کسی دوسرے شخص کو قتل کرنے کا ارادہ کرے گا وہ دوسروں کو اپنے ساتھ ملا کر ان سے مدد لے گا تاکہ اس پر سے قصاص ساقط ہو جائے، اور اس طرح تو وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا جس کے لیے قصاص مشروع ہوا ہے، اور وہ مقصد ہے زندگی۔ سیدنا عمرؓ کی رائے بھی یہی تھی۔ چنانچہ صنعاء کے ایک مقتول کے مقدمہ میں انہوں نے فرمایا کہ اگر اہل صنعاء سب کے سب اس پر حملہ آور ہوئے ہوتے اور اسے قتل کر دیتے تو میں ان سب کو اس ایک کے قصاص میں قتل کر دیتا۔ نیز مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایک مقتول کے بدلہ میں متعدد قاتلین کو قتل کیا جائے، کیونکہ جب مجرم متعدد ہوں تو ہر ایک کے دل میں قتل کا ارادہ پایا جاتا ہے اور متضرر کی موت سب کے فعل کی وجہ سے واقع ہوتی ہے، اور شرائط قصاص ہر ایک کے بارے میں پوری ہو جاتی ہیں، لہٰذا کسی کو اس لیے معاف نہیں کیا جا سکتا کہ جرم

میں کچھ اور لوگ بھی اس کے شریک تھے بلکہ متعدد افراد کا قتل میں شریک ہونا ارتکاب جرم کے لیے ممد ومعاون ہو جاتا ہے، اور ایسی صورت میں بالعموم جرم کا ارتکاب زیادہ آسان ہوتا ہے۔

اسی طرح فرد واحد کو متعدد اشخاص کے قتل کے بدلے میں قتل کیا جائے گا اور یہی سزا کافی ہے، اور قصاص کے علاوہ اور کوئی چیز از قسم مال واجب نہ ہوگی۔ اس کے دلائل علامہ کاسانی نے بدائع الصنائع ۷/۲۳۷ میں نقل کیے ہیں۔ نیز اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہماری کتاب ''اسلام کا نظام عدل''۔

چھوٹے بچوں اور جنین کے قتل کی حرمت:

شریعت اسلامی نے ایک انسانی جان کو ہر قسم کا حق زیست یعنی زندہ رہنے کا حق دیا ہے اگرچہ وہ چھوٹا بچہ ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿واذا الموؤدة سئلت، بای ذنب قتلت﴾ (تکویر ۸۔۹)

''اور زندہ گاڑھی ہوئی بچی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی۔''

اس آیت کی تفسیر میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں

''عرب میں رسم تھی کہ باپ اپنی بیٹی کو نہایت سنگ دلی اور بے رحمی سے زندہ زمین میں گاڑ دیتا تھا، بعض تو تنگ دستی اور شادی بیاہ کے اخراجات کے خوف سے یہ کام کرتے تھے اور بعض کو یہ عار تھی کہ ہم اپنی بیٹی کسی کو دیں گے، وہ ہمارا داماد کہلائے گا۔ قرآن حکیم نے آگاہ کیا کہ ان مظلوم بچیوں کی نسبت بھی سوال ہوگا کہ کس گناہ پر ان کو قتل کیا تھا، یہ مت سمجھنا کہ ہماری اولاد ہے، اس میں ہم جو چاہیں تصرف کریں، بلکہ اولاد ہونے کی وجہ سے جرم اور زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔'' (فوائد عثمانی ص ۷۷۹)

بتایا یہ کہ ایک چھوٹی سے چھوٹی انسانی جان کو بھی اسلام نے اس دنیا میں زندگی گزارنے کا پورا پورا حق دیا ہے کیونکہ اس دنیا میں اس کو بھیجا ہی اس لیے گیا تھا کہ وہ دنیا

کی اس اسٹیج پر اپنا کردار ادا کرے۔ اور جو لوگ اس وجہ سے اپنی اولاد کو قتل کرتے ہیں کہ ان کو کھلائیں گے کہاں سے کیونکہ ہمارے وسائل زندگی کم ہیں، انہیں یہ کہہ کر قتل اولاد سے روکا گیا:

﴿ولا تقتلوا اولادكم خشية املاق، نحن نرزقكم واياكم، ان قتلهم كان خطأً كبيراً﴾ (الاسراء:۳۱)

''اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو کیونکہ ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی، بے شک ان کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔''

اولاد کو اس لیے قتل کرنا کہ ان کو کھلانے کے لیے رزق میسر نہیں ہوگا تو یہ اللہ تعالیٰ کی رزاقی کے ساتھ بدگمانی ہے اور اگر بیٹیوں سے عار کی وجہ سے ہو تو پھر نظام عالم فاسد ہو جائے گا۔ اور پہلی صورت میں اللہ کی تعظیم کے خلاف ہے اور دوسری صورت مخلوق پر شفقت کے خلاف ہے۔ ماں باپ کا اولاد کے ساتھ جو تعلق ہے وہ جزئیت کا ہے کیونکہ اولاد والدین کا جز ہوئی ہے اور یہ ایک دوسرے سے محبت کا قوی سبب ہے، اور یہ فطری اور طبعی محبت ہے اور اولاد کو قتل کرنا اس طبعی محبت کے خلاف ہے۔

اسلام نے اسلامی زندگی کا یہاں تک تحفظ کیا کہ اسقاط حمل کو بغیر کسی عذر کے حرام قرار دیا۔ چنانچہ قرآن وحدیث میں اس کو ناجائز قرار دیا گیا اور امام غزالیؒ نے اس کو مطلق حرام قرار دیا۔ (هي محرم مطلقاً) بلکہ خاندانی منصوبہ بندی جس کی آج پاکستان میں اس قدر تشہیر ہو رہی ہے اور اس پر کروڑوں روپے خرچ ہو رہے ہیں۔ یہ بھی ایک شیطانی عمل اور اسلام کی رو سے ناجائز ہے، اور اگر اس کی نوہ لگائی جائے تو یہ ایک یہودی سازش ہے جس کو عیسائی اور مسلمان حکومتیں عملی جامہ پہنا کر یہودیوں کی مدد کر رہی ہیں۔ شیطان نے قتل اولاد کا ایک طریقہ یہ نکالا کہ ''بچے دو ہی اچھے'' کا نعرہ لگا دو۔ اور لوگوں کے دلوں میں یہ خوف ڈال دو کہ اگر بچے زیادہ ہو گئے تو اس مہنگائی کے دور میں ان کی پرورش مشکل ہوگی، چنانچہ وہ تنگی رزق کے خوف سے اپنے بچوں کو دنیا میں آنے سے قبل ہی قتل کر دیتے ہیں۔ حکومتی میڈیا اور نشر واشاعت کے ذرائع سے ضبط تولید اور خاندانی منصوبہ بندی کا بڑے زور شور سے پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ ''کم بچے خوش

حال ٹھہرانہ۔" اور کہا جاتا ہے کہ ملک کی اس تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے سیلاب کے سامنے بند باندھنا نہایت ضروری ہے کیونکہ ملکی وسائل اس بڑھتی ہوئی آبادی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ قرآن حکیم نے اس کا نہایت سختی سے رد کیا ہے اور کہا ہے کہ تمہارا رزق زمین پر نہیں بلکہ آسمان پر ہے۔

اسلام زیادہ بچے پیدا کرنے والی عورتوں کو پسند کرتا ہے۔ چنانچہ سیدنا معقل بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: "مجھے ایک عورت ایسی ملی ہے جو بہت خوبصورت اور عالی خاندان کی ہے، لیکن اس سے بچے پیدا نہیں ہوتے یعنی وہ بانجھ ہے، کیا میں اس سے نکاح کرلوں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: "نہیں۔ وہ دوبارہ آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور پھر اس عورت سے نکاح کرنے کی اجازت طلب کی۔ آپ ﷺ نے پھر منع فرمایا۔ اس نے پھر تیسری مرتبہ آ کر اجازت نکاح طلب کی، تب آپ نے ارشاد فرمایا: "محبت کرنے والی اور بچے پیدا کرنے والی عورتوں سے نکاح کرو کیونکہ بے شک میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔"

(سنن ابوداؤد، رقم: ۲۰۵۰، نسائی، رقم: ۳۲۲۷، ابن حبان، رقم: ۴۰۵۶، ۴۰۵۷، ۴۰۲۸، مسند احمد: ۳/ ۱۵۸، ۲۴۵، سنن کبریٰ بیہقی: ۷/ ۸۱، مجمع الزوائد: ۴/ ۲۵۲، ۲۵۸، معجم اوسط: ۵۷۴۴)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ منشائے نبوت کثرت اولاد ہے نہ کہ قلت اولاد، لہٰذا خاندانی منصوبہ بندی اور ضبط تولید کا وسائل پیداوار میں کمی کی بنیاد پر پراپیگنڈہ کرنا اسلام کے خلاف ہے اور کسی جبری قانون کے ذریعہ عوام پر لاگو کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ البتہ کسی عذر شرعی کی بنا پر ضبط تولید جائز ہے، لیکن انفرادی طور پر نہ کہ حکومتی اور جماعتی سطح پر۔

ضبط تولید کا ایک طریقہ تو خاص طور پر شرعاً ممنوع ہے، اور وہ ہے نس بندی، اس عمل میں مرد کی جن نالیوں سے تولیدی جرثومے (Sperm) گزرتے ہیں، ان نالیوں کو کاٹ کر باندھ دیا جاتا ہے اس کے بعد پھر مرد میں بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور مرد بانجھ ہو جاتا ہے۔ گویا یہ عمل مرد کی مردانگی کو ہمیشہ کے لیے ختم

کر دیتا ہے، اس لیے یہ کسی صورت اسلام میں جائز نہیں ہے۔

موجودہ دور کا نظریہ خاندانی منصوبہ بندی خالص الحاد پر مبنی ہے، اور اسلام میں اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس نظریہ کا مرکزی نقطہ اور محور یہ ہے کہ انسانی آبادی کے پھیلاؤ کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت محدود کر دیا جائے تاکہ وسائل معاش اور اسباب معیشت کی تنگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہ خالص خود غرضی پر مبنی فلسفہ ہے جس کی اساس یہ ہے کہ ہم اپنی آسائش کے لیے دوسرے انسانوں کا وجود برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ گویا یہ ایسا ہی ہے کہ جو لوگ زندگی کی ریل گاڑی پر سوار ہو چکے ہیں وہ ہاتھ ہلا ہلا کر کہہ رہے ہیں کہ دوسروں کو اس گاڑی پر سوار نہ ہونے دیں۔ دراصل ان لوگوں کو اپنے باپ اور ماں کو منصوبہ بندی کا مشورہ دینا چاہیے تھا تاکہ ان کے ناپاک وجود دنیا میں تشریف نہ لاتے اور لوگ ان کے ان ملحدانہ نظریات کو نہ سنتے اور نہ ان سے متاثر ہوتے۔

یہ قانون قدرت ہے کہ وسائل و اسباب سے برتر اور بالاتر رزق مخلوق کی حقیقی منصوبہ بندی اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہوئی ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ جب اور جہاں ظاہری طور پر جغرافیائی، موسمی یا سائنسی اور علمی اور فنی وجوہ کی بنا پر وسائل رزق انسانوں کے کسی گروہ یا کسی ملک یا قوم کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ مجتمع ہوئے تو بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ انہوں نے اس سے مخلوق خدا کو فیض یاب کرنے کے بجائے لاکھوں ٹن غلہ سمندر میں بہا دیا یا اسے ضائع کر دینا زیادہ مناسب سمجھا۔ درحقیقت یہی وہ اقوام ہیں جو فلاح انسان اور انسان دوستی کے پرکشش نام پر زر کثیر صرف کر کے خاندانی منصوبہ بندی کی مہم کو پس ماندہ اقوام اور تیسری دنیا کے ممالک میں پھیلا رہی ہیں۔ حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ انسان کھانے کے لیے ایک منہ اور کمانے کے لیے دو ہاتھ لے کر پیدا ہوا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ روزی کے دروازے کبھی تم پر تنگ نہیں ہوں گے۔ اگر تم محنت اور مشقت کرو گے۔ فرمان خداوندی ہے:

﴿ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجاً و یرزقہ من حیث لا یحتسب﴾ (طلاق:۲)

"اور جس شخص کے دل میں خوف خدا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے

راہیں کھول دے گا اور وہاں سے رزق عطا فرمائے گا جہاں سے
اس کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔"

حدیث کی اور طب کی رو سے چار ماہ بعد پیٹ کے بچے میں روح پھونک دی جاتی ہے، اور وہ عملاً ایک جاندار بچہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت حمل ضائع کرنا پیٹ کے بچہ کو قتل کرنا ہے، اور یہ قتل انسان کے حکم میں ہے اور گناہ کبیرہ ہے۔ (بخاری ۱/۲۵۶)

خودکشی کا حرام ہونا:

اسلام نے کسی انسان کو اس بات کی بھی اجازت نہیں دی کہ وہ خود اپنی جان کو ہلاک کرے چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿ولا تقتلوا انفسکم، ان الله کان بکم رحیما﴾ (النساء:۲۹)

"اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، بے شک اللہ تم پر بہت رحم
فرمانے والا ہے۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خودکشی سے منع فرمایا، اور اسی آیت کی بنا پر اسلام میں خودکشی کرنا حرام ہے۔

چنانچہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی ہتھیار سے خودکشی کرے گا تو جہنم میں وہ ہتھیار اس شخص کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ شخص جہنم میں اس ہتھیار سے ہمیشہ خود کو زخمی کرتا رہے گا، اور جو شخص زہر سے خودکشی کرے گا وہ جہنم میں ہمیشہ زہر کھاتا رہے گا اور جو شخص پہاڑ سے گر کر خودکشی کرے گا وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ گرتا رہے گا۔" (مسلم، رقم: ۱۰۹، فتح الباری: ۱۰/۲۵۸، رقم ۵۷۷۸)

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کہ جو شخص دنیا میں کسی شے سے اپنے آپ کو قتل کرے گا قیامت کے روز اسی سے اسے عذاب دیا جائے گا۔"
(کتاب الام للشافعی ۶/۴)

اسی طرح اسلام نے ہر اس مبارزت کی شکل کو بھی حرام قرار دیا ہے جس میں دوسرے کی جان جانے کا خطرہ ہو۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب دو

مسلمان تلوار لے کر آمنے سامنے ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہیں۔ صحابہ کرام ؓ نے دریافت کیا کہ قاتل کے جہنمی ہونے کی بات تو سمجھ میں آ گئی لیکن مقتول کا جہنمی ہونا کیوں ہے؟ فرمایا: وہ اس لیے کہ وہ بھی تو اپنے حریف کو قتل کرنے کا خواہش مند اور حریص تھا۔

(رواہ البخاری و مسلم و احمد و ابوداؤد والنسائی عن ابی بکرۃ، بخاری ۱/۲۰، مسلم ۱۸/۱۱، شرح الکبیر ۸/۱۷)

اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ نہیں پڑھی لیکن یہ نماز جنازہ نہ پڑھنا زجراً تھا جس طرح کہ آپ نے مقروض کی نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ صحابہ کرام ؓ نے بھی اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی کیونکہ دوسروں کی نماز آپ کی نماز کے برابر نہیں۔ ارشاد خداوندی ہے کہ "آپ کی صلوٰۃ ان کے لیے باعث سکون ہے۔" اس سے علماء نے لکھا ہے کہ کسی بڑے عالم اور مفتی کو اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھنا چاہیے۔ ایک عام مسلمان کو چاہیے کہ اس کی نماز جنازہ پڑھا دے۔

ہر شخص کو اپنی جان کا دفاع کرنا چاہیے:

ہر شخص کو اسلام نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ جب کوئی اس کا خون بہانے اور اس کو مارنے کی کوشش کرے تو وہ اپنی جان کا دفاع کرے۔ یہ اس کا ایک بنیادی حق ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدی علیکم، واتقوا الله، واعلموا ان الله مع المتقین﴾

(بقرہ: ۱۹۴)

"سو جو شخص تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے تم پر زیادتی کی ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ ان کے ساتھ ہے جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔"

اس آیت میں بتایا گیا کہ کفار نے تم کو جس قدر نقصان پہنچایا ہے ان سے اتنا ہی

بدلہ لو، ان کا تم پر زیادتی کرنا ظلم اور مسلمانوں کا بدلہ لینا عدل ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے دونوں کے فعل کو ''اعتداء'' یعنی زیادتی فرمایا کیونکہ صورۃً دونوں فعل ایک جیسے ہیں۔

اور حدیث میں سیدنا سعید بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

﴿من قتل دون ماله فهو شهيد، ومن قتل دون دينه فهو شهيد، ومن قتل دون دمه فهو شهيد، ومن قتل دون اهله فهو شهيد﴾

(رواہ الترمذی، کتاب الدیات، رقم: ۱۴۲۱، وقال حدیث حسن صحیح)

''جو اپنے مال کے دفاع میں قتل ہو وہ شہید ہے، جو اپنے دین کے دفاع میں قتل ہو وہ شہید ہے، جو اپنے خون اور جان کے دفاع میں لڑتا ہوا قتل ہو وہ شہید ہے، اور جو اپنے اہل وعیال کا دفاع کرتے ہوئے قتل ہو وہ بھی شہید ہے۔''

یہ تو انفرادی شہادت ہے جو اپنے مال، دین، جان اور اہل وعیال کی حفاظت میں ایک شخص لڑتا ہوا مارا جائے۔ اسلام نے اس سلسلہ میں تمام مسلمانوں کو اجتماعی حیثیت میں بھی اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں اپنے دفاع کا پورا پورا حق دیا ہے تاکہ ان پر کوئی ظلم وستم نہ کر سکے، اور ان کی جان ومال اور دین وایمان پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہ کر سکے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں فرمایا:

﴿واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم الآية﴾ (الانفال: ۶۰)

''اور (اے مسلمانو!) تم اپنی استطاعت کے مطابق ان (سے مقابلہ) کے لیے ہتھیار تیار رکھو اور بندھے ہوئے گھوڑے، اور ان سے تم اللہ کے دشمنوں کو مرعوب کر سکو اور ان کے سوا دوسرے دشمنوں کو جنہیں تم نہیں جانتے، اللہ انہیں جانتا ہے، اور تم اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی خرچ کرو گے اس کا تمہیں پورا پورا اجر دیا جائے گا اور

تم پر بالکل ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اجتماعی حیثیت میں بھی مسلمانوں کو دشمنوں کے مقابلہ کی ترغیب دے رہا ہے۔ چنانچہ سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ عرض کیا: یا رسول اللہ! کون سا عمل سب سے افضل ہے۔ آپ نے فرمایا: "اللہ پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا۔"

(مسلم، رقم: ۱۳۶، بخاری، رقم: ۲۵۱۸، سنن نسائی، رقم: ۳۰۲۸، ابن ماجہ، رقم: ۲۵۲۳، الادب المفرد، رقم: ۲۲۰، مصنف عبدالرزاق: ۱۱/۱۹۱، سنن الدارمی: ۲/۳۰۷، سنن کبریٰ بیہقی: ۹/۲۷۲، شرح السنۃ بغوی: ۹/۳۵۳، مسند احمد: ۵/۱۵۰، مسند حمیدی: ۱/۳۰۷، مصنف ابن ابی شیبہ: ۵/۲۸۵)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو عورتوں کے بعد گھوڑوں سے سب سے زیادہ کسی اور چیز سے محبت نہ تھی۔ (سنن نسائی، رقم: ۳۵۶۴)

ایسے ہی ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ گھوڑوں کو باندھ کر رکھو اور ان کی پیشانیوں کو اور ان کی رانوں کو ملو، اور دین کی سربلندی، اعلائے کلمۃ اللہ اور مسلمانوں کے دفاع کے لیے ان کو رکھو نہ کہ زمانہ جاہلیت کے بدلے لینے کے لیے۔ اور ایسے گھوڑے رکھو جن کا ماتھا اور پیر سرخ اور سفید ہوں یا جن کا ماتھا اور ہاتھ پیر سفید ہوں یا جن کا ماتھا اور ہاتھ پیر کالے اور سیاہ ہوں۔ (سنن ابوداؤد، رقم: ۲۵۴۳، نسائی، رقم: ۳۵۹۷)

اس زمانہ میں گھوڑے اور شمشیر اور نیزے تھے۔ اس زمانہ ٹینک، توپیں، میزائل اور ایٹم بم وغیرہ ان گھوڑوں کے بدل میں ہیں اور ان کا پاس رکھنا نہایت ضروری ہے۔ ایٹم بم اور میزائل وغیرہ سے مقصود ان کا چلانا نہیں بلکہ دشمن کو مرعوب کرنا ہے، لیکن اگر چلانا بھی پڑے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اصل مقصد دشمنوں کو مرعوب کرنا ہے، کیونکہ کفار کو جب علم ہوگا کہ مسلمان جہاد کے لیے مکمل طور پر تیار ہیں اور جہاد کا تمام اسلحہ اور آلات حرب اس کے پاس موجود ہیں تو وہ ہر وقت مسلمانوں سے خوف زدہ رہیں گے اور وہ مسلمان ممالک پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ اگر ہمارے پاس اس وقت ایٹم بم اور غوری میزائل وغیرہ نہ ہوتے تو ہندوستان نے کب کا ہم پر حملہ کر دیا ہوتا۔ ہمارے اسی اسلحے نے دشمن کو مرعوب کر کے رکھا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے اور مسلمانوں کی عزت وتوقیر کے لیے جہاد کا حکم دیا اور حدیث میں اس کو ''ذروۃ سنام'' سب سے بلند عمل بتایا۔ قرآن حکیم میں بھی بے شمار آیات میں جہاد کی فضیلت کو بیان فرمایا۔

(ملاحظہ ہو التوبہ: ۲۰۔۲۲، ۱۱۱، النساء: ۹۵۔۹۶، الصف: ۱۰۔۱۲ وغیرہ)

حدیث میں بھی اسی کی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے۔ فرمایا کہ اللہ کی راہ میں صبح کرنا یا شام کرنا دنیا ومافیہا سے بہتر ہے۔'' (بخاری، رقم: ۲۷۹۲، مسلم: ۴۷۹۲، نسائی، رقم: ۳۱۱۸)

ایک اور حدیث میں آپ نے قسم اٹھا کر فرمایا کہ تم میں سے جو شخص بھی اللہ کی راہ میں زخمی ہوگا اور اللہ کو خوب علم ہے کہ کون اس کی راہ میں زخمی ہوا ہے، تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے زخم سے خون بہہ رہا ہوگا، رنگ خون کا ہوگا اور خوشبو مشک کی ہوگی۔ (موطا امام مالک، رقم: ۱۰۰۱، بخاری، رقم: ۲۸۰۳، مسلم: ۴۷۷۹)

قرآن حکیم نے تو شہداء کے بارے میں یہاں تک کہا کہ ''جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے ہیں ان کو مردہ گمان مت کرو بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، ان کو رزق دیا جاتا ہے۔'' (آل عمران: ۱۶۹)

اس آیت کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ شہداء کی روحیں سبز پرندوں کے پیٹ میں ہیں۔ ان کے لیے عرش میں قندیلیں لگی ہوئی ہیں وہ جہاں چاہتی ہیں چرتی ہیں اور پھر ان قندیلوں کی طرف لوٹ آتی ہیں۔ پھر ان کا رب ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے...... الخ (مسلم، رقم: ۴۸۰۴، ترمذی: ۳۰۱۸، ابن ماجہ: ۲۸۰۱)

عقل کی حفاظت اور اس کے دفاع کا حق

عقل انسان کا ایک بہت بڑا جوہر ہے جو حیوانات سے اس کو فضیلت دیتا ہے۔ حیوانات میں شعور ہے عقل نہیں جب کہ انسان میں عقل بھی ہے اور شعور بھی۔ اسی عقل سے انسان غور وفکر کر کے ہدایت کا راستہ تلاش کرتا ہے۔ اس وجہ سے شریعت نے اس کی عزت اور اکرام کیا ہے اور اس پر جبر واکراہ کر کے تبدیلی دین سے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ تبدیلی جبر پر نہیں بلکہ انسانی عقل پر ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے کہ:

''دین میں جبر نہیں ہے۔ بے شک ہدایت گمراہی سے خوب واضح ہو چکی ہے، سو جو شخص طاغوت سے کفر کر کے اللہ پر ایمان لے آیا تو اس نے ایسا مضبوط دستہ پکڑ لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے، اور اللہ خوب سننے والا بہت جاننے والا ہے۔'' (البقرہ: ۲۵۶)

یہ انسانی عقل ہی ہے جس سے ایک انسان رشد وہدایت اور گمراہی وضلالت کے درمیان فرق کر سکتا ہے۔ عقل کا یہ جوہر لطیف نہ ہو تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ اسی وجہ سے قرآن نے بار بار عقل انسانی کو غور وفکر کرنے اور مختلف مسائل کے استنباط کے لیے جن سے انسانی زندگی منتفع ہوتی ہے، ترغیب دی ہے۔ چنانچہ ایک آیت میں فرمایا:

''بے شک آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے، رات اور دن کے بدل کر آنے اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے لیے نفع کی چیزیں لیے ہوئے سمندر میں رواں دواں ہیں، اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے نازل کیا پھر اس سے مردہ زمین کو زندہ کیا، اور اس میں ہر قسم کے

جانور پھیلا دیئے، اور ہواؤں کے پھیرنے میں اور بادلوں میں جو
آسمان اور زمین کے درمیان اللہ کے تابع ہیں، ضرور ان (سب)
میں عقل والوں کے لیے (اللہ کی معرفت کی) نشانیاں ہیں۔"

(بقرہ، ۱۶۴)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارباب عقل کے لیے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر مختلف نشانیاں رکھیں تاکہ لوگ عقل سے کام لے کر توحید خداوندی کے مسئلہ کو پہچان سکیں اور اپنے جھوٹے خداؤں کا انکار کر سکیں۔

آسمانوں کے پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ نے یہ نشانی رکھی کہ وہ بغیر ستونوں کے قائم ہے اور عام عادت کے خلاف بغیر ستونوں کے آسمان کا اس طرح کھڑا اور قائم رہنا کسی زبردست ہستی اور خالق کے بغیر ممکن نہیں ہے پھر زمین میں سمندر اور دریا ہیں، معدنیات اور جنگلات ہیں، باغات اور فصلیں ہیں، ان سب میں اللہ تعالیٰ کے وجود کی نشانیاں رکھی ہوئی ہیں تاکہ لوگ اللہ کو پہچانیں۔ سمندروں کی روانی اور زمین کی پیداوار کا ہمیشہ ایک جہت اور ایک نظم پر قائم و دائم رہنا، یہ بتاتا ہے کہ ان سب کا بنانے والا ایک ہے، کوئی اس کا شریک و ساجھی نہیں، کیونکہ کبھی سیب کے درخت سے انگور پیدا نہیں ہوتا اور نہ کبھی سمندر کے مدوجزر کا نظام بدلتا ہے۔ دن اور رات میں بھی انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف نشانیاں رکھی ہوئی ہیں۔ دن کو روشنی اور رات کو اندھیرے کا باعث بنایا، پھر دن اور رات میں کمی بیشی کا نظام ایک بہت بڑی حکمت پر مبنی ہے جس میں موسموں میں تغیر و تبدل پیدا ہوتا ہے۔

سمندر کے سینہ پر رواں دواں کشتیوں میں بھی نشانیاں رکھی گئی ہیں جو صرف اللہ کی قدرت کاملہ کے باعث پانی پر تیرتی رہتی ہیں اور لوگوں کے ساز و سامان اور مال و متاع کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں۔ بارش میں بھی اللہ تعالیٰ نے بہت سی نشانیاں رکھی ہوئی ہیں کہ کس طرح سورج کی تمازت آفتاب کے بخارات کے ذریعہ پانی کے ڈول بھر بھر کر فضا میں جمع کرتی رہتی ہے اور پھر وہ پانی اس دنیا کی بقا میں یہ کردار ادا کرتا ہے۔ زمین میں روئیدگی پیدا ہوتی ہے جس سے مختلف قسم کی سبزیاں اور پھل پھول

اُگتے ہیں۔ زمین میں مختلف قسم کے جانور پیدا فرمائے۔ کچھ جانور تو انسانوں کی خوراک کے لیے حلال کیے گئے اور کچھ ان کے امتحان کے لیے حرام کر دیے، اور کتنے ہی جانور ہیں جن کو پیدا کرنے کی حکمت ہماری عقل و سمجھ سے بالاتر ہے۔ پھر ہواؤں میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی نشانیاں رکھی ہوئی ہیں۔ بعض ہوائیں بانجھ ہوتی ہیں اور بعض ثمرآور، بعض سرد ہوتی ہیں اور بعض گرم۔ ہوا ہی انسانی سانس کا باعث ہے۔

انسان کو زندہ رہنے کے لیے خوراک، پانی اور ہوا کی ضرورت ہے، وہ اللہ تعالیٰ نے وافر مقدار میں انسانوں کو مہیا کی۔ ہوا تو بغیر کسی محنت اور معاوضہ کے ہر جگہ اس کو میسر ہے۔ بادلوں میں بھی اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے کئی نشانیاں رکھی ہیں کہ کس طرح بادل بنتے ہیں اور کس طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہیں۔ پھر ان میں ہولناک گرج اور چمک پیدا ہوتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نظام کا خالق بھی واحد ہے اس میں کوئی تعدد نہیں، اس کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں۔ انسان کو چاہیے کہ ان تمام مظاہر قدرت میں غور و فکر اور تدبر کرے جو صرف عقل سے ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے اللہ نے انسانی عقل کو بڑی اہمیت دی اور اس کی حفاظت کی تاکید فرمائی۔ انسان کو حریت فکر عطا فرمائی تاکہ ایمان کی شاہراہ کو اختیار کر سکے کیونکہ عقل انسانی ہدایت کے لیے ایک وسیلہ ہے۔ اس سے وہ اپنے رب کی معرفت حاصل کرتا ہے اور دینی نظام عمل سے متعارف ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمام مخدرات اور منشیات کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ یہ عقل انسانی کو ناکارہ اور بے کار کر دیتی ہیں۔ چنانچہ شراب کو حرام قرار دیا گیا کیونکہ وہ بھی انسانی عقل کو ڈھانپ لیتی ہے۔ اسی وجہ سے عربی میں اس کو ''خمر'' کہتے ہیں۔ چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ شراب کو عربی زبان میں ''خمر'' کہتے ہیں۔ خمر لغت میں خامر سے ماخوذ ہے جس کے معنی متغیر ہونے کے ہیں۔ اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ عقل کو بانجھ اور مختل کر دیتی ہے۔ یہ خمر سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ڈھانپ لینے کے ہیں کیونکہ یہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے اور ایک عقل مند اور صاحب دانش شخص بے عقل اور غیر دانش مند ہو جاتا ہے۔

(شراب نوشی کے اور کیا نقصانات ہیں، اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں ہماری کتاب ''اسلام کا نظامِ عدل''۔)

اسلام نے اس کو کیوں حرام قرار دیا اور اس کے پینے پر کیوں حد مقرر کی۔ آج دنیا میں اس کا چلن بہت ہے اور یورپ اور امریکہ وغیرہ میں تو یہ پانی کے بجائے پی جاتی ہے۔ طبی اور اجتماعی لحاظ سے شراب کے نقصانات بہت زیادہ ہیں۔ اس سے عقل میں نقصان پیدا ہوتا ہے، صحت خراب ہوتی ہے، بانجھ پن اور ضعف نسل پیدا ہوتا ہے، شرافت اور مال ضائع ہوتا ہے۔ اسلام نے اس وجہ سے چودہ سو سال قبل شراب کو حرام قرار دیا بلکہ اس کے پینے پر حد جاری کی۔ (مسلم، رقم: ۱۷۰۶، بخاری: ۶۷۷۶)

جب انسان کی عقل ہی جاتی رہے تو پھر وہ ہر قسم کا جرم کر سکتا ہے کیونکہ اب اس میں عقل نام کی کوئی شے موجود نہیں۔ اس وجہ سے وہ بڑے سے بڑا گناہ بھی کر سکتا ہے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی وجہ سے اس کا نام "ام الخبائث" رکھا تھا۔

انسانی عزت وناموس کے تحفظ ودفاع کا حق

جس طرح انسان کی جان ومال اور عقل ودانش قیمتی ہے اسی طرح اس کی عزت وناموس بھی ایک نہایت قیمتی چیز ہے اور اسلام نے اس بات کا پورا پورا حق دیا ہے کہ انسان اس کا تحفظ اور دفاع کرے۔ اور نہ صرف اپنی عزت وناموس کا بلکہ اپنی بیوی، بیٹی، بیٹا اور بہن اور والدین کی عزت وناموس کا تحفظ بھی اس کا ایک بنیادی حق اسلام نے تسلیم کیا ہے۔ کسی شخص کی عزت وناموس کو مجروح کرنے کے جس قدر گناہ اور جرائم ہیں، ان کی شدت کے مطابق اسلام نے ان کی سزا بھی رکھی ہے۔ چنانچہ زنا اور قذف کی حد مقرر فرمائی اور غیبت، چغل خوری، بہتان طرازی، سب وشتم، برے القاب سے کسی کو یاد کرنا یہ سب چیزیں چونکہ انسانی عزت وناموس کو پامال کرتی ہیں لہذا ان کی مختلف سزائیں اور عقوبات اسلام میں رکھی گئیں۔

1- زنا:

زنا کی اسلام نے بہت مذمت کی ہے اور اس کے ارتکاب پر سخت حد مقرر کی ہے۔ زنا کی تعریف علماء نے یہ کی ہے کہ "ایسی زندہ عورت کے ساتھ رحم کی جانب سے مجامعت کرنا جو ملک اور نکاح میں نہ ہو اور نہ اس کے ملک میں اور نکاح میں ہونے کا شبہ ہو۔ اور عورت زانیہ اس وقت شمار ہوگی جب کہ وہ اس حالت میں مرد کو اپنے ساتھ اس فعل کا ارتکاب کرنے دے۔"

(بدائع الصنائع: ۷/۳۳، فتح القدیر لابن ہمام: ۵/۳۰، فتاویٰ عالمگیری: ۲/۱۴۳)

زنا انسانی عزت کو مجروح اور پامال کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے اس لیے ایک اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے شخص کو قرار واقعی سزا دے۔ شریعت اسلامیہ زنا پر اس لحاظ سے سزا دیتی ہے کہ زنا سماجی وجود اور معاشرتی سلامتی پر اثر انداز ہوتا ہے اور یہ کہ خاندانی نظام (Family System) کو نہایت بری طرح مجروح کر دیتا ہے، حالانکہ خاندان ہی وہ بنیاد ہے جس پر ایک معاشرہ استوار ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے شریعت اسلامیہ معاشرے کے مضبوط، پیوست اور ہم آہنگ رہنے کی بہت زیادہ متمنی ہے۔

یورپ اور امریکہ کے قوانین میں اگر باہمی رضامندی سے کوئی زنا کرے تو پھر سزا کا کوئی جواز نہیں بلکہ بے معنی ہے، اس لیے کہ زنا ان کے نزدیک شخصی امور میں سے ہے نہ کہ معاشرتی اور سماجی امور میں سے، اور اس کے اثرات صرف افراد کے تعلقات پر مرتب ہوتے ہیں نہ کہ سماجی اور معاشرتی مفادات پر۔ مغربی معاشرہ میں اس اباحیت کی وجہ سے ایک انتشار رونما ہوا ہے، اس کا تار و پود بکھر چکا ہے، اس کی وحدت پارہ پارہ ہو چکی ہے اور اس کا سماجی مقام ختم ہو کر رہ گیا ہے جس کی صرف اور صرف یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں برائی کی اشاعت اور اخلاقی بگاڑ عام ہو گیا ہے۔ ان کے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا نے اباحیت کا اتنا پراپیگنڈہ کیا کہ قانونی طور پر انہیں زنا کی اجازت عام دینا پڑی اور لوگوں کو شہوت رانیوں کے لیے کھلے عام چھوڑ دیا گیا۔ جگہ جگہ جنسی کلب کھل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کال گرلز کا ایک ہجوم ملک میں پیدا ہو گیا جنہوں نے کلبوں میں جانے کی ضرورت کو گھروں میں پورا کر دیا، اور ایک کال پر وہ گھر پر آ کر گھر کا کلب بنا دیتی ہے۔ زنا کے بارے میں یورپ اور امریکہ میں یہ غلط تصور قائم ہو گیا ہے کہ یہ جرم محض افراد کے بارے میں ہے اور یہ سماج اور معاشرے پر کوئی اثر انداز نہیں ہوتا۔ زنا کی اباحیت نے آج غیر اسلامی ممالک کو اجتماعی اور سیاسی مصائب سے دوچار کر دیا ہے، اور اب یہ وبا رفتہ رفتہ اسلامی ممالک کی طرف بھی آ رہی ہے۔ پاکستان میں موجودہ حکومت حدود آرڈیننس ختم کر کے زنا کو یورپ اور امریکہ کی طرح زنا بالرضاء کو عام کر کے روشن خیال پاکستان بنانا چاہتی ہے۔ یورپ کے اکثر ممالک میں لوگ شادی کی پابندیوں سے آزاد ہو کر عورتوں سے مستفید ہو رہے ہیں اور اب حالت یہ ہے کہ عورت ایک شے مشترک ہو گئی ہے اور

کوئی مرد اس پر اعتماد نہیں کرتا اور نہ ہی اس کی وقعت کا اعتبار کرتا ہے۔ عورتوں کو بھی شادی سے نفرت ہوگئی ہے اور صرف ایک مرد کے ساتھ رہنا انہیں سخت ناپسند ہے، اور متعدد مردوں سے جنسی دوستی کرنا انہیں مرغوب ہے، لہٰذا وہ شادی کے بوجھل بندھنوں میں جکڑے جانا پسند نہیں کرتیں۔ پہلے عورت شادی کے بندھن میں بندھ کر ایک مرد کے سہارے زندگی گزارا کرتی تھی لیکن صنعتی انقلاب کے بعد جب مردوں نے شادی سے پہلو تہی کی تو عورت اپنی زندگی اور اپنی روزی کمانے کی خاطر مردوں کے میدان کارزار میں کود پڑی، اور اس طریقہ سے اختلاط مرد وزن سے اور سماج کی دیواروں کو منہدم کرنے والے طور واطوار سے مغربی اقوام انتشار کی دلدل میں بری طرح پھنس گئیں، اور زنا جیسے اجتماعی جرم میں مبتلا ہوگئیں۔ اسی وجہ سے شریعت نے زنا کو حرام قرار دیا تاکہ اس خطرناک بلکہ ہیبت ناک نتائج سے معاشرہ محفوظ رہ سکے۔ چنانچہ زنا پر سخت سزائیں مقرر کی ہیں جن کا مقصد لوگوں کو اس ذلیل اور قبیح گناہ اور جرم سے بچایا جا سکے اور پاک دامن عورتوں اور خاندان کی عزت وآبرو کو محفوظ کیا جا سکے، لیکن افسوس کا مقام ہے کہ یہ امراض اب مسلم ممالک اور موجودہ دور میں خصوصی طور پر پاکستان میں ''روشن خیال پاکستان'' کے فلسفہ کے تحت بڑی تیزی سے پھیلائے جا رہے ہیں اور زنا بالرضا کو اب قانونی شکل دی جا رہی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ جو ملک اسلام کے نام پر بنا اس میں اسلام کی مٹی پلید کی جا رہی ہے۔ ٹیلی ویژن پر نیم برہنہ عورتوں کا رقص، گانا، اور اپنی نمود ونمائش لوگوں کے سامنے کرنا یہ اسلام نہیں بلکہ الحاد وزندقہ ہے جس میں اس قوم کو رنگنے کی یہودی سازش کو خود مسلمانوں کے ہاتھوں کامیاب بنایا جا رہا ہے۔ اب یہاں بھی مغربی ممالک کی طرح عورتیں بغیر شادی کے مردوں سے رابطہ قائم کر رہی ہیں۔ شادی سے گریز کی وجہ سے آبادی میں کمی، بانجھ پن اور پوشیدہ امراض پھیل رہے ہیں اور عورتوں کی ساری جدوجہد اب مردوں سے برابری کرنے میں صرف ہو رہی ہے۔ اخلاقی معیارات زوال آشنا ہوگئے اور شرم وحیا اب دلوں اور آنکھوں دونوں سے ختم ہو رہی ہے۔ اب اس کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مغرب کے فضول، ناکارہ اور واہیات اصولوں کو چھوڑ کر شریعت کے دامن رحمت میں پناہ لی جائے۔

زنا کی سزا:

سزا کو فقہی اصطلاح میں عقوبت کہتے ہیں اور عقوبت وہ بدلہ ہے جو شارع یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرنے پر اجتماعی مفاد کی خاطر مقرر کیا گیا ہو، اور اس سزا کا مقصد انسانی معاشرے کی اصلاح، انسانوں کو برائیوں اور اللہ کی نافرمانی سے نجات دلانا، جہالت سے بچانا، گمراہی سے نکالنا، معاصی سے روکنا اور اطاعت پر آمادہ کرنا ہے۔

سزائیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت اور احسان کے طور پر جاری کی گئی ہیں۔ لہٰذا سزا دینے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ مجرم کو سزا دینے میں احسان اور رحمت کے نظریہ کو ملحوظ خاطر رکھے جیسے باپ اپنے بچے کی تنبیہ و تادیب کرتا ہے اور طبیب اپنے مریض کا علاج کرتا ہے۔ (اختیارات ابن تیمیہ ص ۱۷۱)

شریعت اسلامیہ نے اپنے نظام عقوبت کی اساس اس مقصد پر رکھی ہے کہ بہر صورت معاشرہ کو جرم سے پاک کرتا ہے اور لوگوں کی عزت و ناموس کی حفاظت اور دفاع کرنا ہے۔ خاندانی تشکیل کے لیے شریعت میں مرد و عورت کا وجود، ان کا نسل کشی کی صلاحیت کا حامل ہونا اور نوزائیدہ نسل کے بڑے ہونے تک نگرانی اور کفالت کا محتاج ہونا، طبعی ہے اور اس بات کے متقاضی ہیں کہ مرد ایک معین عورت کو اپنے لیے مخصوص کر لے اور اس سے پیدا ہونے والی اولاد کو اپنی جانب منسوب کرے۔ مرد اور عورت کا اس طرح زندگی گزارنا خاندانی تشکیل کا داعی ہے اور یہ خاندانی تشکیل ایک معاشرتی زندگی کو تشکیل دیتی ہے جو مخلوق کے لیے اجتماعی نظام کی اساس ہے۔

زنا کا جرم خاندانی نظام پر ایک بہت بڑی دست اندازی ہے۔ اگر اس کی اجازت دے دی جائے جیسا کہ آج کل یورپ اور امریکہ میں اس کی کھلے عام اجازت ہے، اور اس جرم پر کوئی سزا نہ ہو جیسا کہ آج کل پاکستان میں صاحبان اقتدار سوچ رہے ہیں تو ہر شخص کے لیے ممکن ہو جائے گا کہ وہ جس عورت سے چاہے تعلقات قائم کرے اور جس کی اولاد کو چاہے اپنی بنا دے، اور خود اپنی اولاد سے انکار کر دے۔ اس صورت حال

کی انتہاء یہ ہو کہ طاقت ور کمزوروں پر غالب آ جائیں، حسب ونسب ضائع ہو جائیں، باپ اور ماں دونوں ہی بدبختی میں مبتلا ہو جائیں اور بالآخر معاشرہ کے ستونوں میں سے ایک ستون یعنی خاندانی نظام ٹوٹ جائے جیسا کہ مغربی ممالک میں ٹوٹا ہوا ہے اور اب آہستہ آہستہ مغرب کی تقلید میں مشرق اور مسلمان ممالک میں بھی ٹوٹ رہا ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

بچو تقلید مغرب سے سنو اے ایشیا والو
کہ مغرب کی طرف جاتے ہی سورج ڈوب جاتا ہے

حدیث میں زنا کو بڑے گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، جب آپ ﷺ سے یہ دریافت کیا گیا کہ بڑے گناہ کون کون سے ہیں؟ فرمایا:

"خدا کا شریک ٹھہرانا، ہم نے پوچھا پھر کون سا؟ فرمایا اس خوف سے اپنے بچے کو مار دینا کہ وہ تیرے ساتھ کھائے گا۔" ہم نے پوچھا۔ "پھر کون سا؟" فرمایا: "پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا۔"

(بخاری، رقم ۶۸۶۱، مسلم، رقم: ۸۶، ترمذی، رقم ۳۱۸۲، ابوداؤد، رقم: ۲۳۱۰، سنن نسائی، رقم: ۴۰۱۴)

اجماع بھی زنا کے حرام ہونے کی دلیل ہے کہ جو نصوص زنا کے حرام ہونے کے بارے میں آئی ہے۔ مسلمانوں کے سلف وخلف کا اس پر اجماع ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں:

﴿لا اعلم بعد القتل ذنباً اعظم من الزنا﴾ (المغنی: ۳۱۷/۲)
"میں قتل کے بعد زنا سے بڑا اور کوئی گناہ نہیں سمجھتا۔"

زنا کی سزا میں اختلاف:

زنا کی سزا محصن اور غیر محصن کے معاملہ میں مختلف ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

''زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو، اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملہ میں تم کو دامن گیر نہ ہو، اگر تم اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو، اور ان کو سزا دیتے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود ہو۔ (النور:۲)

یہ سزا تو غیر شادی شدہ کی ہے لیکن شادی شدہ (محصن) کی سزا اس سے مختلف ہے۔ اسلام نے کنوارے کی سزا میں تخفیف اور شادی شدہ کی سزا میں شدت برتی ہے یعنی کنوارے کی سزا کوڑے اور شادی شدہ کی سزا رجم ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ماعز رضی اللہ عنہ کو رجم کی سزا دی جب انہوں نے اپنے جرم زنا کا اعتراف کیا۔ رجم کی یہ سزا ان کو اس لیے دی گئی کہ وہ محصن یعنی شادی شدہ تھے۔ سیدنا بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: ''یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجیے۔'' آپ نے فرمایا: ''تم پر افسوس، جا چلا جا اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ کی معافی مانگ اور اللہ کے حضور توبہ کر۔'' وہ چلے گئے اور تھوڑی دور جانے کے بعد پھر واپس آ گئے اور پھر عرض کی: ''یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجیے۔'' رسول اللہ ﷺ نے پھر اسے وہی الفاظ فرمائے۔ وہ پھر چلے گئے اور تھوڑی دور جانے کے بعد پھر واپس آ گئے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجیے۔'' آپ ﷺ نے پھر وہی جواب دیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے چوتھی مرتبہ عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے پاک فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں تجھے کس چیز سے پاک کروں؟'' عرض کی: ''زنا کے گناہ سے'' آپ نے دریافت فرمایا: ''کیا یہ مجنون تو نہیں ہے؟'' آپ کو بتایا گیا کہ نہیں بلکہ یہ ہوش وحواس سے بات کر رہے ہیں۔ ایک شخص نے اٹھ کر ان کے منہ کو سونگھا کہ کہیں شراب تو نہیں پی ہوئی، لیکن انہیں شراب کی کوئی بو نہ آئی۔ آپ نے پھر ماعز رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''تو جانتا ہے کہ زنا کی سزا کیا ہے؟'' انہوں نے عرض کی جی ہاں۔ پس آپ نے اس کو رجم کرنے کا حکم دیا اور انہیں سنگسار کیا گیا۔ بعض روایات میں ہے کہ ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ کے بارے میں لوگوں کے دو قسم کے خیالات ہو گئے۔ بعض کہنے لگے: یہ اپنے گناہوں کی وجہ سے ہلاک ہوا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ماعز رضی اللہ عنہ کی توبہ کیا ہی

توبہ ہے کہ وہ خود بارگاہ نبوت میں حاضر ہوا اور آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کہنے لگا کہ مجھے سنگسار کریں۔ دو تین روز وہ ایسے ہی کہتا رہا۔ پھر ایک روز رسول اللہ ﷺ خود صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک مجلس میں تشریف لائے اور فرمایا: ''ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگو۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ماعز رضی اللہ عنہ کی مغفرت فرمائے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اس کی توبہ اگر ایک پوری بستی پر تقسیم کی جائے تو ساری بستی بخشی جائے۔''

قبیلہ غامدیہ سے ایک عورت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے بھی یہی کہا کہ ''یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجیے۔ آپ ﷺ نے اس سے بھی یہی فرمایا کہ واپس چلی جا اور اللہ تعالیٰ کے حضور استغفار کر اور اپنے گناہوں سے توبہ کر۔ اس عورت نے عرض کی: ''مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مجھے اسی طرح واپس لوٹا رہے ہیں جس طرح آپ نے ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ کو واپس لوٹایا تھا۔ اس نے کہا: ''میں زنا سے حاملہ ہوں۔'' آپ ﷺ نے تعجب سے فرمایا: ''تو!'' اس نے عرض کیا: ''ہاں۔'' آپ نے فرمایا: ''تو واپس چلی جا اور وضع حمل کے بعد آنا۔'' انصار کے ایک شخص نے اس کی کفالت کا ذمہ لیا یہاں تک کہ اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ اس شخص نے بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر عرض کی: ''یا رسول اللہ! اس غامدی عورت کے ہاں بچہ ہوا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہم ابھی اس کو رجم نہیں کریں گے کیونکہ اس کا بچہ ابھی بہت چھوٹا ہے اور اس کی رضاعت کرنے والا بھی نہیں ہے۔ پس انصار میں سے ایک شخص اٹھا اور اس نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میں اس کی رضاعت کا ذمہ لیتا ہوں۔'' چنانچہ آپ نے اس کو سنگسار (رجم) فرمایا۔ (مسلم: ۳/۱۶۹۵)

ان دونوں احادیث سے پتہ چلا کہ شادی شدہ مرد ہو یا عورت دونوں کی سزا رجم ہے۔ اور غیر شادی شدہ کی سزا سو کوڑے ہے۔ (النور: ۲)

زنا کی مذمت اور ممانعت:

زنا کی انہی برائیوں کی وجہ سے اسلام میں اس کی سخت ممانعت اور مذمت کی گئی

ہے بلکہ اسلام نے تو ان تمام ذرائع کو بھی حرمت سے مسدود کر دیا ہے جو آدمی کو زنا کی طرف لے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لاتقربوا الزنا، انه كان فاحشة وساء سبيلا﴾ (اسراء:۳۲)

''زنا کے قریب بھی مت جاؤ، بے شک وہ بے حیائی کا کام ہے اور برا راستہ ہے۔''

حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے قیامت کی نشانیوں میں سے زنا کا عام ہونا بھی بیان کیا ہے چنانچہ آپ نے فرمایا کہ قیامت کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ علم اٹھالیا جائے گا، جہل برقرار رہے گا، شراب عام پی جائے گی اور زنا کا ظہور ہوگا۔

(بخاری، رقم: ۸۰، مسلم، رقم: ۲۶۷۱، ترمذی، رقم: ۲۲۰۵، ابن ماجہ: ۴۰۴۵، مصنف عبدالرزاق، رقم: ۵۰۴۵)

ایک اور حدیث میں یوں فرمایا کہ عنقریب لوگوں پر کچھ سال یوں گزریں گے جن میں ان میں بے حیائی پھیل جائے گی (زنا بھی ایک بے حیائی ہے)

(مستدرک حاکم: ۵۱۲/۴، وقال ہذا حدیث صحیح)

مسلمان ملکوں میں بھی اب زنا کی وبا عام ہوتی جارہی ہے اور مغربی اقوام کے خدانا آشنا معاشرہ کو دیکھ کر وہ بھی اب زنا کو فیشن میں شمار کرنے لگے ہیں۔ موجودہ دور میں کمپیوٹر اور ٹی وی نے بھی اس میں بڑا رول ادا کیا ہے۔ کئی الٹرا ماڈرن گھرانے ایسے ہیں جس میں مرد عورت کے اختلاط کو کوئی برائی نہیں سمجھا جاتا۔ عورتوں کے میک اپ کی وبا دن بدن پھیل رہی ہے۔

بخاری میں ایک اور روایت ہے:

﴿ليكونن في امتي اقوام يستحلون الحر والحرير﴾

(بخاری: ۵۱/۱۰)

''ضرور میری امت میں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو عورت کی شرم گاہ اور ریشمی لباس کو حلال قرار دیں گے۔''

بلکہ آخری زمانے میں تو آپ نے پیش گوئی کے طور پر فرمایا کہ مومنوں کے اس

دنیا سے چلے جانے کے بعد بدترین لوگ دنیا میں رہ جائیں گے، اور وہ گدھوں کی طرح سرعام زنا کریں گے۔ چنانچہ حدیث کے الفاظ ہیں:

﴿ویبقی شرار الناس، یتهارجون فیها تهارج الحمر، فعلیهم تقوم الساعة﴾ (مسلم: ۷۰/۸)

''اور برے لوگ باقی رہ جائیں گے جو گدھوں کی طرح کھلے عام جماع کریں گے اور انہی پر قیامت قائم ہوگی۔''

اور اسی سلسلہ میں ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، یہ امت اس وقت تک فنا نہیں ہوگی جب تک ایک آدمی ایک عورت کو پکڑے گا اور راستہ میں اس کے ساتھ زنا کرے گا، اس وقت ان لوگوں میں سے سب سے نیک آدمی وہ ہوگا جو یہ کہے گا کہ تمہیں راستہ میں یہ کام نہیں کرنا چاہیے تھا بلکہ اس دیوار کے پیچھے یہ کام کرتے۔ (مجمع الزوائد: ۳۳۱/۷، ورجالہ رجال الصحیح)

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جس نے زنا کیا یا شراب پی، اللہ اس سے ایمان کو نکال لیتا ہے جیسے انسان اپنے سر سے قمیص کو اتارتا ہے۔
(مستدرک حاکم: ۲۲/۱، بیہقی فی شعب الایمان، رقم: ۵۳۶۲، الترغیب والترہیب: ۲۵۲/۳)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:
''تم زنا سے بچتے رہو کیونکہ اس میں چار خصلتیں ہیں:

1- اس سے چہرے کی رونق چلی جاتی ہے
2- اس سے رزق منقطع ہو جاتا ہے
3- رحمان یعنی اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے
4- اور جہنم میں خلود یعنی دیر تک رہنا ہوتا ہے۔

(معجم اوسط طبرانی، رقم: ۷۰۹۲، مجمع الزوائد: ۲۵۴/۶)

سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین آدمی جنت میں داخل نہیں ہوں گے، بوڑھا زانی، کذاب صدر مملکت اور متکبر فقیر۔

(مسند البزار، رقم: ۱۳۰۸، مجمع الزوائد: ۲۵۵/۶)

ان احادیث کے علاوہ اور بہت سی احادیث ہیں جن میں زنا کی ممانعت اور مذمت کی گئی ہے۔

قذف:

ایک انسان کی عزت وناموس کو داغدار کرنے کے لیے اس پر تہمت لگانے کو بھی شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ اور جس پر تہمت لگائی جائے اسے حق دیا ہے کہ وہ عدالت میں اس پر مقدمہ دائر کرے۔

قذف کا معنی ہے پتھر پھینکنا۔ چنانچہ عربی میں کہتے ہیں "**قذف بالحجارة**" یعنی اس نے پتھر پھینکا اور "**قذف المحصنة**" کا معنی ہے پاک دامن عورت کو زنا کی تہمت لگانا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ قذف کا معنی ہے گالی دینا۔ اصل میں "قذف" کا معنی ہے پھینکنا۔ پھر یہ لفظ گالی دینے اور زنا کی تہمت میں استعمال ہوا۔ (تاج العروس: ۶/۲۱۷)

قذف کا شرعی معنی ہے کسی محصن (پاک دامن مسلمان مرد ہو یا عورت) کو زنا کی تہمت لگانا جس سے تہمت لگانے والے پر حد واجب ہو جاتی ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ قذف کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قذف پر حد کی سزا ہے اور دوسری قذف پر تعزیر ہے۔ جس قذف میں حد کی سزا ہے وہ وہ ہے جس میں کسی پاک دامن شخص یا عورت کو زنا سے منسوب کیا گیا ہو۔ یا اس کے نسب سے نفی کی گئی ہے۔ اور جس قذف پر تعزیر ہے، وہ قذف وہ ہے جس میں کسی محصن یا غیر محصن کی جانب زنا اور نفی نسب کے کوئی اور بات منسوب کی گئی ہو۔ اس میں سب وشتم اور برا بھلا کہنا بھی شامل ہے۔

قذف کی حد کیوں ضروری ہے؟

قذف کی حد کے واجب ہونے کا سبب زنا کی تہمت ہے۔ چونکہ اس کی نسبت زنا سے ہے اور اس مقذوف (جس پر تہمت لگائی گئی ہو) کے لیے باعث ننگ وعار اور اس کی عزت وناموس پر جارحانہ حملہ ہے لہٰذا مقذوف سے اس ننگ وعار کو دور کرنے اور اس کی پامال شدہ عزت وناموس کو بحال کرنے کے لیے حد واجب کی گئی ہے۔ واللہ اعلم

اسلام لوگوں کی عزت وآبرو اور ان کی شہرت اور شرف کا پاسبان اور نگہبان

ہے، اس لیے اس نے تہمت تراشی کو حرام قرار دیا ہے اور اس کی تحریم کی اصل کتاب و سنت سے ثابت ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت تراشی کرتے ہیں، پھر وہ چار گواہ پیش نہیں کرتے، انہیں اسی (80) کوڑے مارو اور کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو، یہی فاسق لوگ ہیں، ہاں جو لوگ اس کے بعد توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔'' (النور: ۴۔۵)

اس آیت میں اگرچہ آیت میں ''محصنات'' یعنی پاک دامن عورتوں کا لفظ ہے لیکن یہ حکم مردوں کو بھی شامل ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ صرف عورتوں پر زنا کی تہمت لگانے سے حد قذف واجب ہوتی ہے بلکہ مسلمان پاک دامن مرد یا عورت جس کو بھی تہمت لگائی جائے اور ثبوت میں چار گواہ پیش کیے جائیں تو حد قذف واجب ہو جاتی ہے۔
(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بحر الرائق: ۵/۲۹۔۳۰)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تہمت لگانے والے کی سزا کا ذکر کیا ہے جو اس کی تحریم پر دال ہے کیونکہ اسلام میں سزا حرام چیز کے ارتکاب پر ہوتی ہے۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ کے اس قول سے بھی اس کی تحریم ثابت ہوتی ہے:

''جو لوگ پاک دامن، بے خبر مومن عورتوں پر تہمت تراشی کرتے ہیں، وہ دنیا و آخرت میں لعنتی ہیں اور انہیں عذاب عظیم ہوگا۔''
(النور: ۲۳)

حدیث میں بھی قذف کو ''موبقات'' یعنی ہلاک کر دینے والی چیزوں میں شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! وہ کون سی ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، جادو کرنا، کسی شخص کو ناحق قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جنگ کے روز میدان جنگ سے پیٹھ موڑنا اور پاک دامن مسلمان بے خبر (غافل) عورت کو زنا کی تہمت لگانا۔
(بخاری، رقم: ۲۷۶۶، مسلم، رقم: ۸۹، نسائی، رقم: ۳۶۷۱، ابوداود، رقم: ۲۸۷۴، سنن کبریٰ بیہقی: ۸/۲۴۹)

قذف کی سزا:

قذف کے جرم کی دو سزائیں ہیں۔ ایک اصلی یعنی 80 کوڑے ہے۔ اس میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی، اور عدالت اس سزا کو معاف کرنے کی بھی حق دار نہیں ہے، البتہ بعض فقہاء کی رائے کے مطابق مقذوف معاف کرسکتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک معافی درست نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں بھی قذف اپنے مزاج اور جرم کے اعتبار سے معاشرے کا حق ہے جس کو انگریزی میں Public Right کہتے ہیں۔ اجتماعی نظام کا یہ فرض ہے کہ وہ مجرمین کا تعاقب کرے اور جرائم پر سزا دے کر معاشرے کو شر و فساد سے پاک کرے۔ معاشرہ میں کسی پر بدکاری کا الزام لگانا دراصل لوگوں کی عزت و آبرو پر حملہ کرنا ہے جسے شارع محفوظ رکھنا ضروری سمجھتا ہے، اس لیے لوگوں کی عزت و آبرو پر حملہ کرنا دراصل معاشرہ کی حق تلفی متصور ہوگا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معافی کا یہ اثر نہیں ہوسکتا کہ قاذف پر سے حد ساقط ہو جائے۔

دوسری سزا جو قاذف کو ملتی ہے وہ یہ ہے کہ قاذف کی شہادت بھی ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ فرمان الٰہی ہے:

﴿ولا تقبلوا لهم شهادة ابداً﴾ (النور: ۴)

"اور کبھی ان کی شہادت قبول نہ ہوگی۔"

توبہ کی صورت میں سقوط شہادت میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک باوجود توبہ کے قاذف کی شہادت ساقط رہے گی جب کہ دوسرے ائمہ کے نزدیک توبہ کے بعد قاذف کی شہادت قابل قبول ہوگی۔

قوم لوط کے عمل کی تہمت تراشی:

اگر کوئی شخص دوسرے پر یہ تہمت لگائے کہ وہ قوم لوط کا سا عمل کرتا ہے خواہ فاعل ہو یا مفعول، تو فقہاء نے ایسے تہمت تراش کے بارے میں حد کے اجراء میں اختلاف کیا ہے۔ اس بارے میں امام ابو حنیفہؒ اور ان کے ہم نوا ائمہ کا قول ہے کہ اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی کیونکہ ان کے ہاں لواطت زنا میں شامل نہیں بلکہ اس پر تعزیر ہوگی،

لیکن دوسرے ائمہ کے نزدیک حد لگائی جائے گی کیونکہ ان کے ہاں لونڈی پر حد ہے۔

سب وشتم:

شریعت میں قذف اس کو کہتے ہیں کہ کوئی دوسرے کی طرف زنا کی نسبت کرے۔ نیز یہ کہ حد قذف کا اجراء چند شرائط پر موقوف ہے (جن کا تذکرہ ہم نے اپنی کتاب ''اسلام کا نظام عدل'' میں کیا ہے) لیکن بعض صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ مجرم جن جرائم کا ارتکاب کرتا ہے وہ حد قذف کے جرائم کی نوعیت کے نہیں رکھتے۔ چنانچہ مجرم مخاطب کو جو بات کہتا ہے وہ نہ تو قذف ہوتی ہے اور نہ وہ قذف سے ملتی جلتی ہے بلکہ وہ باتیں مخاطب کے لیے باعث اذیت ہوتی ہیں جیسے اگر کوئی شخص دوسرے کو کہے: ''اے یہودی! یا اے یہودی کے بچے! یا اے زندیق! یا اے کافر! اور ان جیسی تمام صورتوں میں مجرم نے ایک مسلمان کو اذیت دی ہے، اور اس نے ناجائز طور پر اسے کفر کی جانب منسوب کیا ہے۔ ان امور کے بارے میں چونکہ شارع سے کوئی متعین سزا نہیں ہے لہٰذا مجرم تعزیری سزا کا مستوجب ہوگا۔

(ملاحظہ ہو شرح الکنز للعینی: ۲۳۵/۱، فتح القدیر: ۲۱۱/۴، الاحکام السلطانیہ: ص ۲۱۸)

اگر ایک شخص دوسرے سے کہے اے فاسق! یا اے فاسق کے بچے! یا کہے اے خبیث کے بچے! تو ان سب صورتوں میں اگر شخص متضرر ان باتوں سے بری اور پاک ہے جن کی نسبت اس کی طرف کی گئی ہے تو چونکہ ان باتوں سے اس کی عزت وآبرو مجروح ہوئی ہے اور اسے اذیت پہنچی ہے جو کہ ایک ایسی معصیت ہے جس میں کوئی متعین سزا نہیں لہٰذا مجرم تعزیری سزا کا مستحق ہوگا۔

(شرح الکنز عینی: ۲۳۴/۱، فتح القدیر: ۲۱۳/۴، فتاویٰ عالم گیری ۱۵۵/۲، الجوہرۃ النیرۃ: ۲۵۲/۲، تبیین الحقائق: ۲۰۸/۳)

اگر مجرم کے کہے ہوئے الفاظ ایسی صفات پر دلالت کرتے ہوں جو مخاطب میں فی الواقع موجود ہوں تو مجرم پر کوئی تعزیری سزا نہ ہوگی، کیونکہ ان الفاظ سے تعزیری سزا اس لیے دی جاتی ہے کہ مجرم کے الفاظ کی وجہ سے مخاطب کو ایذا پہنچتی ہے اور اس کی

حیثیت عرفی کا ازالہ ہوتا ہے، لیکن اگر متضرر میں وہ صفات پہلے سے موجود ہوں تو اس نے مجرم سے بھی پہلے خود اپنی عزت وآبرو کو بٹہ لگایا اور اپنے آپ کو ذلیل وخوار کیا، لہٰذا ایسی بات کہنے والے پر کوئی مواخذہ نہیں۔ (الجوہرۃ النیرۃ:۲/۲۵۳)

مختصر یہ کہ ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص بھی کسی دوسرے کو سب وشتم کرے خواہ اس کی نوعیت جیسی بھی ہو تو اسے تعزیری سزا دی جائے گی کیونکہ اس نے نے معصیت کا ارتکاب کیا ہے۔ اور اس کا یہ فعل مخاطب کے لیے باعث اذیت ہوا۔ یہاں یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ قائل نے جس فعل کی نسبت دوسرے کی طرف کی اس کو موجب عار اور توہین آمیز ہونے اور اس کے اذیت ناک ہونے کا فیصلہ عرف اور عادت کے مطابق کیا جائے گا یعنی اگر مجرم نے جس فعل کی نسبت مخاطب کی طرف کی وہ عرف اور عادت میں موجب ننگ وعار نہیں ہے یا اس سے مخاطب کو اذیت نہیں پہنچی تو اس صورت میں مجرم کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ اس وقت اس کا یہ فعل سرے سے جرم ہی نہیں رہتا۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ مختلف زبانوں، زمانوں اور مختلف علاقوں میں عرف اور عادت میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

حدیث میں بھی سب وشتم کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿سباب المؤمن فسوق وقتاله كفر﴾ (بخاری، رقم:۶۰۴۴، مسلم:۶۴)

''مومن کو گالی دینا فسق ہے اور اس کا قتل کرنا کفر۔''

ایک مسلمان غیظ وغضب کی حالت میں بھی اپنے آپ پر کنٹرول کرتا ہے اور زبان کو اپنے قابو میں رکھتا ہے کہ کہیں کوئی کلمہ زبان سے نہ نکل جائے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو۔ وہ ہر قسم کی گالی گلوچ، سب وشتم، ناپسندیدہ اور فحش کلمات سے اجتناب کرتا ہے اور اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا پورے اخلاص اور صدق دل کے ساتھ التزام کرتا ہے۔ اس میں دوسروں کو لعن طعن کرنا بھی شامل ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

﴿ليس المؤمن بالطعان، ولا اللعان، ولا الفاحش ولا البذي﴾ (الادب المفرد:۳۱۲)

"طعن کرنے والا، لعنت کرنے والا، فحش بکنے والا اور بدزبانی کرنے والا مومن نہیں ہو سکتا۔"

ایک اور روایت میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿ان الله لایحب کل فاحش متفحش﴾

(مسند احمد: ۲۰۲/۵، ابوداؤد، رقم: ۴۷۹۲)

"بے شک اللہ تعالیٰ بدزبان اور بدگوئی کرنے والے کو پسند نہیں فرماتے۔"

ترمذی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

﴿ان الله تعالیٰ لیبغض الفاحش البذئ﴾ (ترمذی، رقم: ۲۰۰۲)

"بے شک اللہ تعالیٰ فحش بکنے والے اور بدزبانی کرنے والے کو پسند نہیں فرماتے۔"

یہ تمام الفاظ گرم مزاج لوگوں کے منہ سے نکلتے ہیں اور ایمان کی کمزوری کے باعث وہ لعن طعن اور گالی گلوچ پر اتر آتے ہیں۔ مومن تو ایمان کے ٹھنڈے جھونکوں سے متمتع ہوتا ہے اور اس کے منہ سے نرم و نازک اور شستہ و مہذب الفاظ نکلتے ہیں جو دوسرے مسلمان کی عزت میں اضافہ کرتے ہیں نہ کہ اس کی عزت و آبرو کو مجروح کرتے ہیں۔ ایک مومن کے سامنے تو ہر وقت اسوۂ رسول اللہ ﷺ رہتا ہے، اور سرکار دو عالم ﷺ نے اپنی ساری زندگی کبھی کسی کو ایسے الفاظ نہیں کہے جو اس کو ناگوار گزریں یا اس کے احساسات و جذبات مجروح ہوں یا اس کی عزت و ناموس پر دھبہ ہوں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص نے شراب پی۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لایا گیا۔ جتنے صحابہ وہاں موجود تھے ان میں سے اکثر نے اس کی اس نازیبا حرکت کے باعث سے اس کو مارنا شروع کر دیا۔ کسی نے اس کی واپسی پر کہا: "اللہ تجھے رسوا کرے۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿لاتقولوا هذا ولا یعینوا علیه الشیطان﴾ (بخاری، رقم: ۶۷۷۷)

"ایسا نہ کہو اور اس کے مقابلہ میں شیطان کی مدد نہ کرو۔"

خود رسول اللہ ﷺ کے بارے میں آپ کے خادم خاص سیدنا انس رضی اللہ عنہ

فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نہ فحش بات کرتے تھے، نہ لعن طعن کرتے تھے اور نہ گالی گلوچ کرتے تھے۔ اگر کسی کو عتاب یا سرزنش کرنا ہوتی تو فرماتے: ''اسے کیا ہو گیا؟'' یا فرماتے: ''اس کی ناک خاک آلود ہو۔'' (بخاری، رقم ۲۰۱۴)

لوگوں کی عزت و آبرو پر دست درازی کرنے والے یا زبان طعن دراز کرنے والے کے بارے میں آپ نے ایک حدیث میں ان کے بھیانک اور ہولناک انجام کی ایسی منظر کشی کی جس نے لوگوں کے دلوں سے برائی، حسد، کینہ اور سب و شتم کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکا۔ آپ نے ایک روز صحابہ کرام ؓ سے پوچھا: ''تمہیں پتہ ہے کہ مفلس کون ہے؟'' صحابہ کرام ؓ نے عرض کی: ''ہم تو اس شخص کو مفلس کہتے ہیں جس کے پاس درہم و دینار اور مال و متاع نہ ہو۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ مفلس نہیں بلکہ مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ کے ساتھ آئے گا۔ (ایک روایت میں ہے کہ پہاڑوں جتنی نیکیاں لے کر آئے گا) مگر اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر بہتان لگایا ہوگا، کسی کا مال ہڑپ کیا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا پیٹا ہوگا۔'' چنانچہ اس نے جن جن لوگوں کے حقوق کی حق تلفی کی ہوگی، انہیں اس کی نیکیاں دے دی جائیں گی لیکن حقوق پھر بھی ختم نہیں ہوں گے۔ پھر ان کے گناہ اس پر لاد دیئے جائیں گے اور اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ گویا وہ پہاڑوں جتنی نیکیاں اس کے کسی کام نہ آئیں گی بلکہ دوسروں کے کام آئیں گی۔ (مسلم، ۲۵۸۱)

اس طریقے سے رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے دلوں سے فحش گالیاں، بے بنیاد الزامات، ناپسندیدہ اور گھٹیا زیادتیاں ختم کر دیں اور لوگوں کے دل دوسرے مسلمانوں کے لیے بالکل صاف ہو گئے اور ان کی زبانیں نرم اور گفتگو شائستہ ہو گئی۔ کیونکہ ایک اسلامی معاشرہ میں ہر شخص کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ جو لفظ بھی وہ اپنے منہ سے نکال رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہو رہا ہے اور قیامت کے روز اس کے بارے میں پرسش اور مواخذہ ہوگا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

﴿المستبان ما قالا فعلى البادی ما لم یعتد المظلوم﴾

(مسلم، رقم ۲۵۸۷)

''دو شخص آپس میں ایک دوسرے کو گالی دیتے ہیں تو دونوں کا گناہ ابتداء کرنے والے پر ہے یہاں تک کہ مظلوم زیادتی کرنے لگے یعنی بدلہ کی حد سے تجاوز کر جائے۔''

زندہ لوگوں کی عزت وآبرو پر زبان سے حملہ کرنا تو بہت بڑی بات ہے اسلام نے تو مردوں اور اموات کے بارے میں بھی زبان کو روکنے کا حکم فرمایا۔ اگر کوئی دنیا میں برا تھا تو مرنے کے بعد اس کی برائیوں اور گناہوں کی تشہیر نہ کرتے پھرو، بلکہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لاتسبوا الاموات، فانهم قد افضوا الیٰ ما قدموا﴾

(بخاری، رقم ۱۳۹۳)

''یعنی مردوں کو برا بھلا نہ کہو کیونکہ انہوں نے جو اعمال بھی اس دنیا میں کیے ان کا بدلہ پا لیا ہے۔''

غیبت:

ایک اور گناہ جو اس وقت معاشرہ میں وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے وہ غیبت ہے۔ غیبت بھی ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے دوسرے لوگوں کی عزت وناموس پامال کی جاتی ہے۔ اسلام ہر حال میں دوسروں کی عزت اور آبرو کی حفاظت کرنا چاہتا ہے تاکہ معاشرہ کے باہمی تعلقات خوشگوار اور پاکیزہ رہیں، ہر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا ہمدرد اور خیر خواہ ہو نہ کہ دشمن اور بدخواہ، لہٰذا اسلام نے ہر اس کام کو حرام اور ناجائز قرار دیا جس سے دوسروں کی عزت وآبرو پر حرف آتا ہو اور ان کے باہمی تعلقات میں ناخوش گواری اور کھنچاؤ پیدا ہو۔ چنانچہ شریعت اسلامیہ نے چغل خوری، بدگوئی، بہتان طرازی، دغابازی، فحش گوئی، کذب بیانی، جھوٹی قسمیں کھانا، کسی کو برے القاب سے یاد کرنا، کسی کے عیوب کی ٹوہ لگانا، لعن طعن کرنا، کسی سے مذاق کرنا، کسی کے بارے میں غلط گمان کرنا، حسد کرنا، آپس میں بغض رکھنا، گالی گلوچ کرنا اور کسی کی آبرو کو مجروح کرنے کے لیے استہزاء کرنا وغیرہ کو حرام قرار دیا۔ غیبت سے بھی چونکہ دوسروں کی ساکھ اور عزت مجروح

ہوتی ہے اور باہمی تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوتی ہے، اس لیے شریعت نے اس کو بھی حرام اور ناجائز قرار دیا اور مسلمانوں کو سخت تاکید کی کہ وہ کسی کی غیبت نہ کریں۔ چنانچہ سورہ حجرات میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

''اے ایمان والو! مرد مردوں پر ٹھٹھا اور تمسخر نہ کریں کیونکہ شاید وہ بہتر ہوں ان (تمسخر اور ٹھٹھا کرنے والوں) سے، اور نہ ہی عورتیں دوسری عورتوں پر ٹھٹھا کریں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عیب لگاؤ ایک دوسرے کو، اور نہ ہی ایک دوسرے کو چڑانے کے لیے نام ڈالو کیونکہ ایمان کے بعد برا نام گنہگار ہے، اور جو توبہ نہ کریں تو وہ لوگ ظالم ہیں۔ اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو، بے شک بعض گمان گناہ ہیں اور (کسی کے عیبوں کی) جستجو نہ کرو اور ایک دوسرے کی غیبت (بھی) نہ کرو۔ کیا تم میں سے کسی کو یہ پسند ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ پس تم کو گھن آتی ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا مہربان ہے۔'' (حجرات:۱۱-۱۲)

ان آیات میں زبان کی دوسری برائیوں کے ساتھ غیبت کی برائی کو بھی بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ برائی دوسری تمام برائیوں سے بڑھ کر ہے کیونکہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ اور ایک انسان تو مردہ جانور کا گوشت کھانے سے بھی سخت نفرت کرتا ہے چہ جائیکہ وہ اپنے بھائی کے گوشت کو کھائے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی ان دونوں آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''اختلاف وتفریق باہمی کے بڑھانے میں ان امور کو خصوصیت حاصل ہے۔ ایک فریق دوسرے فریق سے ایسا بدگمان ہو جاتا ہے کہ حسن قبول کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا۔ مخالف کی کوئی بات ہو اس کا محمل اپنے خلاف نکلتا ہے۔ اس کی بات میں ہزار احتمال بھلائی کے ہوں اور صرف ایک پہلو برائی کا نکلتا ہو، پھر بھی اس کی طبیعت برے پہلو کی طرف چلے گی اور اسی برے اور کمزور پہلو کو قطعی اور یقینی قرار دے کر فریق مخالف پر تہمتیں اور الزام لگانا شروع کر دے گا۔ پھر نہ صرف یہ کہ ایک بات حسب اتفاق پہنچ گئی، بدگمانی سے اس کو

غلط معنی پہنا دیے گئے، نہیں، اس جستجو میں رہتا ہے کہ دوسری طرف کے اندرونی بھید معلوم ہوں جس پر خوب حاشیے چڑھائیں اور اس کی غیبت سے اپنی مجلس گرم کریں۔ ان تمام خرافات سے قرآن حکیم منع کرتا ہے۔ اگر مسلمان اس پر عمل کریں تو جو اختلافات بدقسمتی سے پیش آجاتے ہیں وہ اپنی حد سے آگے نہ بڑھیں اور ان کا ضرر محدود ہو جائے بلکہ چند روز میں نفسانی اختلافات کا نام ونشان باقی نہ رہے۔

''مسلمان بھائی کی غیبت کرنا ایسا گندہ اور گھناؤنا کام ہے جیسے کوئی اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچ نوچ کر کھائے۔ کیا اس کو کوئی انسان پسند کرے گا؟ بس سمجھ لو کہ غیبت اس سے بھی زیادہ شنیع حرکت ہے۔'' (فوائد عثمانی: ص ۶۸۶)

انسانی گوشت کو صرف اس کی عزت وحرمت کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے، اس لیے ہر وہ شے جو انسان کی عزت وحرمت کو مجروح کرتی ہے وہ بھی حرام ہے۔ غیبت سے چونکہ دوسرے انسان کی عزت وحرمت کو نقصان پہنچتا ہے اور دوسرے لوگوں کی نگاہوں سے وہ گر جاتا ہے اور لوگ اسے ذلیل وخوار سمجھنے لگتے ہیں، اس لیے اس کو مردہ بھائی کے گوشت کی طرح حرام قرار دیا گیا۔

بھائی سے چونکہ بہت محبت ہوتی ہے لہٰذا شدت محبت کی وجہ سے بہت سے لوگوں میں بھائی کی لاش کو دیکھنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی، اس لیے جو شخص مردہ بھائی کا گوشت نوچ کر کھاتا ہے اس سے بڑھ کر شقی القلب اور سنگ دل اور کون ہو سکتا ہے؟ جو اس محبت، لطف اور بھائی چارے کے منافی ہے جو اسلام ایک مسلم معاشرے میں انسانوں کے درمیان پیدا کرنا چاہتا ہے، لہٰذا غیبت کو مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دے کر اس کی نفرت دلوں میں قائم کی گئی۔

غیبت ہے کیا؟ علامہ ابن اثیر جزری نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

''غیبت یہ ہے کہ انسان کی پیٹھ پیچھے اس کی برائی کا ذکر کیا جائے بشرطیکہ وہ برائی اس میں موجود ہو۔ اور اگر تم اس برائی کا ذکر کرو جو اس میں موجود نہیں ہے تو یہ بہتان ہوگا۔'' (نہایہ لابن اثیر: ۳/۹۹۳)

اور علامہ راغب فرماتے ہیں کہ "غیبت یہ ہے کہ ایک شخص بلا ضرورت دوسرے شخص کا وہ عیب بیان کرے جو اس میں موجود ہو۔" (المفردات: ص ۳۶۷)

اسی چیز کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں یوں بیان فرمایا: کہ "کیا تم جانتے ہو غیبت کیا ہے؟" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: "غیبت یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے اس عیب کا ذکر کرو جس کا ذکر اسے ناپسند ہو" کہا گیا: "یہ فرمایئے کہ اگر میرے بھائی میں وہ عیب ہو جس کا میں ذکر کروں؟" فرمایا: "اگر تم وہ عیب بیان کرو جو اس میں ہے تبھی تو تم نے اس کی غیبت کی، اور اگر تم نے وہ عیب بیان کیا جو اس میں نہیں ہے تو پھر تم نے اس پر بہتان لگایا۔"

(مسلم، رقم: ۲۵۸۹، ابوداؤد، رقم ۴۸۷۴)

(غیبت کی تفصیل و تشریح کے لیے ملاحظہ ہو ہماری کتاب "غیبت... ایک گھناؤنا گناہ")

غیبت کے علاوہ اسلام نے تجسس، تحسس اور تنافس اور حسد و بغض کو بھی حرام قرار دیا۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

﴿ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث، ولا تجسسوا ولا تحسسوا، ولا تنافسوا، ولا تحاسدوا، ولا تباغضوا ولا تدابروا، وکونوا عباد اللہ اخوانا﴾

(مسلم: ۱۵۲۳، کتاب البر)

"ایک دوسرے کی جاسوسی نہ کرو اور نہ حسوسی کرو (جاسوسی دوسرے کے لیے ٹوہ لگانا اور حسوسی خود اپنے ٹوہ لگانا) اور نہ خرید و فروخت میں بولی بڑھا کر ایک دوسرے کو دھوکہ دو، نہ ایک دوسرے پر حسد کرو، اور نہ ایک دوسرے سے بغض رکھو اور نہ ایک دوسرے سے پیٹھ پھیرو یعنی اعراض اور بے رخی نہ کرو، اور اے اللہ کے بندو! تم بھائی بھائی بن جاؤ۔"

اور لوگوں کے عیوب تلاش کرتے رہنا تاکہ ان کی تشہیر کر کے لوگوں کی عزت و ناموس کو بٹہ لگایا جائے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿ولا تقف ما لیس لک به علم، ان السمع والبصر والفؤاد، کل اولئک کان عنه مسئولا﴾ (بنی اسرائیل:۳۶)

''اور جس چیز کا تمہیں علم نہیں اس کے درپے نہ ہو، بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب سے متعلق (روز قیامت) سوال کیا جائے گا۔''

قفا کا معنی سر کا پچھلا حصہ یعنی گدی ہے، اور اس کا مطلب کسی کے پیچھے چلنا اور اس کی پیروی کرنا۔

مطلب یہ ہو کہ ظن اور قیافہ کے ساتھ کوئی حکم نہ کرو۔ (المفردات:۲/۵۲۹)

یعنی جس چیز کا تمہیں علم نہیں ہے اس کی پیروی نہ کرو اور محض ظن وتخمین کے پیچھے نہ چلو۔

بعض لوگ بدگمانی میں لوگوں کی باتوں کی تشہیر کرتے رہتے ہیں۔ لوگوں کے عیب کو بیان کر کے ان کی عزت وآبرو کو مجروح کرنا تو بہت بڑی بات ہے، اسلام نے تو اپنے عیوب کو بھی چھپانے کی تاکید کی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''میری امت کے علی الاعلان گناہ کرنے والوں کے سوا ہر شخص کو بخش دیا جائے گا، اور علی الاعلان گناہ کرنے میں اس کا بھی شمار ہے کہ ایک شخص رات کو کوئی گناہ کرے اور صبح اس حال میں کرے کہ اللہ نے اس کا پردہ رکھا ہوا تھا اور وہ کسی سے یہ کہے: ''اے فلاں میں نے گذشتہ رات یہ کام کیا تھا، حالانکہ اس کے رب نے اس پر پردہ ڈال دیا تھا اور اس نے صبح ہوتے ہی اللہ کے رکھے ہوئے پردہ کو چاک کر دیا۔

(بخاری، باب ستر المومن علی نفسه:۶۰۶۹، مسلم، رقم:۷۶۵۳، مجمع الزوائد:۱۰/۱۹۲)

سیدنا علقمہ مزنی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ بندے کے جس گناہ پر دنیا میں پردہ رکھتا ہے، اس پر آخرت میں بھی پردہ رکھتا ہے۔'' (مجمع الزوائد:۱۰/۱۹۲)

ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ آپ نے رسول اللہ ﷺ سے نجویٰ (سرگوشی) کے بارے میں کیا سنا ہے؟ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم میں سے کسی ایک سے اس کا رب فرمائے گا: ''تم نے یہ یہ کام کیا تھا؟'' وہ کہے گا ''ہاں۔'' پھر فرمائے گا: ''تم نے یہ یہ کام کیا تھا؟'' وہ کہے گا: ''ہاں۔'' اللہ تعالیٰ اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرائے گا۔ پھر فرمائے گا: ''میں نے دنیا میں تمہارا پردہ رکھا تھا اور آج میں تمہیں بخش دیتا ہوں۔'' (انی سترت علیک فی الدنیا وانا اغفرھا لک الیوم) (بخاری ۲/۸۹۶)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿لا یستر عبدٌ عبداً فی الدنیا الا سترہ اللہ یوم القیامۃ﴾

(مسلم، باب بشارۃ من ستر اللہ: ۴۵۹۰)

''جو بندہ دنیا میں دوسرے بندے (کے عیوب) کی پردہ پوشی کرتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔''

چنانچہ ایک مرتبہ سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں کچھ لوگ حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارے کچھ پڑوسی شراب پیتے اور برے کام کرتے ہیں، کیا ہم گورنر تک یہ بات پہنچا دیں؟ انہوں نے فرمایا: نہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے:

''جو شخص کسی مسلمان میں کوئی عیب دیکھے اور اسے افشا نہ کرے تو اس نے گویا ایک لڑکی کو زندہ درگور ہونے سے بچالیا۔'' (الادب المفرد ۷۵۸)

لوگوں کے عیوب و نقائص اور کمزوریوں کی تشہیر کر کے ان کو رسوا کرنا یہ انسانی کمزوری کا علاج نہیں ہے بلکہ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان کو خلوت میں نہایت احسن طریق سے اور نرم گفتگو کر کے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کو ناپسندیدہ ظاہر کر کے روکا جائے۔ اس طریقہ سے دلوں کے بند دروازے کھلتے ہیں اور اعصاب و جوارح اطاعت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور دل نرمی قبول کرتا ہے اور گنہ گار اور بدعمل انسان بھی ہدایت کی شاہراہ پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم نے مسلمانوں کے عیوب کی ٹوہ لگانے سے منع فرمایا:

﴿ولا تجسسوا﴾ (حجرات:۱۲)
''عیوب کی ٹوہ نہ لگاؤ۔''

چنانچہ ایک مرتبہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا اور انہیں بتایا گیا کہ اس کی داڑھی سے شراب ٹپک رہی ہے۔ آپ نے فرمایا:

﴿انا قد نهينا عن التجسس ولكن ان يظهر لنا شئى ناخذ به﴾
(الادب المفرد)

''ہمیں عیوب کی ٹوہ لگانے سے روکا گیا ہے لیکن اگر عیب خود ہمارے سامنے ظاہر ہو جائے تو پھر اس پر ہم گرفت کریں گے۔''

اسلام یہ نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کے عیوب ونقائص کی ٹوہ میں لگنے اور ان کی کمزوری اور کوتاہی کے پہلو تلاش کرنے اور پھر لوگوں میں اس کی تشہیر کر کے ان کو بے آبرو کرنے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ اس سے ان کو اذیت پہنچے گی اور پورا معاشرہ متاثر ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا بے حیائی اور بدکاری اور معصیت عام ہو جائے گی، باہمی بغض ونفرت عام ہوئے گی، کینہ اور حسد کا چلن ہو جائے گا اور آخر میں تمام معاشرہ فتنہ وفساد کی لپیٹ میں آجاتا ہے اور بجائے اچھائی کے برائی کی تشہیر ہوتی ہے۔ ان سب چیزوں کو روکنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿انک ان اتبعت عورات الناس، افسدتهم أو كدت أن تفسدهم﴾ (ابوداود، رقم:۴۸۸۸)

''اگر تو لوگوں کے عیوب کی ٹوہ میں لگے گا تو یا تو ان کو برا کر دو گے یا پھر برائی سے قریب کر دو گے۔''

اور رسول اللہ ﷺ نے بڑی سختی سے فرمایا کہ ''اللہ کے بندوں کو تکلیف نہ پہنچاؤ، انہیں عار نہ دلاؤ اور ان کے عیوب کے پیچھے نہ پڑو۔ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے عیوب کی ٹوہ میں لگے گا، اللہ تعالیٰ اس کے عیب ظاہر کر دے گا اور اسے اس کے گھر میں ذلیل وخوار کر دے گا۔'' (مسند احمد:۵/۲۷۹)

اور طبرانی کی روایت میں ہے کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی عیب جوئی

کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے عیوب کو (لوگوں پر) ظاہر کر دے گا، اور اللہ تعالیٰ جس کے عیوب کی ٹوہ میں لگ جائے اسے ذلیل ورسوا کر کے چھوڑے گا خواہ وہ گھر کے اندر ہی کیوں نہ ہو۔ (طبرانی، معجم کبیر، رقم: ۱۱۴۴۴)

اسلام نے کسی مسلمان کے بارے میں جھوٹ بولنے یا جھوٹی شہادت دینے کو بھی حرام قرار دیا کیونکہ اس سے بھی اس کی عزت و آبرو مجروح ہوتی ہے اور وہ معاشرہ میں بدنام ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کیا میں تمہیں سب سے بڑے گناہوں کی خبر نہ دوں؟" تین مرتبہ آپ نے ان کلمات کو فرمایا۔ ہم نے کہا: کیوں نہیں، یا رسول اللہ! " (ضرور بتلایئے) آپ نے فرمایا: "کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، اور آپ ﷺ ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ پھر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا: "سنو! جھوٹی بات کہنا اور جھوٹی گواہی دینا۔" (یہ بھی بڑے گناہوں میں سے ہیں۔) پھر آپ ﷺ اس بات کو دہراتے رہے یہاں تک کہ ہم نے کہا! کاش آپ خاموش ہو جائیں۔

(بخاری: ۱۰/۳۴۲، ۳۴۵، مسلم، باب الکبائر واکبرہا: ۸۷)

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ ایک انسان کے اصل اور نسب دونوں کی پوری پوری حفاظت ہو کیونکہ اس کا بنیادی حق ہے، اس لیے اسلام نے زنا کو حرام قرار دیا اور اس کی سزا سو کوڑے اور رجم رکھی، لیکن یہ سزا چار گواہوں کی شہادت پر موقوف ہے جو چشم دید گواہ ہوں، اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ گواہ غلط گواہی دے رہے ہیں تو ان کو قذف کی سزا اسی (80) کوڑے مارے جائیں گے، اور اس کی شہادت ہمیشہ کے لیے مجروح ہو جائے گی۔ اسی طرح اسلام نے ایک مومن کی عزت و آبرو کی حفاظت کی ہے اور اس کے لیے غیبت، چغل خوری، تجسس، تحسس، برے القاب سے یاد کرنا، اور اس کے عیوب ونقائص کی ٹوہ لگانا، اس کے متعلق بدگمانی کرنا، حسد کرنا، بغض رکھنا، اعراض برتنا، اس کی بیع پر بیع کرنا، سب وشتم کرنا، قتال اور جھگڑا کرنا، کذب بیانی اور بے حیائی اور لغو بات کرنا، لعن طعن کرنا، مذاق اڑانا، ان سب چیزوں کو حرام قرار دیا اور دنیا میں اس کے تعزیر رکھی اور آخرت کی سزا کی بھی بشارت دی۔ یہ سب کچھ ایک مومن کی

عزت و آبرو جو اس کا ایک بنیادی حق تھا، اس کی حفاظت کے لیے کیا، کیونکہ ایک مومن کی عزت و آبرو اس کی فضیلت کا ایک جز ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس تمام کائنات میں اپنے فضل واحسان سے دی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے نسب کی بھی حفاظت فرمائی اور نسب کی حفاظت کا نکاح کو ذریعہ بنایا۔ چنانچہ ایک مسلمان اپنے باپ کے سوا اور کسی کی طرف اپنے ولدیت کو منسوب نہیں کر سکتا یہاں تک کہ ایک عورت بھی اپنے نکاح کے بعد اپنے والد کی طرف ہی اپنے آپ کو منسوب کرے گی۔

مختصر یہ کہ اسلام نے ایک بندۂ مومن کی عزت و آبرو کا پورا تحفظ کیا ہے بلکہ یہاں تک کیا۔

﴿فاٰبذني من اذل عبدي المومن﴾ (حدیث قدسی)

''جو شخص میرے مومن بندے کو ذلیل کرے اس نے گویا مجھ سے جنگ کی۔''

اپنے مال کی حفاظت اور دفاع کا انسانی حق

جس مال کو ایک انسان اپنی سخت محنت کے نتیجے میں کماتا ہے، اسلام نے اس کے اس مال کو پورا پورا تحفظ دیا ہے کیونکہ یہ مال اس کا حق ہے، اور اسلام انسانی حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ چنانچہ جو شخص اس کے مال پر کسی قسم کی زیادتی کرتا ہے اور اس کو چھینتا ہے خواہ چوری، ڈاکے یا کسی اور ذریعہ سے، تو اس کے لیے دنیوی اور اخروی دونوں سزائیں رکھی گئی ہیں۔ ایسے مسلمان کے مال کو دوسروں پر حرام قرار دینے کے لیے آپ نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں لوگوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا تھا: ''اے لوگو! یہ کون سا دن ہے؟'' جواب دیا گیا، یوم حرام یعنی ذی الحجہ کا نواں دن۔ پھر آپ ﷺ نے پوچھا: ''ای بلد ھذا'' یہ کون سا شہر ہے۔ جواب دیا گیا، پھر پوچھا گیا ''فای شہر ھذا'' یہ کون سا مہینہ ہے۔ صحابہ کرام ؓ نے جواب دیا شہر حرام یعنی حرمت والا مہینہ ہے۔ اب حضور ﷺ نے فرمایا:

﴿فان دماء کم واموالکم واعراضکم علیکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا، فی بلدکم ھذا، وفی شھرکم ھذا﴾

''(اے لوگو!) تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح تمہارے آج کے دن کی، اور اس مہینے ذی الحجہ کی اور اس شہر مکہ کی حرمت ہے۔''

بعض روایات میں ہے کہ یہ جملہ آپ نے کئی مرتبہ دہرایا۔

آپ کا یہ سارا خطبہ ہی دنیا میں سب سے پہلے بین الانسانی اور بین الاقوامی

منشور ہے جو آپ نے لوگوں کے سامنے پیش کیا اور اس میں پہلی بار لوگوں کی جانوں، مالوں اور عزتوں کو اسلامی حکومت میں پورا پورا تحفظ دیا گیا۔ انسانی کاوشیں اس سے آگے آج تک نہیں سوچ سکیں۔ اس منشور سے ہٹ کر زندگی کا جو نقشہ بھی بنایا جائے گا، وہ سراسر غیر اسلامی اور غیر انسانی ہوگا۔

اس پورے خطبے کے بعد آپ ﷺ نے اپنا سر مبارک اٹھایا اور فرمایا:
"**اللهم هل بلغت**" اے اللہ! میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا ہے، لہٰذا اے لوگو! جو اس وقت موجود ہو وہ ان لوگوں تک میرا پیغام پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں۔ پھر فرمایا "اے لوگو! میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسری کی گردنیں مارنے لگو۔"

(رواہ البخاری، کتاب المناسک: ۶۳۱/۲، مسلم، باب حجۃ النبی، فتح الباری: ۱۰۳/۸، ۱۱۰، سیرۃ ابن ہشام: ۶۰۱/۲، ۶۰۵، زاد المعاد: ۲۱۸/۱، ۱۲۰، عیون الاثر لابن سید الناس: ۳۵۹/۲ وغیرہ)

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان کا مال لینا خواہ کسی صورت سے لیا گیا ہو، حرام قرار دیا گیا۔ مال لینے کی عام صورتیں چوری، ڈاکہ، فراڈ، رشوت اور دوسرے کئی طریقے ہیں۔ اسلام نے ان سب کو حرام قرار دیا ہے۔

چور کا ہاتھ کاٹنا:

اسلام نے اس شخص کے لیے سخت سزا رکھی ہے جو کسی شخص کے مال پر زیادتی کر کے اس کو چھینتا ہے۔ چنانچہ چوری بھی ایک زیادتی ہے لہٰذا چور کی سزا شریعت نے ہاتھ کاٹنا رکھی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿والسارق والسارقة فاقطعوا ایدیهما، جزاءً بما کسبا، نكالاً من الله، والله عزیز حکیم﴾ (المائدہ: ۳۸)

چوری کے معنی:

چوری کو عربی زبان میں سرقہ (سین پر فتح اور راہ پر کسرہ) کہتے ہیں اور چوری کرنے والے کو سارق یعنی چور۔ اور اہل عرب سارق اس کو کہتے ہیں جو کسی محفوظ جگہ میں چھپ کر جائے اور مال غیر لے کر چلا جائے۔ اگر وہ چھپ کر لینے کے بجائے کھلم کھلا

لے تو وہ اچکا اور لٹیرا (مختلس اور منتہب) ہے، اور اگر زبردستی چھینے تو غاصب ہے۔

(لسان العرب: ۱۰/۱۵۶)

اور فقہائے کرام رحمہم اللہ کے نزدیک چوری کی تعریف یوں ہے کہ:

"کسی عاقل و بالغ کا خفیہ اور پوشیدہ طور پر کسی شبہ کے بغیر کسی دوسرے شخص کا ایسا مال لے لینا جو ہاتھ کاٹنے کے نصاب کے برابر ہو، مال کسی محفوظ جگہ میں ہو، مالیت رکھتا ہو اور جلدی خراب ہو جانے والا نہ ہو۔"

(فتح القدیر ابن ہمام: ۵/۱۲۰)

سرقہ کے لغوی معنی کسی شے کو لے لینے کے ہیں۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ سرقہ اور استراق کسی مال کو محفوظ جگہ سے پوشیدہ طور پر آ کر لے لینے کو کہتے ہیں۔ ابن عرفہ کہتے ہیں کہ سارق عربوں کے نزدیک اس شخص کو کہتے ہیں جو پوشیدہ طور پر محفوظ چیزوں کے پاس آئے اور ان چیزوں کو اٹھا لے جائے جو اس کی ملکیت میں نہیں ہیں۔

(قاموس: ۲/۲۸۷)

اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ چوری کی اہم شرائط حسب ذیل ہیں:

1- چور عاقل اور بالغ ہو

2- چوری شدہ چیز مالیت رکھتی ہو یعنی مال محترم اور متقوم ہو

3- اس کی قیمت نصاب قطع ید تک پہنچتی ہو

4- اور وہ محفوظ مقام پر ہو۔

چور کا ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے:

جمہور فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ آیت میں چوری کی سزا کے طور پر جس ہاتھ کو کاٹنے کا حکم ہے اس سے مراد دائیں ہاتھ کو کلائی سے کاٹنا ہے۔ اس کی دلیل قرآن حکیم کی اوپر والی آیت ہے اور اس کی تائید سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت "**فاقطعوا ایمانھما**" یعنی اس کا داہنا ہاتھ کاٹ دو والی روایت ہے۔ (سنن کبریٰ بیہقی: ۸/۲۷۰)

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان دونوں حضرات نے فرمایا:

﴿اذا سرق السارق فاقطعوا یمینه من الکوع﴾

(المغنی: ۱۰/۲۶۴)

اس لیے کہ وہ اکثر اوقات اسی سے پکڑا جاتا ہے۔ ابتداء میں اس کے قطع کرنے سے چور کو چوری سے روکنا مدنظر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہی چوری کرنے کا آلہ ہوتا ہے۔ پس مناسب سمجھا گیا کہ اس کی سزا اس آلے کو ختم کرنا ہو۔ قاضی عیاضؒ نے اس پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے۔

چور کا ہاتھ کاٹنے میں حکمت:

علماء نے لکھا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے چور کا ہاتھ کاٹنے کی حد مقرر فرما کر مسلمانوں کے اموال کو محفوظ کر دیا، اور اگر کوئی شخص اچک کر کوئی چیز لے جائے یا لوٹ کر لے جائے یا غصبکرے تو اس پر حد مقرر نہیں (لیکن یہ بھی نہیں کہ اس کو چھوڑ دیا جائے بلکہ اس پر تعزیر ہے) کیونکہ یہ جرائم چوری کی بہ نسبت معمولی ہیں اور ان کے خلاف گواہ قائم کیے جا سکتے ہیں اور گواہوں کے ذریعہ عدالت آسانی سے اپنا حق وصول کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس چور چھپ کر مال لے جاتا ہے لہذا اس پر گواہی قائم کرنا مشکل ہے اس لیے اس کی سزا سخت رکھی تاکہ اس کی سزا دیکھ کر دوسرے لوگ عبرت حاصل کریں اور چوری کرنے سے باز رہیں اور اس طرح مسلمانوں کے مال محفوظ رہ سکیں۔

بعض علماء نے چوری کی سزا یعنی ہاتھ کاٹنا کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ چور جب چوری کا ارادہ کرتا ہے تو دراصل اپنی کمائی میں دوسرے کی کمائی سے اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی جائز کمائی کو کم اور قلیل سمجھ کر اس میں دوسرے کی کمائی ناجائز طور پر حاصل کر کے اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے نتیجۂ عمل پر قانع نہ رہ کر دوسرے کے نتیجۂ عمل پر اپنی نظریں جماتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتا ہے کہ زیادہ خرچ کر سکے۔ محنت وعمل سے بچ سکے اور اپنا مالی خرچ کر کے اپنے کو زیادہ نمایاں کر سکے، گویا چوری کا اصل محرک زیادہ کمانا اور زیادہ دولت حاصل کرنا ہے۔ شریعت نے اس جذبہ کا مقابلہ قطع ید کی سزا مقرر کر کے کیا

ہے کیونکہ قطع ید اور رجل یعنی ہاتھ پاؤں کاٹنے سے کمائی میں کمی واقع ہوگی اور اس کے ہاتھ پاؤں جو کمانے کے ذریعہ ہیں ختم ہو جائیں گے۔ گویا شریعت نے سزائے قطع ید مقرر کر کے جرم کے داخلی نفسیاتی عوامل کو ان نفسیاتی عوامل سے ختم کر دیا ہے جو حرام سے باز رکھنے والے ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہماری کتاب ''اسلام کا نظام عدل'')

چوری کا نصاب:

اسلام نے چوری کا ایک نصاب رکھا ہوا ہے کہ کتنے مال کی چوری پر ہاتھ کاٹا جائے گا، چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ڈھال کی قیمت کے سوا میں ہاتھ نہ کاٹا جائے، اور ان دنوں اس کی قیمت 10 درہم کے برابر تھی، اور اس میں یہ دلیل ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹنے کے لیے سرقہ میں نصاب معتبر ہے۔ اور سرقہ کی حد کا نصاب دس درہم یا ایک دینار ہے۔ چنانچہ ایمن بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے صرف ڈھال کی قیمت میں ہاتھ کاٹا ہے۔ اور اس وقت ڈھال کی قیمت ایک دینار تھی۔ امام نسائی نے اس حدیث کو چھ مختلف سندوں سے ذکر کیا ہے۔

(نسائی: ۸/ ۴۹۵۸، ۴۹۵۹، ۴۹۶۰، ۴۹۶۱، ۴۹۶۲، ۴۹۶۳)

عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دس درہم سے کم میں ہاتھ کاٹنا نہیں ہے۔''

(مسند احمد، رقم: ۶۹۰۰، سنن دارقطنی، رقم: ۳۳۹۳، مجمع الزوائد: ۶/ ۲۷۳)

اسلام میں چوری کی یہ حد مقرر ہونے سے چوری کا جرم قریباً ختم ہو گیا اور لوگوں کے اموال کی اس طریقہ سے حفاظت ہو گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے چوری کی حد قائم کرنے میں کبھی بھی سستی اور تہاون سے کام نہیں لیا اور جس شخص نے اس معاملہ میں ذرا بھی آپ سے سفارش کی اس کو آپ ﷺ نے ڈانٹ کر رکھ دیا۔ چنانچہ بنو مخزوم کی ایک عورت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے چوری کی اور رسول اللہ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم فرمایا۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی معرفت بارگاہ نبوت میں سفارش کرائی کہ اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ کی سفارش قبول

کرنے سے یک قلم انکار کر دیا حالانکہ آپ ﷺ اسامہ رضی اللہ عنہ کو بہت پیار کرتے تھے۔ آپ نے اسامہ رضی اللہ عنہ کے منہ سے سفارش کے الفاظ سن کر فرمایا: "کیا تم اللہ کی حدود میں سے ایک حد کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟" پھر آپ نے کھڑے ہو کر ایک خطبہ دیا اور فرمایا:

"اے لوگو! تم سے پہلے لوگ اس لیے ہلاک ہو گئے کہ جب ان میں سے کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے، اور جب ان میں کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو وہ اس پر حد قائم کرتے۔ اور بخدا! اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ بھی چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دوں گا۔"

(بخاری، رقم: ۶۷۸۸، مسلم، رقم: ۴۳۹۷)

علامہ عینی نے لکھا ہے کہ اس عورت کا پورا نام فاطمہ بنت اسود بن عبدالاسد بن عمر بن مخزوم تھا۔ یہ ایک جلیل القدر صحابی سیدنا ابوسلمہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہ کی بھتیجی تھیں جو ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے سابق شوہر تھے۔ (ملاحظہ ہو عمدۃ القاری ۲۳/۲۷۷)

معلوم ہوا کہ حدود میں حاکم سے سفارش کرنا جائز نہیں ہے، لیکن اگر حاکم کے پاس مقدمہ پیش کرنے سے پہلے کوئی شخص اپنا حق معاف کر دے تو یہ جائز ہے، مثلاً جس کی چوری ہوئی ہے وہ حاکم کے پاس مقدمہ لے جانے سے قبل چور کو معاف کر سکتا ہے، لیکن جب حاکم کے پاس مقدمہ پیش ہو جائے اور جرم کا ثبوت مل جائے تو اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ مجرم پر حد جاری کر دی جائے، اور حاکم وقت کو بھی حدود معاف کرنے کا حق نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں صدر کو جو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ قاتل کی پھانسی کی سزا کو معاف کر دے یا عمر قید میں تبدیل کر دے، اس کا شریعت میں کوئی جواز نہیں ہے۔ (سرقہ کی تفصیل کے بارے میں ملاحظہ فرمائیں ہماری کتاب "اسلام کا نظام عدل")

مال چوری کرنا تو بہت بڑی بات ہے اسلام تو دوسرے شخص کی خوش دلی (طیب نفس) کے بغیر اس کا مال لینے کو حلال اور جائز نہیں سمجھتا۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

﴿لا یحل مال امرئ الا بطیبة نفس منه﴾

(مسند احمد: ۵/۷۲، تفسیر قرطبی: ۱۲/۳۱۴)

''کسی شخص کے لیے کسی مسلمان کا مال حلال نہیں ہے جب کہ وہ خوش دلی سے نہ دے۔''

اسلام تو اس سے بھی آگے جا کر اپنے ماننے والوں کو اس بات سے روکتا ہے کہ وہ دوسروں کی ملکیت پر استشراف نفس سے نگاہ ڈالے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿ولا تمدن عینیک الیٰ ما متعنا به ازواجاً منهم زهرة الحیاة الدنیا لنفتنهم فیه، ورزق ربک خیر وابقیٰ﴾

(طٰہٰ:۱۳۱)

''اور ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو آزمانے کے لیے دنیا کی آرائش و زیبائش کی جو چیزیں دے رکھی ہیں، آپ ان کی طرف ہرگز آنکھیں نہ پھیلائیں، آپ کے رب کا دیا ہوا ہی بہت بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔''

''ولا تمدن عینیک'' کا مطلب ہے آنکھیں پھاڑ کر اور آنکھیں پھیلا کر نہ دیکھیں۔ امداد کا لفظ پسندیدہ چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جب کہ ''مد'' کا لفظ ناپسندیدہ چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ علامہ راغب نے اس کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

(المفردات:۲/۶۰۰)

مطلب آیت کا یہ ہے کہ دوسروں کے پاس جو مال و متاع ہے اور دنیا کی زیب و زینت کی چیزیں ہیں، آپ ان کو اچھا سمجھتے ہوئے رغبت سے ان کی طرف لمبی نظر نہ کریں اور نہ یہ تمنا کریں کہ آپ کو بھی ان جیسی چیزیں مل جائیں۔

ڈاکوؤں کا قتل:

جس طرح اسلام نے چوری سے کسی مومن کا مال لینا حرام قرار دیا ہے اور چوری کے فعل کے مرتکب ہونے والے لوگوں کے لیے سزا رکھی ہے، اسی طرح حرابہ (ڈکیتی) اور رہزنی کو بھی حرام کہا گیا اور اس کے لیے سخت سزا رکھی گئی ہے۔ سرقہ میں مال غیر کو چھپا کر لیا جاتا ہے اور ڈکیتی میں علی الاعلان لیا جاتا ہے۔ یہ دونوں میں فرق ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک حرابہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کا مال چھیننے کے لیے نکلے اور اس کی راستہ میں خوف و ہراس پیدا ہو جائے، یا وہ مال لے لے یا وہ کسی انسان کو قتل کر دے۔ بعض فقہاء کے نزدیک مال لینے کی خاطر راستے کو پرخطر بنا دینا حرابہ (ڈکیتی) کہلاتا ہے۔ (بدائع الصنائع: ۷/۹۰، المغنی: ۱۰/۳۰۲)

حرابہ کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ، ویسعون فی الارض فساداً، ان یقتلوا أو یصلبوا أو تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف أو ینفوا من الارض﴾ (المائدہ: ۳۳)

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑتے ہیں اور زمین میں اس کے لیے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں، ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا وہ جلاء وطن کر دیے جائیں۔"

اس آیت کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع قدس سرہ نے لکھا ہے:

"اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ محاربہ اور زمین میں فساد کا کیا مطلب ہے؟ اور کون لوگ اس کے مصداق ہیں؟ لفظ "محاربہ" حرب سے ماخوذ ہے اور اس کے اصلی معنی سلب کرنے اور چھین لینے کے ہیں، اور محاورات میں یہ لفظ "سلم" کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے جس کے معنی امن و سلامتی کے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ حرب کا مفہوم بدامنی پھیلانا ہے، اور ظاہر ہے کہ اکا دکا چوری یا قتل و غارت گری سے امن عامہ سلب نہیں ہوتا، بلکہ یہ صورت جبھی ہوتی ہے جب کوئی طاقتور جماعت رہزنی اور قتل و غارت گری پر کھڑی ہو جائے۔ اسی لیے حضرات فقہاء نے اس سزا کا مستحق صرف اس جماعت یا فرد کو قرار دیا ہے جو مسلح ہو کر عوام پر ڈاکے ڈالے اور حکومت کے قانون کو قوت کے ساتھ توڑنا چاہے جس کو دوسرے لفظوں میں ڈاکو یا باغی کہا جاسکتا ہے۔ عام انفرادی جرائم

کرنے والے چور اور گرہ کٹ وغیرہ اس میں داخل نہیں ہیں۔"

راہزنی کے جرم کی سزا:

راہزنی کے جرم میں مجرم جن افعال کا ارتکاب کرتا ہے اس کے لحاظ سے امام حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک مجرم کی سزا مختلف ہے۔ وہ افعال یہ ہیں:

1. بغیر مال چھینے اور بغیر قتل کیے راستہ کو پرخطر بنا دینا
2. صرف مال چھین لینا
3. صرف قتل کر دینا
4. مال بھی چھین لینا اور قتل بھی کر دینا۔

اس میں ہر فعل کی نوعیت الگ الگ ہے، اس لیے ان کی سزا بھی الگ الگ ہے۔ (بدائع الصنائع۔ ج ۷ ص ۹۰)

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہماری کتاب "اسلام کا نظام عدل"۔

باطل اور ناجائز طریقے سے لوگوں کے مال کھانا:

ناجائز اور باطل طریقے سے لوگوں کے مال کھانے کو بھی شریعت نے حرام قرار دیا ہے، اور اس بات کے لیے بھی تعزیر مقرر کی کہ کوئی شخص کسی کی زمین کو زبردستی اور دھوکہ سے دبانے یا کسی کا مال غصب کر لے۔ ان سب کاموں کے لیے آخرت میں مواخذہ ہونے کا بتایا گیا ہے اور دنیا میں حکام کی تعزیر بھی بیان فرمائی گئی ہے۔ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بھی محروم ہے اور ان پر لعنت بھی بھیجی گئی ہے۔ چنانچہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿من غصب شبراً من ارض طوقه الله تعالىٰ من سبع ارضين يوم القيامة﴾

"جو شخص کسی کی بالشت بھر زمین بھی غصب کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز سات زمینوں کا طوق اس کے گلے میں ڈال دیں گے۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ ''جس نے ایک بالشت برابر زمین ہتھیا کر کسی پر ظلم کیا تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ جو شخص زمین کی حدود میں تغیر و تبدل کرے یعنی دوسروں کی زمین غصب کر کے اپنی زمین کی حدود کو بڑھا لے، اس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے۔ (مسلم، رقم: ۱۹۷۸)

اسی سلسلہ میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص جھوٹی قسم کھاتا ہے تاکہ اپنی اس قسم کے ذریعہ دوسرے کا مال غصب کر لے، وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہوں گے۔''

(رواہ احمد: ۱/ ۳۷۷، بخاری، کتاب الشہادات، باب: ۱۹/ ۲۶۶۶، ۲۶۶۷)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا:

﴿من حلف علی مال امرئ مسلم بغیر حقه لقی الله وهو علیه غضبان﴾

''یعنی جس شخص نے ناحق کسی مسلمان شخص کا مال حاصل کرنے کے لیے قسم کھائی تو وہ اللہ تعالیٰ کو اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر غضب ناک ہوگا۔''

(بخاری: ۱۱/ ۴۸۵، مسلم، رقم: ۱۳۸، ابوداؤد: ۳۲۴۳، ترمذی، رقم: ۱۲۶۹، ۲۹۹۹)

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿من اقتطع حق امرئ مسلم بیمینه، فقد اوجب الله له النار و حرم علیه الجنة﴾

''جو شخص اپنی جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی مسلمان کا حق لے لے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جہنم کی آگ کو واجب اور جنت کو اس پر حرام کر دیتا ہے۔''

آپ کے اس فرمان پر ایک شخص نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ: چاہے وہ تھوڑی سی چیز ہو؟ آپ نے فرمایا: '' چاہے وہ پیلو کے درخت کی ایک شاخ ہی ہو۔''

(مسلم، رقم: ۱۳۸، کتاب الایمان، اخرجہ مالک: ۲/ ۷۲۷، والنسائی: ۸/ ۲۴۶)

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بڑے بڑے گناہ یہ ہیں: ''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور جھوٹی قسم (الیمین الغموس) راوی نے عرض کیا کہ جھوٹی قسم کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ جو کسی مسلمان کا مال لے لے یعنی ایسی قسم کھا کر جس میں جھوٹا ہو۔''

(بخاری: ۱۱/ ۴۸۳، باب الیمین الغموس)

انسان کا اپنے مال کا حق دفاع:

اسلام نے ہر انسان کو اپنے مال کا دفاع کرنے کا حق دیا ہے تا کہ کوئی اس کے مال کو زبردستی نہ چھین سکے۔ اور اگر وہ اپنے مال کا دفاع کرتے ہوئے مارا جائے تو شریعت کی نگاہ میں وہ شہید ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿من قتل دون ماله فهو شهيد﴾ (ترمذی: ۲/ ۴۳۵، مسلم، رقم: ۲۲۹)

''جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔''

ایک اور حدیث میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا: ''اے اللہ کے رسول! اگر کوئی شخص میرا مال چھیننا چاہے تو میں کیا کروں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کو مت دو۔'' اس نے عرض کی کہ اگر وہ لڑنا شروع کر دے؟'' آپ نے فرمایا: ''تم بھی اس سے اپنے دفاع میں لڑو۔ اس نے پوچھا: ''اگر وہ مجھ کو قتل کر دے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم شہید ہو گئے۔'' اس نے پھر پوچھا: ''اگر میں اس کو قتل کر دوں؟'' فرمایا: وہ جہنمی ہو گا۔''

(مسلم، رقم: ۲۲۸)

انسان کی محنت کا حق اجرت:

اسلام نے ایک انسان کی جسمانی اور فکری جدوجہد کے ثمرات اور اجرت کی

بھی پوری پوری حفاظت کی ہے۔ اسلام انسان کو عمل اور کام کاج کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ چنانچہ سورۃ جمعہ میں کہا:

''اے ایمان والو! جب جمعہ کے روز اذان دی جائے تو دوڑ پڑو اللہ کے ذکر کی طرف اور چھوڑ دو خرید وفروخت، یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ پھر جب پوری ہو جائے نماز تو پھیل جاؤ زمین میں اور تلاش کرو اللہ کا فضل، اور یاد کرتے رہو اللہ کو کثرت سے تا کہ تمہیں فلاح نصیب ہو۔'' (جمعہ:۹۔۱۰)

علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہ نے اس آیت کی تفسیر میں شاہ عبدالقادر کی تفسیر سے نقل کیا ہے کہ:

''حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یہود کے ہاں عبادت کا دن ہفتہ تھا، سارا دن سودا منع تھا، اس لیے فرمادیا کہ تم نماز کے بعد روزی تلاش کرو اور روزی کی تلاش میں بھی اللہ کی یاد نہ بھولو۔'' (فوائد عثمانی:۳/۶۹۵)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے اپنی روزی کمانے کی ترغیب دی ہے۔ چنانچہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿ما اکل احد کم طعاماً قط خیراً من عمل یدہ، وکان داؤد علیہ السلام لایاکل الا من عمل یدہ﴾

(رواہ البخاری:۳/۲۵۹)

''کسی شخص نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کبھی کوئی کھانا نہیں کھایا اور اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے۔''

اور ایک اور حدیث میں فرمایا کہ:

﴿کان زکریا علیہ السلام نجاراً﴾

(مسلم، رقم:۲۳۷۹، مسند احمد:۲/۲۹۶، ۴۰۵، ۴۸۵)

''حضرت زکریا علیہ السلام بڑھئی تھے۔''

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھوں سے یعنی محنت مزدوری اور دست کاری کے ذریعے سے کما کر کھانا نہایت پسندیدہ اور افضل عمل ہے اور انبیاء علیہم السلام

نے بھی اپنے ہاتھوں سے محنت کی ہے۔

اور جو لوگ اپنی عقل وفکر سے روزی کماتے ہیں جیسے اکاؤنٹنٹ، انجینئر، طبیب جو مرض کی تشخیص کر کے علاج کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ یہ جسمانی مزدوری نہیں ہے بلکہ ذہنی اور عقلی عمل سے روزی کماتے ہیں، یہ لوگ غور وفکر کر کے مختلف کام کرتے ہیں، اسلام نے ان کو بھی اس بات کا حق دیا ہے کہ وہ اس غور وفکر اور عقلی محنت پر اجرت حاصل کریں کیونکہ عقل اور ذہن بھی انسان کے جسم کا ایک حصہ ہیں، اسلام نے ان کو بھی اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ اپنی اس عقلی محنت کا اجر اور معاوضہ حاصل کریں۔ لہٰذا مشورہ کی فیس، وکالت کی اجارت اگر صحیح وکالت کی جائے، ڈاکٹر کی فیس، انجینئر کی فیس ان سب کی اسلام نے تصویب اور توثیق کی ہے۔ اور ان کی اس محنت کی بھی صیانت کی ہے اور ان کو ضائع ہونے سے بچانے کی تاکید ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''حق تعالیٰ فرماتے ہیں: تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جن کی طرف سے میں قیامت کے روز جھگڑا کروں گا۔ ایک وہ شخص جس نے میرا واسطہ دے کر عہد کیا اور پھر اس کو وفا نہ کیا۔ دوسرا وہ شخص جس نے ایک آزاد کو فروخت کیا اور اس کی قیمت کھا گیا۔ ان میں سے ایک شخص وہ ہے

﴿ورجل استأجر اجيراً فاستوفى منه ولم يوفه اجره﴾

(بخاری: ۳/ ۱۰۸، ۱۱۸، ابن ماجہ: ۲/ ۸۱۶، مسند احمد: ۲/ ۳۵۸)

''اور وہ شخص جس نے کسی مزدور کو کام پر لگایا اور اس سے پوری مزدوری لی لیکن اس کی اجرت اس کو نہ دی۔''

اور اجرت جلدی ادا کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿اعطوا الأجير اجره قبل ان يجف عرقه﴾ (مجمع الزوائد: ۴/ ۱۲۱)

''مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دو۔''

حقوق عامہ

حق مساوات

اسلام میں ہر انسان بشریت اور انسانیت کے ناطے برابر ہے، اگر چہ یہ اپنی شکل وصورت، رنگ ونسل، قوت وذکاء، خوب صورتی و جمال، صحت، عمر اور طبائع کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ البتہ اسلام یہ کہتا ہے کہ کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی وجہ سے۔ اور تقویٰ نام ہے اعمال صالحہ جن کے کرنے کی اسلام نے تاکید کی ہے، اور وہ اعمال جو انسان اپنے رب، اپنے اہل وعیال اور انسانی معاشرہ کے لیے انجام دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿یاایھا الناس انّا خقلنا کم من ذکر وانثیٰ وجعلنا کم شعوباً وقبائل لتعارفوا، ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم﴾

(حجرات:۱۳)

''اے ایمان والو! ہم نے تمہیں پیدا کیا ایک مرد اور ایک عورت سے، پھر بنا دیا ہم نے تم کو قومیں اور قبیلے تاکہ تم ایک دوسرے سے پہچانے جاؤ، بے شک تم میں زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہے۔''

تقویٰ کا اصل مقام تو قلب ہے اور یہ عبارت ہے ہر شخص کی بھلائی چاہنا۔ رسول اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ دل کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کر کے فرمایا: ''تقویٰ یہاں ہے۔'' اور آپ نے اپنے دل کی طرف تین دفعہ اشارہ فرمایا۔

(مسلم، رقم: ۲۵۶۴،۲۵۹۳)

تقویٰ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اور اس کے ثواب اور اس کی جنت کی طمع کرتے ہوئے جس کو اللہ تعالیٰ نے صرف متقین کے لیے بنایا ہے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا۔ اس جنت میں کوئی داخل نہیں ہوگا پہلے اللہ کی رحمت سے پھر اس پر ایمان لانے کے نتیجہ میں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم جنت میں داخل نہیں ہو گے جب تک کہ تم ایمان نہ لاؤ اور ایمان اس وقت تک تمہارا صحیح نہیں ہوگا جب تک کہ تم آپس میں محبت نہ کرو۔ کیا تمہیں وہ شے نہ بتاؤں جس پر عمل کرنے سے تمہاری باہمی محبت میں اضافہ ہو۔ وہ شے یہ ہے کہ تم آپس میں ''السلام علیکم'' کو عام کرو۔''

پھر سلام کرنے میں شریعت نے واقف و ناواقف، چھوٹے اور بڑے اور امیر و غریب کی تخصیص نہیں کی، بلکہ فرمایا کہ جو مسلمان بھی ملے اس کو سلام کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایک حدیث میں فرمایا:

﴿وتقرئ السلام علیٰ من عرفت و علیٰ من لم تعرف﴾

(بخاری: ۱/۵۵، مسلم، رقم: ۳۹، ابوداود، رقم: ۵۱۸۰)

''واقف اور ناواقف دونوں کو سلام کرو۔''

واقف و ناواقف کو سلام کہنا اصلاح اور محبت و مودت پھیلانے کا باعث ہے اس میں ریاکاری اور تکلف نہیں ہے۔ اس سے انس و محبت کے دروازے کھلتے ہیں، باہمی تقرب کی راہیں کھلتی ہیں، وحشت و بیگانگی دور ہوتی ہے، باہمی تعلقات میں خلوص پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر دو مسلمان آپس میں ملیں اور ایک دوسرے کو سلام نہ کریں تو اس سے آپس میں بیگانگی اور اجنبیت بڑھتی ہے۔

ایک اور موقع پر آپ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

﴿یا ایھا الناس: افشوا السلام، اطعموا الطعام، وصلوا والناس نیام، تدخلوا الجنة بسلام﴾

(سنن الدارمی: ۱/۳۴۰، ۲/۲۷۵، مسند احمد: ۵/۴۵۱، مستدرک حاکم: ۳/۱، ترمذی، رقم: ۲۴۸۵، ابن ماجہ، رقم: ۱۳۳۴، ۳۲۵۱)

''اے لوگو! سلام کو پھیلاؤ، بھوکے کو کھانا کھلاؤ، جب لوگ سوئے

ہوئے ہوں تو نماز پڑھو، اور سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ۔"

سلام میں مساوات انسانی کا یہ لحاظ رکھا گیا کہ جو اونچا ہے اور اس کو نیچے کیا گیا۔ چنانچہ فرمایا:

﴿یسلم الراکب علی الماشی، والماشی علی القاعد﴾

"سوار پیدل کو سلام کرے اور پیدل بیٹھنے والے کو سلام کرے۔"

آج کل مساوات کا تصور صرف کتابوں میں رہ گیا ہے، موجودہ دور میں لوگوں کو سونے اور چاندی میں تول کر اس کی حیثیت مقرر کی جاتی ہے۔ جو امیر ہے اس کے مقام کو ایک غریب کبھی نہیں پا سکتا خواہ غریب میں کتنی ہی خوبیاں کیوں نہ ہوں، لیکن چونکہ اس کے پاس مال نہیں۔ اس کا دامن دولت سے بھرا ہوا نہیں ہے، اس وجہ سے اس کی موجودہ سرمایہ دارانہ معاشرہ میں کوئی وقعت اور اہمیت نہیں ہے۔ اسلام نہ تو سرمایہ دارانہ نظام کی طرح ہر قسم کی چھٹی دیتا ہے کہ جس طرح انسان چاہے کمائے اور جس طرح چاہے صرف اور خرچ کرے اور نہ وہ اشتراکی نظام معیشت کی طرح فرد کو مشین کا ایک پرزہ بنا کر رکھ دیتا ہے۔ وہ نہ تو یہ کہتا ہے کہ تمام جائیداد کا مالک انسان ہے اور ہر فرد جس طرح چاہے اس میں تصرف کر سکتا ہے اور نہ وہ ملک کی تمام جائیداد کا مالک اسٹیٹ کو قرار دے کر انفرادی سرمایہ داری کے بجائے ریاستی چور بازاری اور ریاستی ارتکاز واحتکار کو جنم دیتا ہے۔ اسلام دراصل تمام نظام ہائے زندگی کے محاسن کا ایک مرکب ہے جس سے ہٹ کر آگے اور پیچھے سوائے تباہی اور بربادی کے اور کچھ نہیں۔

اسلام اقتصادی اور معاشی بنیادوں پر آدمی اور آدمی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا کیونکہ اس کے نزدیک مختلف کام کرنے سے آدمی اور آدمی میں کوئی اہم فرق نہیں پیدا ہو جاتا۔ اسلام میں فرق صرف اور صرف ایک ہی چیز سے پیدا ہوتا ہے، اور وہ ہے آدمی کا اخلاق، کردار اور تقویٰ۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

﴿لا فضل لاحد علیٰ احد الا بدین و تقویٰ﴾

"کسی شخص کو کسی دوسرے شخص پر کوئی فضیلت نہیں مگر دین داری اور پرہیزگاری کے اعتبار سے۔"

اسلام انسان کے معاشرتی اور سماجی نظم کی بنیاد اس تصور پر رکھتا ہے کہ تمام دنیا کے انسان ایک آدم کی اولاد ہیں اور اس لیے ان کے جملہ بنیادی حقوق میں کوئی امتیاز اور تفاوت بھی روا نہیں رکھا جا سکتا۔

خطبہ حجۃ الوداع میں سرکار دو عالم ﷺ نے میدان عرفات میں ایک جم غفیر کے سامنے یہ اعلان فرمایا تھا:

''کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی کالے کو گورے پر اور کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت اور برتری حاصل نہیں ہے مگر تقویٰ کی وجہ سے۔ تم سب آدم (علیہ السلام) کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔''

(بخاری: ۲/۶۳۱، سیرۃ ابن ہشام: ۲/۲۰۱، عیون الاثر: ۲/۳۵۹)

مساوات کا صحیح مفہوم:

یہ تو ہر شخص کہتا ہے کہ اسلام میں مساوات ہے لیکن مساوات کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ عرف عام میں مساوات سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ تمام انسان ہر لحاظ سے برابر ہیں، لیکن یہ کہنا خلاف حقیقت ہے۔ تمام انسان ہر لحاظ سے قطعاً برابر نہیں ہیں، اللہ جل جلالہ نے ان کی طبیعتوں، صلاحیتوں، میلانات، رجحانات، رنگ و نسل اور فکر و نظر میں فرق رکھا ہے۔ خود قرآن حکیم میں ہے:

﴿لا یستوی الذین یعلمون و الذین لا یعلمون﴾ (زمر: ۹)

''جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔''

تاہم ان فطری اختلافات کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان مستقل نوعیت کی طبقہ بندی کا کوئی جواز نہیں کیونکہ ان کی پیدائش میں انسان کو اپنی کسی کوشش کا کوئی دخل نہیں، لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر مسلمہ ہے کہ مساوات انسانی کا مسئلہ انسانی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے اور معاشروں اور سماجوں کے بناؤ اور بگاڑ میں اس کا فیصلہ کن کردار رہا ہے۔ یونانی، رومی اور ہندی تمدنوں میں انسانی مساوات کا کوئی تصور موجود نہیں رہا۔ جدید سرمایہ دارانہ معیشت نے انسانوں کے مابین معاشرتی فرق کی بنیاد فراہم

کر دی ہے اور معاشی اور اقتصادی جدوجہد کو رواں دواں رکھنے کے لیے آجر اور اجیر، جاگیردار اور کاشت کار کے طبقات کی موجودگی کو لازمی اور ضروری قرار دیا گیا ہے۔

اسلام نے مساوات انسانی کے مسئلہ کو اپنے مخصوص اور متوازن انداز میں قرآن وحدیث میں حل کیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿یاایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ، وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالاً کثیرا﴾

(النساء:۱)

''اے لوگو! اپنے پروردگار (کی مخالفت سے) ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار (یعنی آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا (کیونکہ سب آدمیوں کی اصل وہی ہیں) اور اس (ہی) جاندار سے اس کا جوڑا (یعنی ان کی زوجہ حواء کو) پیدا کیا اور پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دنیا میں) پھیلائیں۔''

اسی طرح سورت حجرات: ۱۳ میں بھی یہ کہا گیا کہ اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری ذاتیں اور قبیلے بنائے تا کہ تمہاری آپس کی پہچان ہو۔

ان آیات سے پتہ چلا کہ انسان ہونے کے ناطے تمام انسان برابر ہیں۔ ان کا مادہ تخلیق اور طریق تخلیق ایک ہے، خواہ کوئی غریب کا بچہ ہو یا شہنشاہ کا، آجر کا ہو یا اجیر کا، انسان ہونے کی حیثیت سے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ البتہ اپنے خالق و مالک کی فرماں برداری اور نافرمانی ان کے درمیان فرق ضرور پیدا کر دیتی ہے، اور اس طرح انسانوں کے صرف دو طبقات ہیں: مسلم اور کافر۔

پس تمام انسان اسلام کی نظر میں برابر ہیں۔ قبیلہ، جنس اور نسب وغیرہ کے فرق سے ان میں کوئی امتیاز نہیں بلکہ سب کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر ہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿الناس سواسیۃ کاسنان المشط﴾

(مسند الشہاب لمحمد بن سلامۃ، رقم: ۱۹۰ (۱/۱۴۵))

''تمام لوگ آپس میں کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر ہیں''

چنانچہ ایک مرتبہ سیدنا ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ جو کہ عربی النسل تھے، ان کا سیدنا بلال حبشی رضی اللہ عنہ سے کسی بات پر کچھ اختلاف ہو گیا۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ نے غصہ میں انہیں کہہ دیا: ''یا ابن السوداء! او حبشی کے بیٹے! جب اس بات کا رسول اللہ ﷺ کو پتہ چلا تو آپ نے فرمایا:

﴿طف الصاع، طف الصاع﴾

''پیمانہ پورا رکھو، پیمانہ پورا رکھو۔''

مطلب یہ تھا کہ تم میں سے کامل اور پورا کوئی نہیں ہر ایک میں کچھ نہ کچھ نقص ضرور ہے، یا تم سب قریب قریب ہو، بھرپور صاع سے تم میں سے ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں۔

حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

﴿لیس لابن البیضاء علیٰ ابن السوداء فضل إلا بالتقویٰ أو عمل صالح﴾

''اک سفید عورت کے بیٹے کو حبشن کے بیٹے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ یا عمل صالح کی وجہ سے۔''

سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کا سرکار دو عالم ﷺ کے منہ سے یہ کلمات سننا تھا تو آپ تربیت نبوی اور ایمان صحیح کی برکت سے کانپ اٹھے۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ نے اپنا رخسار زمین پر رکھ دیا اور سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اپنے پاؤں سے اس کو روندو یہاں تک کہ حق تعالیٰ شانہ مجھے معاف فرما دیں اور جاہلیت کا یہ اخلاق مجھ سے سلب کر لیں۔

(روی البخاری قریباً منہ: ۱/۲۰، مسلم: ۲/۱۳۳، عن ابی ذر رضی اللہ عنہ)

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ابو مسعود رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ اپنے خادم کو چھڑی سے مار رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ابو مسعود رضی اللہ عنہ! اپنا ہاتھ روک لے، اللہ تعالیٰ کو تم پر زیادہ قدرت حاصل ہے جتنی تجھے اس غلام پر ہے۔'' (مسلم: ۲/۱۳۰)

اسلامی مساوات کے اسی جذبہ کے تحت رسول اللہ ﷺ نے مختلف جیوش کی قیادت سیدنا بلال بن رباح رضی اللہ عنہ، سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ وغیرہ کو سونپی تا کہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ اسلام میں محمود و ایاز نہ صرف ایک صف میں کھڑے ہوتے ہیں بلکہ ایاز امام ہوتا ہے اور محمود مقتدی۔

پھر مساوات اور عدالت کے جذبہ کے تحت آپ نے اپنے انتقال سے قبل یہ اعلان فرمایا:

﴿الا من كنت جلدت له ظهرا فهذا ظهري فليستقد، ومن كنت شتمت له عرضا فهذا عرضي فليستقد﴾

''سن لو! میں نے اگر کسی کی پیٹھ پر کوئی چھڑی یا ضرب لگائی ہے تو میری پیٹھ حاضر ہے وہ مجھ سے بدلہ لے لے، اور جس کو میں نے عزت و آبرو کے بارے میں کوئی نازیبا بات کہی ہے تو وہ بھی مجھ سے بدلہ لے لے۔''

(طبقات ابن سعد: ۲/۲۵۵، کامل لابن اثیر: ۲/۱۵۳، وجاء معناه في حديث رواه مسلم: ۱۶/۱۵۰، مسند احمد: ۲/۴۳، مسند الدارمی: ۲/۳۱۴، ابوداؤد: ۲/۳۸۹، والنسائی: ۲/۲۹)

مساوات کے اسی جذبہ کو دنیا میں اجاگر کرنے کے لیے امیر المؤمنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا:

﴿ان الله ليس بينه وبين احد نسب الا بطاعته، والناس شريفهم ووضيعهم في ذات الله سواء﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ کا کسی شخص سے کوئی نسبی رشتہ نہیں سوائے اس کی طاعت وفرماں برداری کے، شریف اور چھوٹے لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے برابر ہیں۔'' (حقوق الانسان في الاسلام، دکتور محمد الزحیلی: ص ۱۵۴)

جاہلیت کے عدم مساوات کے جذبہ کو کم کرنے کے لیے آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿ولیس منا من دعا الی عصبیة، ولیس منا من قاتل علی عصبیة، ولیس منا من مات علی عصبیة﴾

"جو عصبیت کی طرف دعوت دے اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں، جو عصبیت (تعصب اور ناحق شناسی) یعنی تعصب اور قوم کی ناحق حمایت کے لیے لڑے وہ بھی ہم میں سے نہیں اور جو عصبیت پر مرا اس کا بھی ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔" (رواہ ابوداود: ۳/۶۲۵)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿من نصر قومه علیٰ غیر الحق فهو کالبعیر الذی رویٰ فهو ینزع بذنبه﴾ (ابوداود: ۲/۳۲۳، بیہقی: ۱۰/۲۳۴)

"جو شخص اپنے اہل قوم کی ناحق پر مدد کرے (یعنی اہل قوم یا قبیلہ حق اور انصاف کی راہ سے ہٹے ہوئے ہوں مگر پھر بھی برادری کی لاج سے انہی کا ساتھ دیا جائے) اس کی مثال اس اونٹ کی سی ہے جو کنویں یا گھڑے میں گر گیا ہو، اب اس کو دم پکڑ کر نکالیں۔"

بھلا دم پکڑنے سے کہیں اونٹ نکلتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص گمراہی کے گڑھے میں گر گیا، اب اس کا نکلنا مشکل اور دشوار ہے۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "بے شک اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کا کبر اور نخوت نکال لی ہے اور آباء واجداد پر فخر کرنا بھی ختم کر دیا ہے، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا تھا۔ لوگ اپنی قوموں اور قبیلوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں کیونکہ ایسا کرنا جہنم کا ایندھن بنتا ہے۔"

(رواہ ابوداود: ۴/۶۶۴، ترمذی وحسنہ: ۱۰/۴۵۵، مسند احمد: ۲/۳۶۱، ۵۲۳، الفتح الکبیر: ۳۸۱)

مسلمانوں کی باہمی مساوات کے بارے میں بہت سی احادیث کتابوں میں موجود ہیں جن کو طوالت کی وجہ سے نقل نہیں کیا جارہا، لیکن یہ تو ساری دنیا کو علم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں آکر مہاجرین وانصار میں باہمی اخوت اور بھائی چارے

کے رشتہ قائم کیا، اور پوری دنیا کو بتایا کہ مسلمانوں میں باہمی مضبوط ترین رشتہ ایمان اور اسلام کا رشتہ ہے۔ یہ بھائی چارہ اور مواخات سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے مکان میں ہوئی۔ (عیون الاثر، ۳۲۲/۱)

بھائی چارے کی بنیاد امام سہیلیؒ کے قول کے مطابق یہ تھی کہ مہاجرین کے دلوں سے غربت اور اجنبیت کی وحشت کو دور کیا جائے اور ایک دوسرے کے دلوں میں غم خواری اور غم گساری کے جذبات پیدا کیے جائیں۔ اور بعض حضرات نے اس بھائی چارے کا مقصد یہ بھی لکھا ہے کہ جاہلیت کی تمام عصبیتیں تحلیل ہو جائیں۔ رنگ و نسل اور وطن کے تمام امتیازات ختم ہو جائیں۔ غیرت و حمیت جو کچھ ہو وہ صرف اور صرف اسلام کے لیے ہو۔ غمگساری اور موانست کے جذبات معاشرہ میں پیدا ہوں۔ انصار نے اس بھائی چارے کو اس طریق سے نبھایا کہ چشم فلک نے آج تک ایسی اخوت کا مظاہرہ نہیں دیکھا۔

حافظ ابن عبدالبرؒ اور علامہ ابن سید الناسؒ نے لکھا ہے کہ مواخات دو مرتبہ ہوئی ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں جس میں مہاجرین میں باہمی رشتہ اخوت قائم فرمایا اور غلام و آقا کی تمیز ختم کر دی۔ اس میں سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو جو غلام تھے، سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کا بھائی بنایا گیا جو بنو ہاشم میں تھے۔ اسی طرح سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو سیدنا عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ کا بھائی بنایا اور سیدنا سالم مولیٰ ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کو سیدنا ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کا بھائی بنایا گیا۔ دوسری مواخات بعض روایات کے مطابق ہجرت کے پانچ ماہ بعد اور بعض روایات کے مطابق مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد اور بعض اقوال کے مطابق جب مسجد نبوی تعمیر ہو رہی تھی، سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے مکان پر ہوئی۔ (عیون الاثر: ۳۲۲/۱) اس میں آپ نے 45 مہاجرین کو 45 انصار کا بھائی بنایا۔

انصار نے مہاجرین کے ساتھ اس بھائی چارہ کا صحیح معنوں میں حق ادا کیا۔ چشم فلک نے کبھی ایسا بھائی چارہ نہ پہلے کبھی دیکھا اور نہ آئندہ قیامت تک کبھی دیکھے گی۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے جب مہاجرین اور انصار میں یہ مواخات قائم فرمائی تو انصار نے بارگاہ رسالت میں عرض کی کہ آپ ﷺ ہمارے اور ہمارے مہاجر بھائیوں کے درمیان کھجور کے باغات تقسیم کر دیں۔ آپ نے فرمایا: نہیں۔ انصار نے عرض کی تب

آپ لوگ یعنی مہاجرین ہمارا کام کر دیا کریں تو ہم پھل میں آپ لوگوں کو شریک رکھیں گے۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ (بخاری: ۱/۳۱۲)

ایسے غم گسار، غم خوار، ہمدرد اور ایثار و خلوص کے پتلے تو حقیقی اور سگے بھائی بھی نہیں ہوتے جیسے انصار مہاجرین کے لیے تھے۔ انصار کی اس بے مثال غم گساری اور ہمدردی کو دیکھ کر ایک دن مہاجرین نے سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! جس قوم میں ہم آئے ہیں، ہم نے ان سے زیادہ کسی قوم کو غمگسار، اور ایثار پیشہ نہیں دیکھا، ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں سارا اجر و ثواب یہی نہ لے جائیں اور ہم اس اجر و ثواب سے محروم اور خالی رہ جائیں۔ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: ''نہیں، جب تک تم ان کے لیے دعا کرتے رہو۔''

(عیون الاثر: ۱/۲۲۲، مسند احمد: ۳/۲۰۰، ۲۰۴، البدایہ والنہایہ: ۳/۲۲۸)

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ کسی مسلمان کا اپنی قوم، برادری یا قبیلہ کو محبت کرنا ''عصبیت'' نہیں ہے جس کی اسلام نے مذمت کی ہے بلکہ عصبیت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی قوم اور برادری کے ظلم اور ناحق بات پر اس کی مدد کرے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لیس من العصبیة ان یحب الرجل قومه، وانما العصبیة ان یعین قومه علی الظلم﴾

''عصبیت یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی قوم سے محبت کرے بلکہ عصبیت یہ ہے کہ ظلم پر اپنی قوم کی اعانت کرے اور اس کا ساتھ دے۔''

(رواہ ابوداؤد: ۲/۶۹۵، سنن کبریٰ بیہقی: ۱۰/۲۳۴)

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿خیر کم المدافع عن عشیرته مالم یأثم﴾

(رواہ ابوداؤد فی کتاب الادب، رقم: ۵۱۱۴)

''تم میں وہ شخص بہتر ہے جو اپنے قبیلہ اور برادری کی حمایت کرے جب کہ وہ (برادری والے) کسی غلط کام میں ملوث نہ ہوں۔''

ان کے علاوہ آپ ﷺ نے اپنی بہت سی احادیث میں لوگوں کے مابین مساوات اور برابری کو ایمان کی بنیاد پر قائم کیا نہ کہ رنگ و نسل اور وطن و نسب پر۔ چنانچہ ایک حدیث میں فرمایا:

﴿ان الله لاینظر الیٰ صورکم واجسادکم، ولکن ینظر الیٰ قلوبکم واعمالکم﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے جسموں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے قلوب اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔''

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں:

﴿ان الله لاینظر الیٰ صورکم واموالکم﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے اعمال کو نہیں دیکھتا۔''

لوگوں کو ان کی حیثیت کے مطابق مقام دینا:

اگرچہ اسلام میں تمام لوگوں کو مساوات کی تعلیم دی گئی ہے لیکن یہ بھی تاکید کی گئی کہ اسلام کی نظر میں یہ بھی عدل و مساوات کا ایک تقاضا ہے کہ اشراف اور صاحبان عزت و وقار سے ان کی حیثیت کے مطابق معاملہ کیا جائے۔ چنانچہ سیدہ عائشہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا۔

﴿ننزل الناس منازلھم﴾ (رواہ ابوداود: ۴۸۴۲، وذکرہ مسلم تعلیقا)

''کہ ہم ایک شخص کو اس کے درجہ پر رکھیں یعنی اس کی عزت اور فضیلت کے موافق اس کی تعظیم کریں۔ یہ نہیں کہ گدھا گھوڑا سب برابر، عالم اور جاہل، شریف اور کمین سب سے یکساں برتاؤ کریں۔''

چنانچہ ایک مرتبہ انصار کے سردار سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ زخمی ہونے کی حالت میں تشریف لائے تو حضور ﷺ نے فرمایا:

﴿قوموا الی سیدکم او خیرکم﴾ (بخاری: ۳۰۴۳، مسلم: ۱۷۶۸)

''اپنے سردار کے لیے اٹھو۔''

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے ایک دوسرے کے لیے تواضع کا حکم بھی فرمایا اور تاکید کی کہ کوئی دنیا کسی بات پر فخر نہ کرے۔ جب سرکار دو عالم ﷺ تمام اولاد آدم کا سردار ہو کر یہ فرماتے ہیں "ولا فخر" میں فخر نہیں کرتا۔

(مسلم، رقم: ۲۲۷۸، ترمذی: ۵/۳۰۸، مسند احمد: ۲/۵۴۰، سنن ابی داود: ۴/۲۱۸، مسند ابی یعلی موصلی: ۱۳/۴۸۰)

تو ہم کون ہیں جو اپنی کسی معمولی سی خوبی یا اپنے مال و دولت پر فخر کرنا شروع کر دیں۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿ان اللہ اوحی الی ان تواضعوا حتی لایفخر احد علی احد، ولا یبغی احد علی احد﴾

"بے شک اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی کہ تم لوگ ایک دوسرے سے تواضع سے پیش آؤ، اور کوئی ایک دوسرے پر فخر نہ کرے اور نہ ہی ایک دوسرے سے سرکشی کرے۔"

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مساوات:

اسلام نے نہ صرف مسلمانوں کے مابین مساوات کو قائم کیا بلکہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان بھی مساوات کے رشتہ کو استوار کیا۔ اور تمدنی اور حقوق عامہ ان کو بھی وہی دیئے جو مسلمان کو اسلامی حکومت میں دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا، واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل، ان اللہ نعما یعظکم بہ، ان اللہ کان سمیعاً بصیرا﴾ (النساء: ۵۸)

"بے شک اللہ تم کو یہ حکم دیتا ہے کہ تم امانت کے اہلوں کو امانت سپرد کرو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں کیسی اچھی نصیحت فرماتا ہے، بے شک اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔"

اس آیت میں ایک تو امانتیں ان کے اہلوں کے سپرد کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور دوسرے لوگوں کے درمیان عدل کا حکم دیا گیا۔ مسلمانوں کے درمیان عدل نہیں بلکہ لوگوں کے درمیان عدل کا حکم ہے خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ چنانچہ امام عادل کی حدیث میں فضیلت بیان کی گئی اور امام ظالم کی مذمت۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قاضی ظلم نہ کرے۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب اور اس کے نزدیک سب سے زیادہ مقرب شخص امام عادل ہوگا اور سب سے زیادہ مبغوض اور سب سے زیادہ دور امام ظالم ہوگا۔ (ترمذی، رقم:۱۳۲۵)

اور ایک دوسری روایت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس روز کوئی سایہ نہیں ہوگا اس روز سات آدمی اللہ کے سایے میں ہوں گے ان میں سے پہلا شخص عدل کرنے والا حاکم ہے۔''

(بخاری، رقم: ۶۶۰، مسلم، رقم: ۱۰۳۱، ترمذی، رقم: ۲۳۹۱، مسند احمد: ۲/۴۳۹، مسند ابوداؤد الطیالسی، رقم: ۲۴۶۲، صحیح ابن حبان، رقم: ۴۴۸۶، ابن خزیمہ، رقم: ۳۵۸، سنن کبریٰ بیہقی: ۳/۶۵)

پھر عدل کرنے والے حاکم کے بارے میں یہاں تک فرمایا کہ عدل کرنے والے حاکم کا ایک دن ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے، اور زمین میں اللہ کی حد کو قائم کرنا اس زمین پر چالیس روز کی بارش سے زیادہ نفع آور ہے۔

(معجم کبیر طبرانی، رقم: ۱۱۹۳۲، سنن کبریٰ بیہقی: ۸/۱۶۲، بیہقی شعب الایمان، رقم: ۷۳۷۹)

اسلام کی رو سے ایک اسلامی ریاست میں ذمیوں اور غیر مسلموں کے وہی حقوق ہیں جو مسلمانوں کے ہیں اور ایک اسلامی حکومت کا یہ فریضہ ہے کہ جس طرح وہ مسلمانوں کی رعایت میں لڑتے ہیں مسلمانوں کو بھی ان کے لیے لڑنا چاہیے۔ اور ان کے فیصلے ان کے قوانین کے مطابق کرنے چاہئیں، ان کے عقائد کا احترام کرنا ضروری ہے، ان کی عیدوں کے موقع پر ان کو عدالتوں میں نہیں بلانا چاہیے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے جو آپ نے یہود کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

''تم لوگ یہودی ہو، تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم سبت کے دن زیادتی نہ کرو۔'' (ترمذی، رقم: ۲۷۳۳، وقال: حدیث حسن صحیح)

عدل و احسان میں بھی اسلام نے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں مساوات کو قائم رکھا اور لوگوں کو تاکید کی کہ ان کے ساتھ اچھا معاملہ کیا جائے اور اپنی زبان اور اپنے ہاتھ ان کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ دی جائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے، یا اس کے حق میں کمی کرے، یا اس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف دے، یا اس کی خوش دلی کے بغیر اس کی کوئی چیز لے لے، تو میں قیامت کے روز اس کی طرف سے وکیل اور جھگڑا کرنے والا ہوں گا۔''

کسی ذمی کو قتل کرنا، اس کی عزت و آبرو سے کھیلنا تو بہت بڑی بات ہے اسلام نے تو ذمی کی غیبت کو بھی حرام قرار دیا ہے اور اس پر کسی قسم کا ظلم کرنا ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

''جس شخص نے کسی مسلمان کے ذمہ کو جو اس نے کسی ذمی سے کیا تھا، توڑ دیا اور برقرار نہ رکھا، اس پر اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کی کوئی نفلی اور فرضی عبادت قبول نہیں فرمائے گا۔''

اور جو لوگ غیر اسلامی مملکت میں سکونت پذیر ہیں لیکن ان سے معاہدہ ہو چکا ہے، ان کو خلاف عہد تکلیف پہنچانا اور قتل و غارت کرنا معصیت اور گناہ کبیرہ میں داخل ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ نے صلح حدیبیہ میں یہ شرط کی تھی کہ جو مسلمان دین اسلام کو قبول کر کے مسلمانوں کے پاس آجائے گا، مسلمان اس کو واپس کر دیں گے۔ چنانچہ جب کفار مکہ نے ابوجندل رضی اللہ عنہ اور ابوبصیر رضی اللہ عنہ کی واپسی کا مطالبہ کیا تو ان کی ہزار منت سماجت کے باوجود آپ نے ان دونوں کو بے تامل واپس کر دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس حکم کی پابندی اس حد تک کی کہ اس سے بڑھ کر پابندی ناممکن تھی۔ چنانچہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ دشمن کے ساتھ ایک مدت کے لیے التواء جنگ کا معاہدہ کر لیا تھا۔ اس عرصہ میں وہ چپکے چپکے سرحد پر جنگ کی مکمل تیاریاں کرتے رہے تاکہ مدت التوا ختم ہوتے ہی اچانک حملہ کر دیں۔ ان کی رائے میں یہ بات تدابیر جنگ کے اقتضاء کی وجہ سے ناجائز نہ تھی۔ دوسرے ان کو یہ بھی اندیشہ تھا کہ دشمن بھی اسی فکر میں ہوگا کہ مدت ختم ہوتے ہی فوراً حملہ کر دے۔

چنانچہ جونہی مدت التواء ختم ہوئی، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس فوج کو جو پہلے ہی سرحد پر متعین تھی، حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ فوج حملہ کرنے کے لیے جا رہی تھی کہ ایک صحابی رسول گھوڑا دوڑاتے ہوئے اور یہ چلاتے ہوئے آ رہے تھے "اللہ اکبر، اللہ اکبر، وفاء لا غدر" یعنی "اللہ اکبر وفا کی جائے بدعہدی نہ کی جائے۔" لوگوں نے جب نظر اٹھا کر دیکھا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ تو پتہ چلا کہ یہ سرکار دو عالم ﷺ کے صحابی سیدنا عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: "کیا بات ہے؟" انہوں نے سرکار دو عالم ﷺ کی حدیث سنائی کہ میں نے حضور ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے کہ جس قوم اور شخص کے درمیان کوئی عہد و پیمان ہو تو اس کی مدت کے اختتام سے قبل معاہدہ کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرنا چاہیے حتیٰ کہ مدت معاہدہ پوری ہو جائے یا ان کی طرف سے عہد کو واپس کر دیا جائے۔ چنانچہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے فوراً اپنی فوج کو واپس بلا لیا۔

(ابوداؤد: ۲۳/۲، مصنف ابن شیبہ ۱۰۱/۲، ابن حبان: ۱۸۲/۸، مشکوٰۃ: ص ۳۴۷)

ایک اسلامی ریاست میں جیسا کہ ایک مسلمان کا قصاص ہے یا اس کے اعضائے بدن کے عوض اعضائے بدن کا قصاص ہے، ویسا ہی ایک ذمی کے قاتل سے قصاص لیا جائے گا، اور ایک مستامن کے قاتل سے بھی وہی قصاص لیا جائے گا۔ (مستامن وہ ہے جو غیر اسلامی ملک میں رہتا ہے لیکن امن لے کر اسلامی ریاست میں آ کر آباد ہو اور ذمی بن گیا) بلکہ بعض لحاظ سے ایک ذمی کے حقوق ایک مسلمان سے بھی اسلامی ریاست میں زیادہ ہیں۔ جو اموال یا اشیاء مسلمانوں کو رکھنا یا استعمال کرنا حرام ہے بلکہ ان کا تلف کرنا ضروری ہے، اگر وہ اشیاء تلف کر دی گئیں تو ان پر کوئی ضمان نہیں، لیکن اگر وہ اشیاء ایک ذمی کی ملکیت میں ہوں اور کوئی مسلمان اسے تلف اور ضائع کر دے تو اس مسلمان کے ذمہ ضمان واجب ہے، چنانچہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلمان کی شراب یا خنزیر کو تلف کر دے تو اس پر ضمان واجب ہے۔ (کما فی درالمختار)

یہ تو ایک ذمی کی جان اور مال کا حال ہے۔ اسلام نے اس کی عزت و ناموس کا بھی اسی طرح تحفظ کیا ہے جیسا کہ ایک مسلمان کی عزت و آبرو کا تحفظ کیا ہے۔ چنانچہ کسی

ذمی کی آبروریزی اور اہانت وتذلیل خواہ قول سے ہو یا اشارہ وکنایہ سے ہو، سامنے ہو یا اس کی غیبت میں ہو، قطعاً حرام ہے۔ یہاں تک کہ ذمی کی غیبت کرنا بھی حرام ہے، گویا کہ اسلامی ریاست میں ایک مسلمان اور ذمی کے حقوق میں کوئی فرق نہیں بلکہ دونوں کے حقوق میں مساوات ہے، اور اس کو بھی وہ تمام تحفظات حاصل ہیں جو ایک مسلمان کو حاصل ہیں۔ چنانچہ شرح شرنبلالیۃ الاسلام میں ہے کہ:

''رعیت کے تمام انواع اصناف میں مساوات کو ملحوظ رکھا جائے۔ کسی کو کسی پر اس کے مرتبہ یا حال کی وجہ سے تقدیم وترجیح نہ دے۔ قاضی کو چاہیے کہ مدعی اور مدعا علیہ میں کسی بات کا فرق نہ کرے، نہ ان کی مجلس میں، نہ ان کی طرف دیکھنے میں اور نہ ہی گفتگو میں۔'' (۲/۱۱۷)

حقوق ومعاملات کی مساوات کا یہ دائرہ صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہیں بلکہ غیر مسلم ذمی اور مستامن کو بھی شامل ہے، چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں ایک فریق مسلمان تھا اور دوسرا یہودی۔ یہودی سچا تھا لہٰذا آپ نے ڈگری اس کے حق میں دی۔

ہاں مسلمان اور ذمی (غیر مسلم) کا امتیاز کن امور میں ہے، اس کی چند ایک مثالیں یہ ہیں کہ کسی مسلمان عورت کا غیر مسلم مرد سے نکاح درست نہیں ہے کیونکہ عورت مرد کے تابع ہوتی ہے اور مسلمان عورت جب غیر مسلمان مرد کے تابع ہوگی تو اس کا اسلام اور ایمان معرض خطر میں ہوگا، البتہ مسلمان مرد غیر مسلمان عورت سے اس صورت میں نکاح کرسکتا ہے کہ غیر مسلم عورت اہل کتاب میں سے ہو، مشرکہ نہ ہو، یا مثلاً غیر مسلم جو مسلمان حکومت کے تحت رہتا ہے، اس سے اور مسلمان دونوں سے محصول لیا جاتا ہے، لیکن چونکہ مسلمان کے ہر قول وفعل سے عبادت کے پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اس لیے جو محصول اس سے لیا جاتا ہے اس کا نام زکوٰۃ یا عشر رکھا گیا ہے۔ اگر وہ ٹیکس اموال تجارت سے لیا گیا تو زکوٰۃ ہے اور محاصل زمین سے لیا گیا تو عشر ہے۔ اور پھر ان کا مصرف بھی الگ الگ مقرر کر دیا گیا۔ غیر مسلم سے جو محصول لیا جاتا ہے اس کا نام جزیہ اور خراج رکھا گیا، اور یہ اس کے حفظ جان ومال کا معاوضہ ہے تاکہ وہ معاملات اور معاشرت میں

مسلمان کے برابر ہو کر رہیں، غیر مسلم کے مال سے جو ٹیکس لیا جاتا ہے وہ جزیہ کہلاتا ہے، اور محاصل زمین سے جو کچھ لیا جاتا ہے وہ خراج کہلاتا ہے۔ زکوٰۃ وعشر میں چونکہ ایک قسم کی عبادت کو دخل ہے لہٰذا اس کا مصرف اور ہے، اور غیر مسلموں سے ان کے جان ومال کے تحفظ کے لیے لیا جاتا ہے، لہٰذا اس کا مصرف اور ہے۔ البتہ بعض صورتوں میں مسلمان سے بھی خراج لیا جاتا ہے یعنی جو زمین ایک مرتبہ خراجی ہوگئی وہ مسلمان کے قبضہ میں جانے کے بعد بھی خراجی ہی رہتی ہے۔

اسلام کی انہی تعلیمات کی روشنی میں سیدنا عمر ﷺ نے اپنی ذمی رعایا کو وہ سب حقوق دیئے جو اسلام نے انہیں دیئے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اس زمانہ میں روم وفارس کی حکومتوں میں نہ تو آتش پرستوں کو وہ حقوق دیئے گئے تھے اور نہ ہی بازنطینی سلطنت میں عیسائیوں کو وہ حقوق حاصل تھے حالانکہ وہ رومیوں کے ہم مذہب تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مصر کی فتح کے وقت قبطی باوجود عیسائی ہونے کے مسلمانوں کے بہی خواہ تھے کیونکہ جو حقوق انہیں مسلمانوں نے دیئے تھے وہ قیصر روم نے نہیں دیئے تھے۔ یہودیوں کا حال عیسائیوں سے بھی بدتر تھا۔ وہ ہر قسم کے انسانی حق سے محروم تھے۔ فارس میں جو عیسائی تھے ان کی حالت اور بھی قابل رحم تھی، چنانچہ اسلامی حکومت نے غیر مسلموں کے ساتھ جو معاہدات کیے ان سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی غیر مسلم رعایا کو کیا کیا حقوق دیئے، بیت المقدس کا جو معاہدہ سیدنا عمر ﷺ کی موجودگی میں ہوا جس پر بطور گواہان سیدنا خالد بن ولید ﷺ، سیدنا عمرو بن العاص ﷺ، سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف ﷺ اور سیدنا معاویہ بن ابی سفیان ﷺ کے دستخط تھے، اس معاہدہ میں صاف طور پر لکھا گیا کہ عیسائیوں کے جان ومال اور مذہب ہر طرح سے محفوظ ہوں گے۔ ان کے گرجے نہ تو توڑے جائیں گے اور نہ ہی ان کی عمارتوں کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچایا جائے گا، اور نہ ان کے احاطوں میں دست اندازی کی جائے گی۔ یونانی باوجود اس کے کہ مسلمانوں سے لڑے تھے اور دراصل مسلمانوں کے حقیقی دشمن وہی تھے، ان کے جان ومال کو بھی پورا پورا تحفظ دیا گیا، اور ان کے گرجوں اور معبودوں سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بیت المقدس کے عیسائی اگر وطن سے نکل کر رومیوں سے جاملیں تو اس پر بھی ان سے

کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ (طبری ۳:۲۰۰۰) کیا کوئی حکومت ملک کے مفتوحہ باشندوں کو اس طرح کا انصاف مہیا کر سکتی ہے؟“

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ذمیوں کی جان و مال کو مسلمانوں کی جان و مال کے برابر قرار دیا اور یہی اسلامی تعلیم ہے۔ چنانچہ اگر کسی مسلمان نے کسی ذمی کو قتل کر دیا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے بدلہ میں مسلمان کو قتل کرانے سے بھی دریغ نہ کیا۔ امام شافعیؒ نے روایت کی ہے کہ قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر دیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو جب پتہ چلا تو آپ نے لکھ بھیجا کہ قاتل قصاص کے لیے مقتول کے وارثوں کو دے دیا جائے۔ چنانچہ وہ مقتول کے وارث حنین نامی کو دے دیا گیا اور اس نے اس کو قصاص میں قتل کر دیا۔ (الدرایہ فی تخریج الہدایہ ص ۳۶۰)

مال اور جائیداد کو بھی پورا پورا تحفظ دیا، اور جس قدر زمینیں غیر مسلموں کے قبضہ میں تھیں، ان کو اسی حیثیت سے بحال رکھا گیا جس حیثیت سے وہ فتح سے پہلے تھیں، یہاں تک کہ مسلمانوں کو ان زمینوں کا خریدنا بھی خلاف قانون قرار دے دیا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے شام کی فتح کے بعد سیدنا ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو جو فرمان لکھا، اس میں فرمایا:

”مسلمانوں کو منع کرنا کہ وہ ذمیوں پر کسی قسم کا ظلم نہ کرنے پائیں، نہ ان کو کوئی نقصان پہنچائیں، اور نہ ان کا مال بے وجہ کھائیں، اور جس قدر شرائط آپ نے ان سے طے کی ہیں ان سب کو پورا کیا جائے۔“

(کتاب الخراج لابی یوسف: ص ۸۲)

ایک مرتبہ شام کے ایک ذمی کاشتکار نے یہ شکایت بارگاہ خلافت میں کی کہ مسلمان فوج نے اس کی زراعت کو پامال کر دیا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو بیت المال سے دس ہزار درہم بطور معاوضہ دلوائے اور تمام اضلاع کے حکام کو ایک گشتی مراسلہ (سرکلر) جاری فرمایا کہ ذمیوں پر کسی قسم کی کوئی زیادتی نہ ہونے پائے۔ اسی طرح امام ابو یوسفؒ ہی نے ایک اور روایت نقل کی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جب شام سے واپس تشریف لا رہے تھے تو چند آدمیوں کو دیکھا کہ دھوپ میں کھڑے ہیں اور ان کے سر پر تیل ڈالا جا رہا

ہے۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا: کیا ماجرا ہے؟ جواب دیا کہ ان لوگوں نے جزیہ ادا نہیں کیا، اس لیے ان کو سزا کے طور پر دھوپ میں کھڑا کیا گیا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ جزیہ دینے میں ان کا عذر کیا ہے؟ جواب دیا گیا: ''مفلسی اور ناداری۔'' آپ نے حکم دیا کہ ان سب کو فوری طور پر چھوڑ دو اور ان کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ دو کیونکہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ سے سنا ہے کہ ''لوگوں کو تکلیف نہ دو، جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان کو عذاب دے گا۔'' (کتاب الخراج: ص ۱۲۵)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو ذمیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ ان سے کیے گئے عہد کی پابندی کی جائے اور ان کا دفاع کیا جائے، اور ان پر ان کی برداشت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے۔

امام بخاریؒ نے آپ کی اس وصیت کو جو آپ نے اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو کی تھی، ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

''میں ان لوگوں کے حق میں وصیت کرتا ہوں جن کو اللہ اور رسول ﷺ کا ذمہ دیا گیا ہے (یعنی ذمی) کہ ان سے جو عہد کیا گیا ہے اس کو پورا کیا جائے اور ان کی حمایت میں لڑا جائے اور ان کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے۔'' (بخاری: ۱/۱۸۷)

غیر مسلموں سے خراج وغیرہ لینے کے لیے مال گذاری کا جو بندوبست سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کروایا تھا، اس میں نہایت نرمی اختیار کی گئی تا کہ کسی پر کوئی زیادتی نہ ہو، لیکن اس کے باوجود آپ کو یہ خیال ہر وقت پریشان کرتا تھا کہ کہیں ان پر زیادتی تو نہیں کی گئی۔ چنانچہ جب آپ اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے، اس وقت بھی ذمیوں کا یہ خیال آپ کے ذہن میں اضطراب پیدا کر رہا تھا، حالانکہ آپ کا ہر سال یہ معمول تھا کہ جب عراق کا خراج آتا تو دس اشخاص کوفہ سے اور دس بصرہ سے طلب کیے جاتے تھے، اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ان سے چار مرتبہ تاکید کے ساتھ قسم لیتے تھے کہ مال گذاری کے وصول کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی سختی تو نہیں کی گئی۔ (کتاب الخراج لابی یوسف: ص ۶۵)

شہادت سے دو تین روز قبل کا واقعہ ہے کہ تمام افسران بندوبست کو بلایا اور مال

گزاری کی تشخیص کے بارے میں ان سے گفتگو کی گئی۔ دوران گفتگو ان سے بار بار پوچھتے رہے کہ آپ لوگوں نے ان سے بندوبست مال گزاری میں سختی تو نہیں کی۔ (الخراج: ص ۲۱)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ملکی انتظامات میں بھی ذمیوں اور غیر مسلم رعایا سے مشورہ لیتے رہتے تھے، گویا ملکی انتظامات میں آپ نے انہیں اپنے ساتھ شریک کیا ہوا تھا، خصوصی طور پر ان معاملات میں جن کا تعلق ذمیوں سے ہوتا تھا۔ آپ ان کو اکثر و بیشتر ذمیوں ہی کے مشورے اور استصواب سے طے فرماتے۔ چنانچہ مصر کی فتح کے بعد وہاں جو انتظام کیا گیا اس میں اکثر مقوقس سے رائے لی اور عراق کا بندوبست مال گذاری کرتے وقت بھی رئیسوں کو مدینہ منورہ بلا کر ان سے مال گذاری کے حالات دریافت فرمائے اور مال گذاری کرنے والے کے رویہ کے بارے میں بھی پوچھا۔ (مقریزی: ۱/۷۵)

فاتح قوم کا رویہ مفتوح قوم سے اکثر درست نہیں ہوتا۔ مفتوح قوم کی عزت و ناموس کو اکثر مجروح کیا جاتا ہے، اور اپنی برتری اور تحکم کا اظہار کیا جاتا ہے، اور قرآن حکیم کے بقول "وجعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ" عزت داروں کو ذلیل و خوار کر کے رکھ دیا جاتا ہے لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ذمیوں کی عزت و آبرو کا اسی طرح خیال رکھا جس طرح ایک مسلمان کی عزت و آبرو کا خیال رکھا تھا۔ کسی ذمی اور غیر مسلم کے بارے میں کسی قسم کی تحقیر و توہین کا لفظ استعمال کرنا بھی نہایت ناپسندیدہ خیال کیا جاتا تھا۔ ان کے بڑوں کی تکریم اور چھوٹوں پر اسی طرح شفقت کی جاتی تھی جس طرح مسلمانوں کی کی جاتی تھی۔ سیدنا عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ جو حمص کے گورنر تھے، نہایت نیک و پارسا تھے اور زہد و تقدس میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔ ایک مرتبہ کسی ذمی کے بارے میں ان کے منہ سے یہ لفظ نکل گیا: "اخزک اللہ" یعنی اللہ تمہیں رسوا کرے۔ لفظ تو غیر شعوری طور پر ان کے منہ سے نکل گیا لیکن اس کے بعد ان کو اس قدر ندامت ہوئی کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر حمص کی گورنری سے استعفیٰ دے دیا، اور بارگاہ خلافت میں کہا کہ اس نوکری کی بدولت مجھ سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہے لہٰذا میں اس کو چھوڑتا ہوں۔

(ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء: ۲/۲۰۳)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مملکت اسلامیہ کے تمام ذمیوں کو مذہبی معاملات میں پوری

پوری آزادی دی ہوئی تھی اور اپنی تمام مذہبی رسوم ادا کرنے میں انہیں نہ تو کوئی خوف تھا اور نہ جھجک۔ اعلانیہ ناقوس بجاتے، صلیب نکالتے اور ہر قسم کے میلوں میں جن کا تعلق ان کے مذہب سے ہوتا تھا، ان کو ان میں شامل ہونے کی پوری پوری آزادی تھی۔ اسی وجہ سے تو غیر مسلم ہمیشہ مسلمانوں کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے تمام ذمیوں کے مذہبی لیڈروں کے تمام اختیارات کو جو انہیں حاصل تھے، باقی رکھا۔ چنانچہ مصر میں اسکندریہ کا پیٹریارک بنیامین جو تیرہ برس تک رومیوں کے ڈر سے ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا، سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے جب مصر فتح کیا تو اس کو اسکندریہ بلا لیا۔ مؤرخین نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ مصر اور اسکندریہ کی فتح کے بعد سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے فسطاط (موجودہ قاہرہ) میں قیام فرمایا تو انہوں نے عقیدے کی آزادی کو اپنی پالیسی کا سنگ بنیاد بنایا۔ چنانچہ جب قبطی راہبوں کو آپ کی پالیسی کا علم ہوا اور اس کی صحت وصداقت میں انہیں کوئی شک وشبہ نہ رہا، تو ان کی ایک بہت بڑی تعداد کلیساؤں سے نکل کر جہاں استبداد کے زمانہ میں انہوں نے پناہ لے رکھی تھی، اطاعت کا اعلان کرتی ہوئی سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی طرف دوڑی۔ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بخوبی جانتے تھے کہ قبطیوں کو اسقف پیٹریارک بنیامین سے غیر معمولی محبت اور تعلق ہے، اور جب سے اس نے صعید کے دور دراز علاقے کی طرف بھاگ کر صحرا میں پناہ لے رکھی ہے، قبطیوں کی اس محبت اور اس تعلق میں اور بھی شدت پیدا ہوگئی ہے۔ اس لیے ان کی خواہش تھی کہ بنیامین اپنے مذہبی منصب پر واپس آجائے۔ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے تمام قبطیوں کو امان دے دی اور اسقف بنیامین کے بارے میں خاص طور پر فرمایا کہ بوڑھے بطریق کو اپنی اور ان قبطیوں کی جان محفوظ سمجھتے ہوئے واپس آجانا چاہیے، جو مصر یا غیر مصر میں آباد ہیں، انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور نہ ہی ان سے عہد شکنی کی جائے گی۔ بنیامین کو عرب فاتح کے اس عہد کی اطلاع ملی تو وہ صحرائی مامن سے نکل کر اسکندریہ کی طرف روانہ ہوا۔ اسکندریہ میں قبطیوں نے ایک ظفر مند کی حیثیت سے اس کا استقبال کیا۔ ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور یہ خوشی ہر خوف اور ہر تکدر سے پاک تھی۔

جب پیٹریارک بنیامین اپنے پیروؤں میں اطمینان سے رہنے لگا تو سیدنا

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ایک روز اسے بلایا اور اس کے ساتھ نہایت عزت و تکریم کے ساتھ پیش آئے کیونکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ "اذا جاء کریم قوم فاکرموہ" یعنی جب کسی قوم کا کوئی بڑا شخص آئے تو اس کی عزت و تکریم کرو، بنیامین نے ان سے گفتگو کی۔ وقار اور تحمل کے ساتھ ساتھ ان کے لہجے میں بڑی نرمی اور شیرینی تھی۔ سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے دل پر اس کی گفتگو کا بڑا اثر ہوا، اور انہوں نے قبطیوں کی مذہبی سیادت پیٹریارک بنیامین کے سپرد کر دی کہ وہ جس طرح چاہے ان کی مذہبی راہنمائی کرے۔ قبطی بطریق بنیامین بھی مسلمان فاتح کے حضور سے انتہائی مسرور اور مطمئن واپس ہوا، اور اسکندریہ پہنچ کر اس نے سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے گن گانے شروع کر دیئے۔ وہ اپنے عقیدت مندوں سے کہتا تھا: "میں اپنے شہر اسکندریہ واپس آیا اور دیکھا کہ یہاں ہر طرح کا امن و امان ہے۔ اللہ نے کافروں کے جبر و استبداد کی لعنت ہمارے سروں سے دور کر دی ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا بنیامین کے جذبات تشکر و امتنان میں اضافہ ہوتا گیا۔ آخر کار تمام قبطی اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور اپنی مذہبی رسومات بے کھٹکے ادا کرنے لگے۔ بنیامین نے ان کے کلیساؤں کی اصلاح اور ان کی عبادت گاہوں کا دورہ کیا۔ وہ جہاں کہیں جاتا عقیدت مندوں کا ہجوم کھجور کی چھڑیاں اور عود دان ہاتھ میں لیے ایک جلوس کی صورت میں اس کے ساتھ ہوتا۔ حنا تقوی مسلمانوں سے بغض رکھنے کے باوجود بھی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ "رومی سرزمین مصر سے اس لیے نکالے گئے اور مسلمان ان پر اس لیے فتح یاب ہوئے کہ ہرقل نے انسانیت سوز گناہوں کا ارتکاب کیا اور قبطیوں اور ان کے مذہب پر بے انتہا ظلم ڈھائے تھے۔ مصر میں رومیوں کی ناکامی اور مسلمانوں کی کامرانی کا یہی سبب ہے۔"

جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا کہ اسقف بنیامین اپنی قوم میں بڑی حیثیت و منزلت رکھتا ہے تو انہوں نے سیدنا عمرو بن عاص کو لکھا کہ وہ مصر کی حکومت اور اس کے باشندوں کی آسائش کے لیے قبطیوں کے اس بطریق کی رائے سے فائدہ اٹھائیں۔ بنیامین نے بھی مشورہ دینے میں بخل سے کام نہ لیا۔ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اس کا کھویا ہوا سارا اثر و نفوذ اسے بخش دیا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مقریزی: ۱/۴۹۲)

سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ گورنر مصر نے غیر فوجی مناصب اکثر و بیشتر رومیوں ہی کے پاس رہنے دیے جو فتح مصر سے قبل اپنی حکومت کی طرف سے ان عہدوں پر مامور کیے گئے تھے، اور جنہوں نے اسلامی اقتدار کے بعد بھی اپنے ملک واپس جانے کے بجائے مصر ہی میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ ان میں سے کئی رومیوں نے اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔ اسی طرح سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے میناس کو زیریں مصر کا حاکم مقرر کیا جہاں وہ ہرقل کے زمانے میں حکمران تھا، اور اس کے دوسرے ابنائے جنس کو بعض اور علاقوں کی حکومت تفویض کی، جو عہدے ذرا کم حیثیت کے تھے وہ بھی قبطیوں کو دیے۔ البتہ جن رومی عہدہ داروں نے اجنبی حکومت کی رعایا بننا گوارہ نہ کیا اور سرزمین مصر کو چھوڑ کر چلے گئے ان کی جگہ قبطیوں کو دے دی گئی۔ اور یہ سب عہدے ذمیوں کو دیے گئے۔

مختصر یہ کہ غیر مسلموں کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی حکومت میں مذہبی معاملات میں پوری پوری آزادی تھی اور پیٹریارک بنیامین کو اسکندریہ کی جو کرسی دوبارہ نصیب ہوئی وہ بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی غیر مسلموں کے لیے پالیسی کا نتیجہ تھی۔

یہ تو صرف مصر کا معاملہ ہے۔ آپ ان تمام معاہدات کو ایک نظر دیکھ لیں جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مفتوحہ علاقوں کے لوگوں سے ساتھ کیے گئے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ ہر معاہدہ میں یہ فقرہ موجود تھا کہ ”نہ تو ان کا مذہب بدلا جائے گا اور نہ ہی ان کے مذہبی معاملات میں کوئی مداخلت کی جائے گی۔“ چنانچہ بیت المقدس کے معاہدہ میں بھی یہ الفاظ مذکور ہیں۔ ایسے ہی جرجان، آذربائیجان، لوقان اور دوسرے شہروں کے معاہدات میں صاف طور پر لکھا گیا تھا کہ ”ان کی جان و مال، مذہب اور شریعت کو امان ہے (الامان علی اموالهم وانفسهم وملتهم وشرائعهم) اگرچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اشاعت اسلام کے لیے نہایت کوشاں تھے، لیکن وعظ و پند کے ذریعے نہ کہ جبر و استبداد کے ذریعے، کیونکہ اسلام کا حکم ہے ”لا اکراہ فی الدین“ اور اسلام کے حکم کے سامنے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی گردن فوری طور پر خم ہو جاتی تھی۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ملکی حقوق کے لحاظ سے ذمیوں اور مسلمانوں میں کوئی تمیز نہیں رکھی تھی۔ کوئی مسلمان اگر کسی ذمی کو قتل کرتا تو مسلمان سے

ورنہ اس کے قصاص میں قتل کر دیا جاتا، مسلمان والنٹیروں کو گھر بیٹھے جو تنخواہ ملتی تھی، ذمی بھی اس میں برابر کے شریک ہوتے۔ بیت المال سے مسلمانوں کو جو رعایت ملتی وہی رعایت ایک ذمی کو بھی ملتی تھی۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حیرہ کی فتح میں اہل شہر کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا، اس میں یہ الفاظ تھے:

"اور میں نے ان کو یہ حق دیا کہ اگر کوئی بوڑھا شخص کام کرنے سے معذور ہو جائے یا اس پر کوئی مصیبت آ جائے، یا وہ پہلے دولت مند تھا پھر غریب اور قلاش ہو گیا اور اس وجہ سے اس کے ہم مذہب اس کو خیرات دینے لگیں تو اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے گا، اور اس کو اور اس کے اہل و عیال کو مسلمانوں کے بیت المال سے نفقہ دیا جائے گا جب تک وہ دارالاسلام میں رہے، لیکن اگر وہ مسلمانوں کا ملک چھوڑ کر دوسرے ملک چلا گیا تو پھر مسلمانوں پر اس کا نفقہ واجب نہ ہوگا۔" (کتاب الخراج لابی یوسف۔ص ۸۵)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے عہد خلافت میں اس اصول کو اپنائے رکھا۔ چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے یہودی کو بھیک مانگتے دیکھا اور جب آپ کو پتہ چلا کہ وہ جزیہ ادا کرنے کے لیے بھیک مانگ رہا ہے تو آپ نے نہ صرف اس کا بلکہ اس جیسے تمام معذوروں کا بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا اور جزیہ معاف کر دیا، اور یہ بھی فرمایا:

"بخدا! یہ بات عدل و انصاف کے منافی ہے کہ ان لوگوں کی جوانی سے تو ہم فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں ان کو نکال دیں۔" (کتاب الخراج ص ۱۵۰۔۱۵۱)

تاریخ کے اوراق اس بات کی بھرپور شہادت دیتے ہیں کہ مسلمانوں نے ذمیوں کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک کیا اور ان کو وہی مراعات دیں جو وہ مسلمانوں کو دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ذمیوں نے بھی ہر موقع پر خود اپنی ہم مذہب حکومتوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مدد کی یہاں تک کہ جاسوسی بھی کی۔ مسلمان لشکروں کی خوراک اور رسد مہیا کرنے اور دوسرے کئی طریقوں سے مدد کی۔ ہر قسم کے راز مسلمانوں تک پہنچائے اور تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ جنگ یرموک میں شرکت کے لیے جب مسلمانوں کو

انطاکیہ جاتا تھا تو تمام مفتوحہ علاقوں کے امراء اور روساء مسلمانوں کے عدل و انصاف سے اس قدر گرویدہ ہو گئے تھے کہ باوجود مخالف مذہب کے انہوں نے عیسائیوں کی خبر لانے کے لیے جاسوس مقرر کر رکھے تھے، چنانچہ سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو انہی جاسوسوں کی وجہ سے تمام واقعات کی اطلاع ہوئی۔ آپ نے اس بارے میں اپنے افسروں سے مشورہ طلب کیا۔ مختلف افسروں نے مختلف مشورے دیئے۔ ایک تجویز کے جواب میں سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''ہم عیسائیوں کو شہر سے باہر نکال دیں۔'' اس پر سیدنا شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر کہا: ''اے امیر! آپ کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں۔ ہم نے ان عیسائیوں کو اس شرط پر امن دیا ہے کہ وہ شہر میں اطمینان سے رہیں، اس لیے نقضِ عہد کیوں کر ہو سکتا ہے؟'' سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ بالآخر یہ رائے ٹھہری کہ حمص کو چھوڑ کر دمشق روانہ ہوں، وہاں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ موجود ہیں، اور عرب کی سرحد قریب ہے۔ جب یہ بات متفقہ طور پر طے ہو چکی تو سپہ سالار لشکر اسلامی سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے افسر خزانہ سیدنا حبیب بن مسلم رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ عیسائیوں سے جو جزیہ یا خراج لیا جاتا ہے، وہ ان کی حفاظت کا ٹیکس ہوتا ہے۔ اس وقت ہماری حالت ایسی نازک ہے کہ ہم ان کی حفاظت کا ذمہ نہیں اٹھا سکتے، لہٰذا جو کچھ ان سے ہم نے لیا ہے سب ان کو واپس کر دو اور ان سے کہہ دو کہ ''ہم کو تمہارے ساتھ جو تعلق تھا وہ اب بھی ہے لیکن چونکہ اس وقت ہم تمہاری حفاظت کی ذمہ داری نہیں لے سکتے، اس لیے جزیہ یا خراج جو حفاظت کا معاوضہ ہے تم لوگوں کو واپس کیا جاتا ہے۔'' چنانچہ کئی لاکھ کی رقم جو وصول ہوئی تھی، ساری کی ساری واپس کر دی گئی۔ یہ دنیا میں پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ فاتح قوم نے مفتوح قوم سے لی ہوئی رقم واپس کی۔ عیسائیوں کے حاشیۂ خیال میں بھی ایسا ممکن نہیں تھا۔ انہیں قیصر روم کا جور و ستم اور جبر و استبداد جو ٹیکسوں کی فراہمی کے بارے میں تھا، بخوبی یاد تھا، لہٰذا ان پر اس واقعہ کا اس قدر اثر ہوا کہ وہ روتے جاتے تھے اور جوش و جذبہ کے ساتھ کہتے جاتے تھے کہ ''خدا تم لوگوں کو جلد واپس لائے۔'' یہودیوں پر اس سے بھی زیادہ اثر ہوا۔ انہوں نے کہا ''تورات کی قسم! جب تک ہم زندہ ہیں قیصر حمص پر قبضہ نہیں کر سکتا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے شہر پناہ کے دروازے بند کر دیئے اور ہر جگہ چوکی پہرہ بٹھا دیا۔ سیدنا ابو

عبیدہؓ نے صرف حمص والوں کے ساتھ ہی یہ برتاؤ نہیں کیا تھا، بلکہ جس قدر اضلاع فتح ہو چکے تھے اور انہیں فوجی Strategy کے تحت خالی کرنا پڑا، ان سب کی جزیہ کی رقم جس قدر وصول ہوئی تھی ساری کی ساری واپس کر دی۔

(فتوح البلدان ص ۱۳۷، کتاب الخراج لابی یوسف ص ۸۱، فتوح الشام ص ۱۳۸)

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں ذمیوں سے حسن سلوک:

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد خلافت میں بھی ذمیوں سے عدل و انصاف اور مساوات کا برتاؤ ہوتا رہا۔ انہوں نے مسلمانوں کی طرح ذمیوں کی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت کی اور ان کے مذہبی معاملات میں کسی قسم کی کوئی دخل اندازی نہیں کی۔ جزیہ اور خراج کی وصولی میں ان کے ساتھ وہی نرمی اور آسانی برتی جو سیدنا عمرؓ نے برتی تھی، اور شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے اپنے عہد خلافت میں سیدنا سالم بن عبداللہ بن عمرؓ کو خط لکھا تھا کہ مجھے صدقات وغیرہ کے بارے میں سیدنا عمرؓ کا طریقہ لکھ کر ارسال فرمائیں۔ انہوں نے صدقات اور حکومت کے بارے میں سیدنا عمرؓ کا طرز عمل تو انہیں لکھ دیا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اگر آپ اپنے زمانہ میں سیدنا عمرؓ کی حکومت کی طرح حکمرانی کے فرائض انجام دے دیں تو آپ ان سے بڑھ جائیں گے کیونکہ نہ آپ کا زمانہ سیدنا عمرؓ کے زمانے کی طرح کا ہے اور نہ ہی آپ کی رعایا سیدنا عمرؓ کی رعایا کی طرح ہے۔'' (تاریخ الخلفاء ص ۲۳۱)

آپ نے اپنے زمانے کے مختلف گورنروں اور کارکنان حکومت کو لکھا کہ کوئی شخص ذمیوں پر کسی قسم کی کوئی زیادتی نہ کرے اور ان کے حقوق کا اسی طرح تحفظ کرے جس طرح مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ آپ نے ذمی کے خون کی وہی قیمت قرار دی جو مسلمانوں کے خون کی تھی۔ ایک دفعہ حیرہ میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا۔ آپ کو پتہ چلا تو آپ نے وہاں کے گورنر کو لکھا کہ قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ چاہیں تو قتل کریں، چاہیں تو معاف کر دیں۔ گورنر نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا، اور ذمیوں نے اسے قصاص

میں قتل کر دیا۔ (نصب الرایہ: ۳/۳۶۰)

یہ صرف ایک اسلامی ریاست کا خاصہ ہے ورنہ اور کسی ریاست میں ایسا نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ آپ نے عدی بن ارطاۃ کو لکھا کہ ذمیوں کے ساتھ نرمی اور حسن سلوک کا برتاؤ کرو۔ ان میں جو بوڑھا یا نادار ہو جائے کفالت عامہ کے تحت اس کی گذران دو، اور اگر اس کا کوئی رشتہ دار ہو تو اسے اس کی کفالت کا حکم دو۔ جس طرح تمہارا کوئی غلام بوڑھا ہو جائے یا بڑھاپے نے اسے معذور کر دیا ہو تو اسے آزاد کرنا پڑے گا یا پھر مرتے دم تک اس کی کفالت کرنی پڑے گی۔ (طبقات ابن سعد: ۵/۲۸۰)

شاہی خاندان سے جب آپ نے مسلمانوں کی غصب شدہ املاک چھین کر اصل مالکوں کو واپس کیں تو اس وقت ذمیوں کے مغصوبہ زمینیں بھی واپس دلائیں۔ اس سلسلہ میں ایک ذمی نے دعویٰ دائر کیا کہ عباس بن ولید نے جو شاہی خاندان کا چشم و چراغ ہے، میری زمین پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے عباس سے جواب دعویٰ کے لیے کہا۔ اس نے کہا کہ یہ زمین مجھے ولید نے جاگیر میں دی ہے اور میرے پاس اس کی دستاویز موجود ہے۔ ذمی نے اپنے دعویٰ کا جواب سن کر کہا: ''امیرالمومنین! میں آپ سے کتاب کے مطابق اس کا فیصلہ چاہتا ہوں۔'' آپ نے فرمایا: ''کتاب اللہ ولید کی سند پر مقدم ہے۔'' چنانچہ عباس بن ولید سے زمین چھین کر ذمی کو واپس لوٹا دی۔'' (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز: ص۱۰۴، لابن جوزی، البدایہ والنہایہ: ۹/۲۱۳)

آپ کا حکم تھا کہ کوئی مسلمان کسی ذمی کے مال پر دست درازی نہ کرے، چنانچہ اس ہدایت کے اثرات تھے کہ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کے مال، زمین اور عزت و آبرو پر دست درازی نہ کر سکتا تھا۔ جو ایسا کرتا اس کو قرار واقعی سزا ملتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک مسلمان ربیعہ شودی نے ایک سرکاری ضرورت کے تحت ایک نبطی کا گھوڑا بیگار میں پکڑ لیا اور اس پر سواری کی۔ یہ ایک معمولی بات تھی۔ آپ سے پہلے بھی ایسا ہو جاتا تھا۔ آج بھی گھوڑے کیا عوام کی بسیں اور کاریں اپنے جلسوں کی رونق بڑھانے کے لیے بیگار میں پکڑی جاتی ہیں اور ان کو کئی کئی روز تک استعمال میں لایا جاتا ہے۔ عوام روتے

رہتے ہیں اور حکومت کے کارندوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ کیونکہ سرکاری عہدے داروں کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ بہرے ہوتے ہیں عوام کے رونے اور چلانے کی آواز انہیں سنائی نہیں دیتی۔ وہ "یک چشم" بھی ہوتے ہیں کہ انہیں صرف اپنا آپ دکھائی دیتا ہے عوام دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ کو جب اس بات کا پتہ چلا تو اس عہدے دار کو چالیس کوڑے لگوائے تاکہ دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو۔

(طبقات ابن سعد ۵: ۲۷۰)

تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے عہد خلافت میں ذمیوں کے ساتھ اتنی نرمی برتی گئی کہ اس کی عام لوگوں کو کئی نقصانات اٹھانے پڑے۔ آپ کے عہد خلافت میں غلہ کا نرخ گراں ہو گیا۔ ایک شخص نے آپ سے گرانی کا سبب پوچھا فرمایا "پہلے خلفاء ذمیوں کو جزیہ کی وصولی میں تکالیف دیتے تھے، اس لیے وہ جس نرخ پر بھی ہو سکتا غلہ فروخت کر دیتے تھے، اور میں ہر شخص کو صرف اتنی تکلیف دیتا ہوں جس کو وہ برداشت کر سکے، اس لیے اب ہر ذمی جس طرح چاہتا ہے فروخت کرتا ہے۔

(کتاب الخراج ابی یوسف۔ ص ۷۶)

عمر بن عبدالعزیز کا محبت واحترام کی بنیاد پر ذمیوں سے سلوک کرنا اسلام کے اصولوں کے عین مطابق تھا، اور آپ سے ان کے حسن سلوک کی بنیادیں محبت واحترام پر اٹھائی گئی تھیں۔ (تاریخ الشعوب الاسلامیہ ۱: ۱۹۲)

آپ کو یہ بات پسند تھی کہ غیر مسلم اور ذمی ایک اسلامی حکومت میں رہ کر اپنے آپ کو بالکل محفوظ و مامون سمجھیں۔ حجاج بن یوسف ثقفی نے اہل ذمہ پر بڑی سختی کی ہوئی تھی۔ اس نے یہ قانون بنایا ہوا تھا کہ وہ ذمیوں کے غلہ کے گوداموں کو مہر لگوا دیتا تھا اور اس وقت تک نہیں کھولتا تھا جب تک وہ جزیہ ادا نہ کر دے۔ لیکن سیدنا عمر بن عبدالعزیز کو یہ بات ناپسند تھی۔ وہ کسی صورت نہیں چاہتے تھے کہ ذمیوں کے وقار اور احترام کو ٹھیس لگے۔

اہل ذمہ کے ساتھ اس حسن سلوک کو دیکھ کر کئی شہروں کے والی آپ کی اجازت کے بغیر ہی اہل ذمہ سے مظالم کو رفع کر دیا کرتے تھے، چنانچہ ایک روز آپ نے

کوتوال شہر عمرو بن مہاجر کو بلوایا۔ لیکن وہ موجود نہ تھا۔ پھر جب وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اس سے پوچھا: "کہاں تھے؟" اس نے جواب دیا: میں اہل کتاب کے مظالم رفع کرنے کے لیے باہر گیا ہوا تھا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کا یہ عذر سن کر اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم ص ۹۲)

عمر بن عبدالعزیزؒ اپنے گورنروں کو ہر وقت یہی تلقین کرتے رہتے تھے کہ ذمیوں کو تمہارے ہاتھوں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ چنانچہ آپ نے عبدالرحمٰن بن نعیم کو لکھا کہ جس گرجا گھر، آتش کدہ یا عبادت خانہ پر تم سے صلح کر لی گئی ہے اس کو ہرگز منہدم نہ کرو۔ (طبری: ۵/۳۶۴)

اور ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ جب بنوامیہ کے امراء نے سیاحت کا ارادہ کیا تو آپ نے ان سے یہ عہد لیا کہ وہ ذمیوں کو نہیں ستائیں گے اور نہ قوم کے کسی شخص کو تنگ کریں گے۔ (سیرۃ ابن جوزی: ص ۷۷)

عمر بن عبدالعزیزؒ ایک نہایت دین دار اور پابند شریعت شخص تھے۔ اس وجہ سے ان کی نگاہ سے یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ دنیا میں عبادت خانوں کا باقی رہنا لوگوں کے لیے باعث صلاح و فلاح ہے۔ وہ عبادت خانے خواہ کسی دین و ملت کے ہوں کیونکہ کوئی مذہب بھی لوگوں کو بداخلاقی اور بدتہذیبی نہیں سکھاتا بلکہ عبادت خانوں ہی میں جا کر لوگوں کو اخلاق اور ان کی تہذیب میں حسن اور نکھار پیدا ہوتا ہے، اور ان کی معاشرت درست ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ دو خارجیوں نے آ کر آپ سے ذمیوں کے بارے میں استفسار کیا کہ انہیں طاقت سے زیادہ تکلیف دی جا سکتی ہے؟" آپ نے جواب میں فرمایا: "کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت کے اندر تکلیف دیتا ہے تو ہم کون ہیں جو ان کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف دیں؟"

انہوں نے پھر پوچھا گیا کہ اگر اہل ذمہ کے عبادت خانے یعنی گرجے وغیرہ ڈھا دیے جائیں تو کیا حرج ہے؟ سیدنا عمرؓ نے فرمایا: "ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔" اس نے بہت اصرار کیا لیکن آپ نے اس کی یہ بات ہرگز نہیں مانی۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم: ص ۱۷۳)

گزشتہ خلفاء نے ذمیوں کے مذہبی حقوق بھی پامال کیے ہوئے تھے۔ آپ نے

ان حقوق کو از سر نو قائم کیا۔ چنانچہ دمشق میں ایک گرجا عرصہ سے مسلمان خاندان کی جاگیر میں چلا آ رہا تھا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ جب مسند نشین خلافت ہوئے تو عیسائیوں نے ان کے پاس اس کا دعویٰ کیا۔ آپ نے فوری طور پر اس کو واپس دلا دیا۔ ایک مسلمان نے ایک گرجے کی بابت یہ دعویٰ کیا کہ وہ اس کی ملکیت ہے۔ سیدنا عمر ثانیؒ نے فرمایا: "اگر یہ عیسائیوں کے معاہدہ میں ہے تو تم ان کو نہیں لے سکتے یہ ان کا رہے گا۔" (فتوح البلدان: ص ۱۳۰)

عمر بن عبدالعزیز ذمیوں کو نہ صرف عام مسلمانوں کے برابر سمجھتے تھے بلکہ شاہی خاندان جو اپنے کو دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں اعلیٰ و ارفع تصور کرنے لگے تھے، ان کے برابر سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ہشام نے غرور و تمکنت میں جو شاہی خاندان میں پیدا ہو گیا تھا۔ ایک عیسائی سے سخت کلامی کی۔ عمر بن عبدالعزیز نے اس کو ڈانٹا اور سزا دینے کی دھمکی دی یہاں تک کہ ہشام کا دماغ ٹھکانے آ گیا۔

اسلام نے صرف نظام حکومت کے اچھا ہونے پر زور نہیں دیا بلکہ اسلام نے حاکم حکومت کے اچھا ہونے پر بھی زور دیا ہے۔ اگر حاکم اچھا ہے تو نہ صرف رعایا خوش حال ہوگی، بلکہ حکومت کے محاصل میں بھی اضافہ ہوگا۔ لوگوں میں دیانت و امانت، صدق و راست بازی اور فرائض و حقوق کی ادائیگی کا جذبہ ابھرے گا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ سے پہلے کے خلفاء لوگوں سے ناجائز محاصل وصول کرتے خصوصی طور پر ذمیوں سے وصولی میں ظلم و تعدی سے کام لیتے۔ وصول کرتے وقت سختی اور تشدد کرتے۔ آپ نے ان سب چیزوں کا سدباب کر دیا۔ اب بغیر کسی سختی اور تعدی کے ٹیکس اور خراج و جزیہ وصول ہوتا اور پھر اس کے مصارف بھی کثیر ہوتے تھے۔ لیکن ان کثیر مصارف کے باوجود بیت المال کی آمدنی میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ حجاج بن یوسف کے ظالمانہ دور سے کہیں زیادہ عراق کی آمدنی تھی۔ آمدنی کے اس اضافہ کو دیکھ کر سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ حجاج پر لعنت کرے، اس کو نہ دین کا سلیقہ تھا اور نہ دنیا کا۔ اس کے ظالمانہ دور میں قومی خزانے کی آمدنی صرف دو کروڑ اسی لاکھ درہم تھی، لیکن اب اسی عراق کی آمدنی لوگوں کو اتنی سہولتیں دینے کے باوجود بارہ کروڑ چالیس لاکھ درہم ہے۔

حق ملکیت

اسلام نے انسان کی انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا ہے اور ایک انسان کو اس کا حق دیا ہے کہ وہ اپنی ملکیت میں ہر قسم کا تصرف کر سکتا ہے اور اس سے ہر قسم کا فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے۔ ملکیت کا حق زیادہ تر مال پر ہوتا ہے کیونکہ اس سے آدمی کی دنیوی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور ان کی دنیوی زندگی کا انحصار بھی مال ہی پر ہے۔ مال ہی انسان کی پانچ ضروریات میں سے ایک ہے۔ پھر قرآن نے اس کو دنیوی زینت بھی قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿المال والبنون زينة الحياة الدنيا، والباقيات الصالحات خيرٌ عند ربك ثواباً و خيرٌ املاً﴾ (الکہف:۴۶)

''مال اور بیٹے دنیا کی زندگی کی زینت ہیں اور باقی رہنے والی نیکیاں آپ کے رب کے پاس از روئے ثواب اور امید کے بہت بہتر ہیں۔''

اس آیت میں مال کی نسبت انسان کی طرف کی گئی ہے اور مال اور بیٹوں کو دنیوی زندگی کی زینت قرار دیا گیا ہے، اور جو چیز دنیا کی زندگی کی زینت ہو وہ بہت جلد زائل ہونے والی ہے۔

ایک اور آیت میں کہا گیا:

﴿انما اموالكم و اولادكم فتنة﴾ (تغابن:۱۵)

''تمہارے اموال اور تمہارے بیٹے فتنہ ہیں۔''

اور بھی کئی آیات میں اموال کی نسبت انسانوں کی طرف کر کے ان کے تملک کو ظاہر کیا گیا ہے۔

اسلام کا سارا ڈھانچہ انفرادی ملکیت پر قائم ہے۔ یہ اصول تسلیم نہ کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اسلام کے معاشی قوانین بیکار ہو کر رہ جائیں گے بلکہ دین اسلام کا ایک رکن زکوٰۃ بھی عملاً غیر ضروری قرار پائے گا۔ اسی طرح اس کا دوسرا رکن حج بھی کروڑوں افراد کے لیے عملاً ختم ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ معاشی قوانین کا عظیم الشان مسئلہ میراث بھی باقی نہ رہے گا۔ یہی نہیں بلکہ بہت سے معاشی قوانین انفرادی ملکیت کی اساس پر قائم ہیں، اسی لیے اس اصول پر الگ سے دلیل کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زکوٰۃ اور میراث کے بارے میں آیات، انفاق فی سبیل اللہ کے بارے میں آیات قرآنیہ، قرض اور خرید وفروخت سے متعلق آیات، خلع اور مسئلہ رضاعت کے احکام پر مشتمل آیات، نیز ان مسائل اور دیگر مسائل سے متعلق کثیر التعداد احادیث سب کی سب انفرادی ملکیت کے دلائل و براہین ہیں۔ اسی طرح کم ناپنے، کم تولنے کی ممانعت، چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا، غصب اور رہزنی کی سزا، کسی کا مال تلف کر دینے پر تاوان ادا کر دینے کی سزا اور اس طرح بیسیوں مسائل پر جو آیات واحادیث موجود ہیں، وہ سب انفرادی ملکیت کے دلائل و براہین ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء ورسل اور اپنی کتابوں کے واسطے سے اپنے ہر ہر بندے پر جو حقوق و فرائض عائد کیے ہیں، جن اخلاقی اقدار کو تسلیم کرنے اور ان کی نگہداشت کرنے کا پابند کیا ہے، اور جس نوع کی زندگی بسر کرنے کا مطالبہ کیا ہے، وہ اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک اس کی حاصل کی ہوئی چیزوں پر ان کے مالکانہ حقوق تسلیم نہ کیے جائیں۔

فی الواقع انفرادی ملکیت کے حق کی نفی اس نقطۂ نظر کی نفی ہے جو اسلام نے زندگی کے بارے میں عطا کیا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص یا گروہ اس نقطۂ نظر کو ماننے سے انکار کر دے، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اسے صحیح بھی تسلیم کرے۔ اس پر ایمان کا مدعی بھی ہو اور پھر انفرادی ملکیت کے حق سے انکار بھی کرے کیونکہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی اس طرح ضد ہیں جیسے سیاہی اور سفیدی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

اس بات میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی فطرت میں کچھ ایسی احتیاجات رکھ دی ہیں جن کی تسکین و تکمیل کے لیے وہ ہر وقت بے قرار رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس نے یہ احتیاجات انسان کی فطرت میں رکھیں، اس نے خارج میں ایسے وسائل اور انسان کے داخل میں ایسے قوائے علم و عمل پیدا فرما دیئے جن سے کام لے کر وہ اپنی ان احتیاجات کی تسکین و تکمیل کا سامان پیدا کرتا ہے۔ اس وجہ سے پیدائش کا عمل انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔

اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ انسان معاشی اعتبار سے آسودہ حال رہے، اور وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر وسائل کائنات سے استفادہ کرنے کے لیے جدوجہد کرے تو وہ انہیں رزق و دولت سے نوازتا ہے۔ اگر تلاش رزق کرنے والے یہ ہاتھ اہل ایمان اور اہل تقویٰ کے ہوں تو اللہ رب العزت کی رزق رسانی کی سنت کامل ترین انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

"یعنی اگر بستیوں والے ایمان اور تقویٰ کی روش پر گامزن رہتے تو ہم آسمان اور زمین کی برکات کے دروازے ان پر کھول دیتے، لیکن انہوں نے تکذیب کی (اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو جھٹلایا) پس ہم نے ان کے (برے) اعمال کی وجہ سے انہیں پکڑا۔" (الاعراف:۹۶)

اسلام علوم و فنون میں ایک مسلمان کی دلچسپی اور ترقی کرنے کو نہ صرف نظر استحسان سے دیکھتا ہے بلکہ اس پر بڑا زور دیتا ہے۔ اس جدوجہد کا ایک مقصد ایک تو معرفت الٰہی کا حصول ہے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ انسان ان وسائل و آلات تک رسائی حاصل کر لے جو زود پیداواری کا باعث بن کر اس کی نہ صرف ضروریات کو پورا کرے بلکہ اس کو احتیاجات کی لذتوں سے بھی شاد کام کرے۔ انسان کا اپنے علوم و فنون اور اپنی جسمانی اور ذہنی کدو کاوش کو ذریعہ معاش بنانا اسلام میں عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

﴿کسب الحلال فریضة بعد الفریضة﴾

"یعنی کسب حلال فرض عبادات کے بعد سب سے بڑا فریضہ ہے۔"

اس کی خاطر نماز تہجد جیسی عظیم عبادت میں بھی تخفیف کر دی گئی۔

انسان یہ ساری جدوجہد اس وجہ سے کرے گا کہ جو کچھ وہ اپنی محنت سے کمائے وہ اس کی ملکیت میں ہو۔ اگر اس کی محنت کا نتیجہ اور ثمرہ کوئی دوسرا لے جائے تو کبھی بھی وہ محنت وکاوش میں دلچسپی نہیں لے گا۔ اس وجہ سے اس نے فرد کو حق ملکیت عطا کیا ہے۔

ملکیت کی حقیقت:

ملکیت کی حقیقت جان لینے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ملکیت سے کیا مراد ہے؟ اور ملکیت کس کو کہتے ہیں؟ ملکیت سے مراد کسی مال یا شے پر کسی فرد کا قبضہ اور اس شے یا مال کو اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرنے کا حق ہے۔ علامہ مقدسی کے مطابق ملکیت انسان اور شے کے مابین وہ خصوصی تعلق ہے جو شرعاً دوسروں کے لیے اس شے یا مال سے استفادہ میں رکاوٹ اور اس انسان کے تصرف اور استعمال کے لیے وجہ جواز بنتا ہے، البتہ اگر کوئی مانع ہو تو یہ الگ بات ہے جیسے جنون وغیرہ۔ علامہ ابن نجیم نے لکھا ہے کہ "ملکیت کسی شے میں تصرف پر وہ قدرت اور حق ہے جو کسی انسان کے لیے شارع علیہ السلام کے ثابت کرنے سے ابتدائی طور پر ثابت ہے مگر یہ کہ کوئی مانع موجود نہ ہو۔

علمائے اسلام نے ملکیت کی تعریف میں اسی مفہوم کو ادا کیا ہے۔ چنانچہ قرافی نے لکھا ہے کہ:

"ملک شریعت کی طرف سے کسی چیز میں یا کسی چیز کے نفع میں ایک ایسی اجازت ہے جس کا تقاضا ہوتا ہے کہ یہ شخص جس کو یہ اجازت حاصل ہے، خاص اس چیز سے یا اس کی منفعت سے نفع حاصل کرے یا اسی حیثیت میں کہ شریعت نے اجازت دی ہو، اس چیز کا یا اس کی منفعت کا بدل لے لے۔"

(انوار البروق فی انواع الفروق: ۳/ ۲۲۴، بحوالہ الملکیت فی الاسلام سید ابی نصر احمد الحسینی)

شارح ہدایہ علامہ کمال ابن الہمام فرماتے ہیں:

"ملک تصرف کرنے کی وہ قدرت ہے جو شریعت نے بلاواسطہ ثابت کی ہو بشرطیکہ کوئی مانع نہ ہو یعنی ایسی قدرت کہ اگر کوئی شرعی (قانونی) رکاوٹ نہ ہو تو

ہر طرح کا تصرف کر سکتا ہے۔" (بحوالہ الاشباہ والنظائر: ص ۵۳۱)

تصرف کی طاقت اور قدرت وکیل کو بھی ہوتی ہے مگر بالواسطہ نہیں ہوتی بلکہ موکل کی عطا کردہ ہوتی ہے، لہٰذا وکیل کو مالک نہیں کہا جائے گا۔

ایک دیوالیہ جس کو عدالت نے نوٹس دے دیا کہ وہ کوئی شے فروخت نہیں کر سکتا، وہ اگرچہ تصرف نہیں کر سکتا مگر وہ اپنے اثاثہ کا مالک ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے مایہ ناز فیلسوف اسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے الفاظ نہایت مختصر اور واضح ہیں۔ فرماتے ہیں:

﴿معنی الملک فی حق الآدمی کونہ احق بالانتفاع من غیرہ﴾ (حجۃ اللہ البالغۃ: ۲/۹۶، ابواب ابتغاء الرزق)

"آدمی کے حق میں ملک کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کے مقابلہ میں اس کو نفع اٹھانے کا حق زیادہ ہے۔"

قاضی القضاۃ عبید اللہ بن مسعود الحنفی صاحب شرح الوقایہ نے یہ تعریف کی ہے:

"ملک انسان اور کسی چیز کے درمیان شریعت کا تجویز کردہ ایسا تعلق ہے جو اس شخص کے لیے جائز قرار دیتا ہے کہ وہ اس شے میں تصرف کرے اور دوسرے کے تصرف کو روکتا ہے۔" (وحاجزاً عن تصرف الغیر فیہ)

(شرح الوقایہ، کتاب العتاق)

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں یہ حق ملکیت انسان کو حقیقی ہے لیکن اسلام میں یہ حق ملکیت عارضی ہے کیونکہ اسلام میں کائنات کی ہر چیز کا مالک درحقیقت اللہ تعالیٰ جل شانہ ہیں۔

جیسا کہ قرآن حکیم کی مختلف آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

﴿للہ ما فی السماوات وما فی الارض﴾

"آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے۔"

اس آیت اور قرآن حکیم کی دوسری آیات کی رو سے اصل مالک تو ہر چیز کا اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کو اشیاء کے حقوق ملکیت اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں اور ان کی حیثیت

ایک مقدس امانت کی ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کا نائب اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ان اشیاء میں تصرف کا حق رکھتا ہے لیکن اس سلسلہ میں اسے مالک حقیقی (اللہ تعالیٰ) کی رضا اور اس کا منشا ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے۔

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے کیونکہ اس نے ہی اس کو پیدا کیا، بنایا اور بڑھایا۔ جس نے ابر نیساں کی ایک بوند کو سیپ میں بند کر کے پالا اور پرورش کیا، یہاں تک کہ وہ قطرۂ باراں آب دار قیمتی موتی ہو گیا۔ انسان کی ملکیت یہ ہے کہ اس کو اپنے کام میں لا سکتا ہے، اس سے نفع اٹھا سکتا ہے، کسی دوسرے انسان کو روکنے کا حق نہیں پہنچتا کیونکہ اس نے سمندر میں غوطہ زن ہو کر اس کو نکالا ہے یا کوہ کن نے پہاڑ کی چٹان پھاڑ کر یہ موتی اور لعل وہاں سے برآمد کیا۔ ان دونوں کو حق ہے کہ آپس میں تبادلہ کر لیں۔ اس کا نام خرید وفروخت اور انتقال ملکیت ہے، لیکن حقیقی ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے۔

نائب خدا اور خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے انسان کے ذمہ دنیا وآخرت کی فلاح وصلاح کا حصول ہے، اور اس کائنات کی ہر شے کا مقصود وجود انسان کو اپنے مقصد اور تگ ودوِ زندگی میں کامیابی کے مواقع فراہم کرنا ہے، اس لیے حق ملکیت کا حصول انسان کا مقصد زندگی نہیں بلکہ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا:

﴿اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاماً﴾ (النساء: ۵)

”(اور کم عقلوں کو اپنے وہ مال نہ دو) جن کو اللہ نے تمہاری گذر اوقات کا ذریعہ بنایا ہے۔“

آیت کے اس ٹکڑے میں ایک طرف تو مال کی اہمیت بتائی اور واضح کیا کہ انسانی معاش میں اس کا بڑا دخل ہے، لہٰذا اس کی حفاظت کا داعیہ قلوب میں پیدا کیا گیا۔ نہ صرف حفاظت کا داعیہ پیدا کیا گیا بلکہ اس کی حفاظت کو بھی ضروری قرار دیا اور اس کا ضیاع گناہ قرار دیا۔ اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے اگر کوئی شخص قتل ہو جائے تو وہ شہید ہے جیسا کہ جان کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہونے پر شہادت کے اجر کا وعدہ کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ مال کی حفاظت کرتے ہوئے جو شخص مقتول ہو

جائے وہ شہید ہے۔" (بخاری: ۱/ ۳۳۷، مسلم: ۱/ ۸۱)

ایک اور روایت میں سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: "نیک آدمی کے لیے اس کا اچھا اور پاکیزہ مال بہترین متاع حیات ہے۔" (مشکوٰۃ: ص ۳۲۶)

چونکہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک ہی وحدت کی اکائیاں ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بھی چند افراد یا کسی ایک طبقہ کی ملک نہیں ہونی چاہییں، بلکہ تمام انسانی افراد کو استفادہ کا موقع ملنا چاہیے، اور محروم افراد کے ساتھ ہمدردی اور اخوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں بھی اس مال سے استفادہ کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے، اور اللہ کو اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ پسندیدہ شخص وہ ہے جو اس کے عیال کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔" (مشکوٰۃ: ص ۴۲۳، مجمع الزوائد: ۸/ ۱۹۰)

انسان کو اگرچہ مال اور دیگر اشیاء پر ملکیت کے حقوق دیئے گئے لیکن یہ حقوق بطور آزمائش اور امتحان دے دیئے گئے ہیں، اور ظاہر ہے کہ آزمائش اسی صورت میں ہوتی ہے جب انسان کو اختیار اور اپنی پسند و ناپسند کے مطابق عمل کی آزادی حاصل ہو۔ البتہ اس حق اور اختیار کو اس طرح محدود کیا گیا کہ اس کی آزادی ملکیت سے دوسرے افراد کی آزادی مجروح نہ ہو، اور اس آزادی سے معاشرہ میں فساد اور فتنہ برپا نہ ہو۔ قرآن وسنت کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اموال واملاک پر افراد کو نجی ملکیت کا حق حاصل ہے، ورنہ قانون وراثت، نظام زکوٰۃ وعشر وصدقات، نظام نفقات اور قانون وصیت وغیرہ سب بیکار ہو جائیں، کیونکہ ان تمام احکام پر عمل اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اموال واملاک انسان کی ذاتی ملکیت میں ہوں۔ تاہم یہ مالکانہ حقوق مطلق نہیں بلکہ مشروط ہیں۔

اسلام نے انسان کو نجی ملکیت پر جو حقوق دیئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(1) ہر انسان اپنی زیر ملکیت شے کو اپنے یا دوسرے انسانوں کے فائدے کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ ان اشیاء میں ترمیم واضافہ عمل پیدائش کے ذریعہ کر سکتا ہے۔ اس کا یہ حق منقولہ وغیر منقولہ، ذی روح اور غیر ذی روح ہر طرح کی

املاک اور اشیاء پر ہوتا ہے۔ انسان نئی ٹیکنالوجی اور علم کی بنیاد پر ان اشیاء میں جدت بھی پیدا کر سکتا ہے۔

(2) جو اشیاء یا جائداد انسان کی نجی ملکیت میں ہیں ان میں اضافہ کرنا اور نفع کمانا انسان کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کو وہ کرایہ پر دے سکتا ہے۔ وہ ذاتی مال سے ذاتی کاروبار کر سکتا ہے تاکہ اس سے وہ نفع حاصل کرے۔ بعض مفکرین انسان کی ذاتی ملکیت کا حق تو تسلیم کرتے ہیں لیکن نفع حاصل کرنے کی غرض سے اس کو کاروبار میں لگانے کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ ایک کم عقلی کی بات ہے۔ کاروبار میں نفع ونقصان دونوں کا رسک (Risk) ہے۔ نقصان کی صورت میں صاحب مال اپنے مال اور محنت دونوں سے یک قلم محروم بھی ہو سکتا ہے، لیکن اگر مال خرچ کر کے اور شبانہ روز محنت کر کے اسے نفع اور فائدہ ہو تو یہ بھی اس کا حق بنتا ہے۔

(3) اپنے اس مال سے ہر شخص شراکت کے ذریعہ بھی نفع کما سکتا ہے۔ شراکت سے مراد ایسا پیداواری یا کاروباری عمل ہے جس میں دو یا دو سے زائد افراد متعین سرمایہ کے ساتھ نفع کے حصول اور نقصان کی ذمہ داری برداشت کرنے کے لیے اکٹھے ہوں اور نفع ونقصان کی شرح کا تعین حصہ داران کے بیچ پہلے سے طے ہو۔

انسان کا حق تملیک اس حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے جو امام احمدؒ نے روایت کی ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح کرنا طے ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''کیا تمہارے پاس کچھ ہے؟'' سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ کچھ نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: ''وہ زرہ کہاں ہے جو میں نے فلاں روز آپ کو دی تھی۔'' سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ وہ میرے پاس موجود ہے، چنانچہ وہ آپ ﷺ کو لا کر دی۔ (ابوداؤد، رقم ۲۱۲۴)

اس حدیث سے پتہ چلا کہ وہ زرہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ملکیت تھی۔

اسی طرح کسی علمی اور ادبی کام کے بھی حقوق ملکیت ہوتے ہیں، نئی ایجادات

کے حقوق ملکیت، انجینئروں کے نقشہ جات اور ان کے پلان کے حقوق ملکیت، ادبی کتابوں، تراجم کے حقوق نشر واشاعت یہ سب حقوق اسلام میں ایک انسان کی ملکیت میں داخل ہیں بشرطیکہ وہ کسی حرام کام کی کمائی کے نتیجہ میں آمدنی نہ ہو۔ کیوں حرام مال، مال غیر متقوم ہوتا ہے۔

ملکیت میں حق تصرف:

اسلام نے انسان کو اس کی ملکیت میں تصرف کا بھی پورا پورا حق دیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿مثل الذين ينفقون اموالهم في سبيل الله كمثل حبة انبتت سبع سنابل، في كل سنبلة مائة حبة، والله يضاعف لمن يشاء، والله واسع عليم﴾ (بقرہ، ۲۶۱)

''جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس دانے کی طرح ہے جس نے سات ایسے خوشے اگائے کہ ہر خوشے کے ساتھ سو دانے ہیں، اور جس کے لیے چاہے ان کو دگنا کر دیتا ہے، اور اللہ بڑی وسعت والا بہت علم والا ہے۔''

اس آیت اور قرآن حکیم کی دوسری کئی آیات میں مال کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے اور صدقہ وخیرات کی ترغیب دی اور پھر اس کا اجر وثواب بھی ذکر کیا، کیونکہ صدقہ وخیرات سے دولت پورے معاشرہ میں گردش کرتی ہے۔ ہر امیر وغریب کی جیب تک پہنچتی ہے۔ فقراء اور غرباء کی زندگی کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور رفاہ عامہ کے بہت سے کام انجام پاتے ہیں۔ یہ نہیں کہا کہ جائز وناجائز کام میں مال خرچ کرو بلکہ ''فی سبیل اللہ'' کی قید لگائی کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو۔ اللہ کی راہ کی کئی صورتیں ہیں۔ دین کی نشر واشاعت میں خرچ کرنا، مساجد ودینی مدارس کی بہتری اور تعمیر کے لیے خرچ کرنا، کوئی لائبریری بنانا، یتیم خانے تعمیر کرنا، ہسپتال بنانا، اس میں ادویات رکھنا، یتیموں اور بیواؤں کے لیے وظائف جاری کرنا، بیماریوں کے علاج معالجہ کے لیے انہیں مختلف

سہولتیں دینا، تنگ دست پڑوسیوں کی مدد کرنا، یہ اور اس طرح کے دوسرے کاموں میں دولت کو صرف کرنا سب ''فی سبیل اللہ'' کی مختلف صورتیں اور انواع ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنی ملکیت میں انسان کو ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہے۔ وہ اس مال میں سے قرض بھی دے سکتا ہے اور مستحقین پر اس کو خرچ بھی کر سکتا ہے، اور ایک مومن اس بات پر مامور ہے کہ وہ اس مال کو خرچ کرے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ہر روز صبح کے وقت دو فرشتے آسمان سے زمین پر اترتے ہیں، ان میں سے ایک کہتا ہے۔

﴿اللھم اعط منفقاً خلفاً﴾

''اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بدلہ عطا فرما۔''

اور دوسرا کہتا ہے۔

﴿اللھم اعط ممسکاً تلفاً﴾

''اے اللہ! روک کر رکھنے والے کے حصہ میں ہلاکت رکھ۔''

(بخاری، رقم: ۱۴۴۲، مسلم، رقم: ۱۰۱۰)

ایک شخص کا اپنے مال کو مضاربت پر دینا یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اسے اپنے مال میں ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہے۔ مضاربت کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص صرف سرمایہ فراہم کرتا ہے جب کہ دوسرا شخص صرف کاروباری جدوجہد اور سعی و کوشش کرتا ہے نقصان کی صورت میں صاحب سرمایہ کا مالی نقصان ہوگا، دوسرے کی محنت کا۔

پھر کسی شے کے مالک کو اپنی چیز دوسرے کو کرایہ پر دینا بھی جائز ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کرایہ کسی شے کے استعمال کے فائدوں کی قیمت کو کہتے ہیں۔ اس سے چیز تو اصل مالک کی ملکیت ہی میں رہتی ہے لیکن اس کے فوائد کرایہ پر لینے والے کی ملکیت بن جاتے ہیں۔ نقد سرمایہ کرایہ پر نہیں دیا جا سکتا کیونکہ نقد سرمایہ کو خرچ کیے بغیر اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ وہ خود باقی رہتے ہوئے اپنے فوائد استعمال منتقل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ سرمایہ کو کرایہ پر دینا سود کہلاتا ہے۔

مالک کو اپنی ملکیت میں ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، لہٰذا اس کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زیر ملکیت چیز دوسرے شخص کو منتقل کر دے، خواہ قیمت کے عوض

ملکیت منتقل کرے یا بلا عوض کرے۔ چنانچہ چیزوں اور جائیداد کی خرید و فروخت، ہبہ، وصیت اور وقف وغیرہ ملکیت کی منتقلی کی مختلف شکلیں ہیں۔

ملکیت کی حرمت:

اسلام نے ہر شخص کی ملکیت کا پورا پورا احترام کیا ہے اور اس میں ہر قسم کی زیادتی کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ:

﴿کل المسلم علی المسلم حرام، دمه و ماله و عرضه﴾

(رواہ مسلم، رقم: ۲۵۶۴ جزء من حدیث)

''ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون، مال اور اس کی عزت و آبرو حرام ہے۔''

قرآن حکیم میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿یا ایها الذین آمنوا لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الاّ ان تکون تجارةً عن تراضٍ منکم﴾ (النساء: ۲۹)

''اے ایمان والو! ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ سوا اس کے کہ باہمی رضامندی سے تجارت ہو۔''

اس آیت میں دوسروں کے اموال میں تصرف کی اجازت دی ہے اور اس کے لیے کچھ ہدایات بھی دی ہیں۔ ان ہدایات کی روشنی میں دوسرے کے مال میں تصرف کرنے کا حق دیا گیا ہے، وگرنہ دوسروں کے مال میں تصرف کرنا حرام قرار دیا گیا۔ بیع و شراء کے ذریعہ دوسرے کے مال میں تصرف کی اجازت دی گئی ہے، اسی طرح ہبہ، وراثت اور کسی چیز کو بنا کر اس کا مالک ہونا جائز ہے۔ اور جوا، سٹہ، غصب، چوری، ڈاکہ، خیانت، جھوٹی قسم کھا کر اور جھوٹی گواہی کے ذریعہ اور رشوت سے دوسرے کا مال کھانا ناجائز اور حرام قرار دیا گیا۔

آج کل معاشرہ میں رشوت کا بہت چلن ہے۔ افسوس یہ ہے کہ نہ رشوت لینے والا اس کو گناہ سمجھتا ہے اور نہ رشوت دینے والا، حالانکہ حدیث میں دونوں کو جہنمی کہا گیا

ہے۔ علامہ سید مرتضیٰ زبیدی نے رشوت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: کوئی شخص حاکم یا کسی اور افسر مجاز کو کوئی چیز دے تا کہ وہ اس کے حق میں فیصلہ کر دے، یا حاکم کو اپنی منشاء پوری کرنے پر ابھارے۔ (تاج العروس ۱۰/۱۵۰)

کسی شخص پر ظلم کرنے کے لیے یا کوئی ناجائز کام کرانے کے لیے کچھ دینا رشوت ہے، اور اپنا حق حاصل کرنے کے لیے یا خود کو ظلم سے بچانے کے لیے کچھ دینا یہ رشوت نہیں ہے۔" چنانچہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ حبشہ کی سرزمین پر پہنچے تو ان سے ان کا کچھ سامان چھین لیا گیا۔ انہوں نے اس سامان کو اپنے پاس رکھا اور دو دینار دے کر اپنا سامان چھڑا لیا۔

وہب بن منبہ فرماتے ہیں کہ جس کام میں رشوت دینے والا گنہگار ہوتا ہے یہ وہ نہیں ہے جو اپنی جان اور مال سے ظلم دور کرنے کے لیے دی جائے۔ رشوت وہ چیز ہے کہ تم اس چیز کو حاصل کرنے کے لیے کچھ دو جو تمہارا حق نہیں ہے۔ اس میں دینے والا گنہگار ہوتا ہے۔ (سنن کبریٰ بیہقی: ۱۰/۱۳۹)

بعض حضرات کے نزدیک رشوت ہر وہ مال ہے جو بشرط اعانت خرچ کیا جائے۔ (الاصول اللغۃ فی المرافعات الشرعیۃ ص ۳۳۰)

یعنی ہر وہ مال جو کسی کام میں کسی شخص کی مدد حاصل کرنے کی غرض سے خرچ کیا جائے۔ اس تعریف سے "ہدیہ" آپ سے آپ نکل جاتا ہے کیونکہ یہ اعانت کی شرط کے ساتھ نہیں دیا جاتا، لیکن یہ تعریف غیر رشوت کو رشوت میں داخل ہونے سے مانع نہیں جیسے مزدور، انجینئر، یا وکیل کو اجرت یا فیس دے کر اس سے کام کرانا، ظاہر ہے اس کا تعلق رشوت سے نہیں ہے، لیکن اس تعریف سے ان کا شمار بھی رشوت میں ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ:

﴿لا یحل لامرئ من مال اخیہ الا ما طابت بہ نفسہ﴾

(مسند احمد: ۵/۱۱۳، نیل الاوطار: ۸/۲۷۷)

"اپنے بھائی کا مال اس کی رضامندی اور طیب نفس کے بغیر لینا کسی شخص کے لیے حلال نہیں۔"

پھر اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے لیے جو دوسروں کا مال چوری کرتا ہے اس کی سزا ہاتھ کاٹ رکھی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿والسارق والسارقة فاقطعوا ایدیھما، جزاءً بما کسب، نکالاً من اللہ، واللہ عزیز حکیم﴾ (مائدہ:۳۸)

''چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت کے (دائیں) ہاتھ کو کاٹ دو، یہ ان کے کیے ہوئے کی سزا ہے اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک تعبیر، اور اللہ بہت غالب اور نہایت حکمت والا ہے۔''

چوری کی سزا سے معلوم ہوا کہ کسی دوسرے کی ملکیت میں تصرف کرنا حرام ہے، اور کسی شخص کو شریعت یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی کی ملکیت میں کسی قسم کا کوئی تصرف کرے۔

ایک حدیث میں فرمایا جو شخص کسی کی بالشت بھر زمین غصب کرتا ہے، تو سات زمینیں قیامت کے روز اس کے گلے کا طوق بنا دی جائیں گی۔

(فتح الباری، رقم: ۲۴۵۴، مسلم مع نووی: ۱۱/۴۸)

انسان کی ملکیت کے حصول پر قیود:

اسلام نے اگر ایک انسان کی ملکیت کو تسلیم کیا ہے تو اس کے حصول پر کچھ حدود و قیود بھی لگا دی ہیں:

1- پہلی قید یہ ہے کہ جس چیز کا وہ مالک ہو رہا ہے وہ حرام نہ ہو بلکہ طیب اور طاہر ہو۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نجاسات، شراب، خنزیر، خون، مردار اور جانور جو بتوں پر یا ان کے نام پر ذبح کیے جائیں، اور جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے جائیں یہ سب حرام ہیں اور لوگوں کا مال باطل طریق سے کھانا، بت اور ان کی قیمتیں، تصاویر اور ان کی قیمتیں ان سب کی تملیک حرام ہے۔ (ملاحظہ ہو مائدہ: ۳، بقرہ: ۸۸)

2- کسی شے کو اپنی ملکیت میں لینے کا طریقہ بھی جائز اور حلال ہو، اگرچہ وہ چیز بذات خود حلال ہو، لیکن اگر اس کا طریقہ تملیک صحیح نہیں تو وہ شے ملکیت

میں رکھنی جائز نہیں ہے، مثلاً گائے بذات خود حلال شے ہے، لیکن اگر کوئی شخص کسی کی گائے چوری کر کے لے آئے تو اس کی ملکیت اس پر ثابت نہ ہوگی۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ کسی انسان کے قدم قیامت کے روز اپنی جگہ سے ہل نہیں سکیں گے جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کو چار سوالوں کا جواب نہ دے دے۔

(1) اپنی عمر اس نے کس طرح گزاری

(2) اپنی جوانی کن کاموں میں صرف کی

(3) اس سے علم کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ اس پر کتنا عمل کیا

(4) اور مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔

(رواہ مسلم واحمد والدرامی والترمذی بمعناہ (۲۴۱۰) وقال حدیث حسن صحیح)

خلاصہ یہ کہ اسلام غیر مشروع طریقہ تملیک کو حرام قرار دیتا ہے کیونکہ یہ امانت میں خیانت کے قائم مقام ہے۔ غیر مشروع طریقہ تملیک درج ذیل ہیں:

1- دھوکہ دہی:

دھوکہ دہی سے جو مال کمایا جائے وہ بھی آدمی کی شرعی ملکیت ثابت نہیں ہوتا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿من غشنا فلیس منا﴾

”جو ہم سے دھوکہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔“

(اخرجہ ابن حبان، رقم: ۱۱۰۷، مجمع الزوائد: ۹۳/۳، ۹۵/۳، ۹۶/۳، مسند احمد: ۶۹/۲، ۳۶۶/۳، ۴۵/۴، معجم اوسط طبرانی، رقم: ۲۳۸۸، مسند البزار، رقم: ۱۲۵۵، طبرانی فی الکبیر: ۱۹۸/۲۲، حاکم فی المستدرک: ۹/۲، مسند حمیدی، رقم: ۱۰۳۳، مشکل الآثار: ۱۳۴/۲)

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

﴿من غش المسلمین، فلیس منھم﴾

(مجمع الزوائد: ۹۵/۴، اخرجہ الطبرانی فی الکبیر: ۳۵۹/۱۸)

''جو مسلمانوں سے دھوکہ کرے وہ ان میں سے نہیں ہے۔''

چنانچہ بعض کتابوں میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے دودھ میں پانی ڈالا ہوا تھا۔ آپ نے وہ سارا نیچے گرا دیا تاکہ آئندہ کوئی شخص دودھ میں پانی نہ ملائے۔

2- رشوت:

غیر مشروع طریقے تملیک رشوت بھی ہے۔ اس کے بارے میں گذشتہ صفحات میں لکھا جا چکا ہے۔ چنانچہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رشوت لینے والے اور دینے والے دونوں کے جہنمی ہونے کا سند یہ سنایا ہے۔

(رواہ الترمذی، رقم: ۱۳۳۶، وقال حدیث حسن صحیح)

بعض روایات میں ''الرائش'' کا لفظ بھی آیا ہے جس کا مطلب ہے وہ شخص جو رشوت لینے اور دینے والے کے درمیان دلالی کا کام کرتا ہے۔

ایک اور حدیث میں سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ (سنن کبریٰ بیہقی: ۱۰/۱۳۹)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ ''سحت'' کا کیا مطلب ہے۔ انہوں نے فرمایا ''رشوت''۔ پھر پوچھا گیا کہ فیصلے پر رشوت لینے کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا یہ کفر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ (احکام) کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ (سنن کبریٰ بیہقی: ۱۰/۱۳۹)

ان احادیث میں فیصلہ کے لیے رشوت دینے اور باطل کام کرانے کے لیے رشوت دینے کو حرام قرار دیا گیا ہے، لیکن اگر کوئی شخص ظلم اور ضرر سے بچنے کے لیے کسی افسر مجاز کو کچھ دیتا ہے تو وہ رشوت نہیں ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اجعل مالک دون نفسک ونفسک دون دینک﴾

(السیاسۃ الشرعیۃ فی حقوق الراعی وسعادۃ الرعیۃ لسید عبداللہ جمال الدین: ص ۵۳)

''اپنے مال کو اپنی جان سے کم مرتبہ سمجھو اور اپنی جان کو اپنے دین

سے کم مرتبہ خیال کرو۔"

جب انسان کو اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو تو رسول اللہ ﷺ نے ظلم اور ضرر کے دفعیہ کے لیے مال کو ڈھال اور بچاؤ کا سامان بنانے کی اجازت دی ہے۔ اور اس قسم کے معاملہ میں رشوت دینا ایک قسم کی حفاظتی تدبیر ہے۔ لہٰذا دینا درست ہے۔

چنانچہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جس وقت حبشہ میں تھے، آپ نے گلو خلاصی کے لیے دو دینار بطور رشوت دیئے، تب کہیں آپ کو رہائی ملی۔ اس وقت آپ نے فرمایا:

﴿ان الاثم علی القابض دون الدافع﴾

(تفسیر قرطبی: ۲/۱۸۴، عون المعبود: ۹/۲۹۶)

"لینے والا گنہگار ہے دینے والا نہیں۔"

سچے، امانت دار، ثابت قدم، مقتدر اور بے نیاز افراد کو سرکاری کاموں کی ذمہ داری سونپنا ایک اہم دینی فریضہ ہے جس کو شریعت اسلامیہ اپنی بلندتر تعلیمات کے ذریعہ ہم پر واجب کرتی ہے۔ لیکن اس زمانہ میں رشوت کے ذریعہ لوگ پچھلے دروازوں سے اعلیٰ عہدوں اور بلند مرتبوں پر فائز ہو جاتے ہیں، اس لیے اسلام نے رشوت لینے والے، رشوت دینے والے اور درمیانی ایجنٹ کو جہنم کی بشارت دی ہے۔ (رد المحتار: ۴/۳۰۴)

اس قسم کی رشوت کو بھی اسلام نے حرام قرار دیا ہے، اور ارشاد ربانی ہے:

﴿ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الیٰ اھلھا، واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل﴾ (نساء: ۵۸)

"بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے سپرد کر دیا کرو۔ اور جب تم لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔"

کسی منصب یا ملازمت کے حصول کے لیے رشوت دینا درحقیقت امانت کو نااہلوں کے سپرد کرنا ہے۔ اس سے حکم خداوندی کی مخالفت لازم آتی ہے۔ اس لیے کسی بھی منصب یا ملازمت کو حاصل کرنے کے لیے رشوت دینا حرام ہے۔

ابو یعلیٰ نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے سند مرفوع کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے کہ:

''جس شخص نے دس آدمیوں پر کسی کو کارگزار بنایا، اور اسے معلوم ہے کہ اس گروہ میں اس سے بہتر بھی کوئی شخص ہے تو وہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسول (ﷺ) اور جماعت مسلمین کے ساتھ خیانت کا مرتکب ہوگا۔''

(الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ: ۲/۱۶۵)

امام بخاریؒ نے سیدنا معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ہر وہ والی (حکمران) جو مسلمانوں کی جماعت کی نگہداشت کرتا ہے، اگر وہ اس حال میں مرے کہ اس نے لوگوں کے ساتھ فریب اور دھوکہ کیا ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام کر دیتا ہے۔''

(فتح الباری: ۱۶/۳۴۶ ،السیاسۃ الشرعیۃ لابن تیمیہ: ص ۱۴)

اور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

''جو شخص مسلمانوں کے کسی کام کا والی ہوا، پھر اس نے کسی شخص کو باہم دوستی یا قرابت داری کی بنیاد پر کسی عہدہ اور منصب پر فائز کیا تو اس نے اللہ، اس کے رسول (ﷺ) اور عام مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی۔''

(السیاسۃ الشرعیۃ لابن تیمیہ: ص ۱۰)

اور رشوت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہر شخص کو اپنی نظروں کے سامنے رکھنی چاہیے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

''ہر وہ گوشت جو ''سحت'' سے پیدا ہوا یا بنا ہو، جہنم اس کے لیے سب سے بہتر ٹھکانا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! سحت کیا ہے؟'' فرمایا: ''رشوت۔'' (الجامع الکبیر: ۳/۱۵۰، واخرجہ البیہقی فی شعب الایمان)

پبلک کے روپیہ میں خیانت کرنا:

لوگوں کے فنڈز اور ان کے ٹیکسوں سے اکٹھی کی ہوئی رقم میں خیانت کرنا بھی

حرام ہے اور اس طریقہ سے کمائی ہوئی دولت پر بھی اسلام میں حق ملکیت ثابت نہیں ہوتا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿وما كان لنبي ان يغل، ومن يغلل يات بما غلّ يوم القيامة، ثم توفي كل نفس ما كسبت، وهم لايظلمون﴾

(آل عمران:۱۶۱)

''اور خیانت کرنا کسی نبی کی شان کے لائق نہیں، اور جو شخص خیانت کرے گا وہ خیانت کی ہوئی چیز قیامت کے دن لے کر آئے گا، پھر ہر شخص کو اس کے عمل کا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

اس آیت کے بارے میں اگرچہ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس میں مال غنیمت میں خیانت کرنے پر عذاب کی وعید سنائی گئی ہے، لیکن اس سے مراد مسلمانوں کے ہر قسم کے اموال ہیں۔ جو شخص پبلک منی (Public Money) میں خیانت کرتا ہے وہ اس آیت کی وعید کا مستحق ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ابن اللتبیہ جو قبیلہ آزد کی شاخ بنی لُتب سے تعلق رکھتا تھا، بنی سلیم کے صدقات اکٹھے کرنے پر عامل مقرر کیا۔ جب وہ صدقات وصول کر کے واپس آیا تو اس نے کہا کہ یہ تو آپ کا مال ہے اور یہ میرا مال ہے۔ مجھے یہ ہدیہ کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ یہ سن کر منبر پر تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد ارشاد فرمایا:

''جن عاملوں کو میں بھیجتا ہوں ان کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ کہتے ہیں: یہ تمہارے لیے ہے اور یہ مجھے ہدیہ کیا گیا ہے۔ یہ شخص اپنے باپ یا اپنی ماں کے گھر میں جا کر کیوں نہیں بیٹھ گیا، پھر ہم دیکھتے کہ اس کو ہدیہ کیا جاتا ہے یا نہیں! اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے، تم میں سے جو شخص بھی صدقات (اموال مسلمین) میں سے کوئی چیز لے گا، قیامت کے روز جب وہ آئے گا تو وہ شے اس کی گردن پر سوار ہو گی، اونٹ بڑبڑا رہا ہو گا، گائے بول رہی ہو گی، بکری ممیا رہی ہو گی، پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند

کیے حتیٰ کہ ہم نے آپ کی بغلوں کی سفیدی دیکھی، پھر دو مرتبہ فرمایا: ''اے اللہ! کیا میں نے تیرا حکم پہنچا دیا۔''

(مسلم: ۳/۱۴۶۳، بخاری، رقم: ۲۵۹۷، مع اختلاف فی اللفظ)

پھر رسول اللہ ﷺ نے وہ سارے ہدیے جو ابن اللتبیہ لایا تھا، بیت المال میں جمع کروا دیئے۔

اسی طرح کی ایک اور روایت سیدنا عدی بن عمیرہ کندی رضی اللہ عنہ سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہم نے تم میں سے جس شخص کو کسی منصب کا عامل بنایا اور اس نے کوئی سوئی یا اس سے بھی چھوٹی چیز ہم سے چھپالی تو یہ خیانت ہے جس کو قیامت کے دن لے کر آئے گا۔ انصار میں سے ایک سیاہ فام شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا: ''یا رسول اللہ! اپنے دیئے ہوئے منصب کو مجھ سے واپس لے لیجئے۔'' آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا ہوا؟'' اس نے کہا: ''میں نے آپ کو اس طرح فرماتے ہوئے سنا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، میں اب بھی یہی کہتا ہوں، ہم نے تم میں سے جس شخص کو کسی عہدہ کا عامل بنایا اس کو چاہیے کہ وہ ہر چھوٹی اور بڑی چیز کو لے کر آئے، پھر اس کو جو دے دیا جائے وہ لے لے، اور جس سے منع کیا جائے اس سے باز رہے۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ ہم میں تشریف فرما ہوئے۔ آپ ﷺ نے خیانت کا ذکر کیا اور فرمایا کہ وہ سخت گناہ ہے، اور فرمایا کہ تم میں سے کسی ایک شخص کو قیامت کے دن اس حال میں نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر سوار اونٹ بڑبڑا رہا ہو۔ وہ شخص کہے گا: ''یا رسول اللہ! میری مدد فرمایئے۔ میں کہوں گا: میں تیرے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں۔ میں تجھ کو تبلیغ کر چکا ہوں۔ اور میں تم میں سے کسی ایک کو قیامت کے روز اس حال میں نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر سوار گھوڑا ہنہنا رہا ہو۔ وہ کہے گا: ''یا رسول اللہ! میری مدد فرمایئے، میں کہوں گا میں تیرے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں، میں تجھے تبلیغ کر چکا ہوں۔'' اور میں تم میں سے کسی ایک شخص کو قیامت کے روز اس حال میں نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر سوار بکری ممیا رہی ہو۔ وہ کہے گا: ''یا رسول اللہ! میری مدد فرمایئے، میں کہوں گا کہ میں تیرے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں۔ میں تجھے اللہ کا حکم

پہنچا چکا ہوں۔ اور میں تم میں سے قیامت کے روز کسی شخص کو اس حال میں نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر سوار انسان چیخ رہا ہو۔ وہ کہے گا یا رسول اللہ! میری مدد فرمایئے، میں کہوں گا میں تیرے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں، میں تجھے اللہ کے احکام پہنچا چکا ہوں۔ اور میں تم میں سے کسی ایک شخص کو قیامت کے دن اس حال میں نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر سونا اور چاندی ہو، وہ کہے گا یا رسول اللہ! میری مدد فرمایئے۔ میں کہوں گا: میں تیرے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں، میں تجھے اللہ کے احکام پہنچا چکا ہوں۔"

(مسلم: ۳/۱۴۶۱، بخاری: ۱/۴۴۳، مسند احمد: ۲/۴۲۶)

ایک اور حدیث میں سیدنا ابو حمید الساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿هدايا العمال غلول﴾ (مسند احمد: ۵/۴۲۵)

"عاملوں (حاکموں) کا ہدیہ خیانت ہے۔"

پاکستان میں دفاتر میں کام کرنے والے لوگ اکثر و بیشتر دفاتر کی اسٹیشنری کا سامان اپنے ذاتی استعمال کے لیے گھر لے آتے ہیں یا جیسے گورنمنٹ کے ورکشاپ میں کام کرنے والے لوگ اپنی ذاتی استعمال کے لیے مختلف چیزیں ورکشاپ سے بنا کر لے آتے ہیں یا بعض دینی مدارس کے مہتمم مدرسہ کے تمام اموال اور گاڑیوں کو بے دھڑک اپنے ذاتی استعمال میں لاتے ہیں، یہ تمام امور خیانت میں شمار ہوتے ہیں۔

سود:

احتکار کی سب سے ملعون قسم سودی لین دین ہے۔ یہ تمام اقتصادی اور معاشی نظام کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہ کروڑوں انسانوں کو مفلس اور نان شبینہ کا محتاج بنا کر دولت کا سمٹاؤ ایک مخصوص طبقہ کی طرف کر دیتا ہے۔ سود سرمایہ دارانہ نظام کا ایک اہم اور مضبوط ستون ہے اور اس نظام کی عمارت کا زیادہ انحصار اسی پر ہے۔

سود کے جرم کے گھناؤنے پن کی وجہ سے قرآن حکیم نے انتہائی سخت لہجوں میں سود خوری کی سزاؤں کا اعلان کیا ہے۔ سزائیں بھی شدید کہ بڑے سے بڑے کبیرہ گناہ کے

بارے میں بھی سزاؤں کی اتنی شدت قرآن حکیم میں نہیں ملتی۔ شیطانی آسیب زدوں کی شکل میں سودخوار اٹھے گا۔ تکثیر دولت کی تمام کوششوں کو اس کی قدرت برباد کر کے رکھ دے گی، جہنم میں اسے ابدی عذاب میں مبتلا ہونا پڑے گا، اور آخر میں قرآن نے اعلان کر دیا کہ جو شخص سودخوری سے رکنے اور توبہ کرنے پر آمادہ نہیں ہے، چاہیے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کو اعلان جنگ دے دے۔ علماء نے لکھا ہے کہ کسی جرم پر خواہ وہ انسان کی زندگی کے کسی شعبہ سے متعلق ہو، قرآن حکیم میں اتنی سزاؤں کی دھمکی نہیں دی گئی ہے۔

قرآن حکیم نے سود کے بارے میں بڑے صریح اور واضح الفاظ میں نہایت سخت اور قطعی احکام صادر فرمائے ہیں۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

> ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور باقی ماندہ سود کو چھوڑ دو، اگر تم مومن ہو، پس اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول (علیہ السلام) کی طرف سے اعلان جنگ سن لو، اور اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے اصل مال تمہارا حق ہیں، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم ظلم کیے جاؤ گے۔'' (بقرہ ۲۷۹)

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر تم نے اس باغیانہ روش سے توبہ نہ کی تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس کی نوعیت بالکل ایک الٹی میٹم کی ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلامی نظام میں سودی کاروبار ایک سنگین فوجداری جرم ہے۔ اگرچہ یہ ایک فرد کا عمل ہے لیکن اگر یہ کام ایک جماعت کرے تو اس کی حیثیت باغیوں اور مفسدوں کی ہے جن کی سرکوبی کے لیے عندالضرورت فوجی کارروائی بھی کی جاسکتی ہے۔ حکم کی اس سنگینی اور قرآن کے اس الٹی میٹم سے اصل مقصد سرمایہ دارانہ اخلاق، سرمایہ دارانہ ذہنیت، سرمایہ دارانہ تمدن اور سرمایہ دارانہ نظام معیشت کا بھی استیصال کر کے وہ نظام قائم کرنا تھا جس میں بخل کے بجائے فیاضی، خود غرضی کے بجائے ہمدردی اور باہمی تعاون ہو، سود کے بجائے صدقات، بنک کے بجائے بیت المال ہو، اور سود کی ہر نوع اور قسم ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے خواہ وہ ذاتی ضرورت کے قرضہ پر لیا جائے یا نفع آور کاروبار میں لگانے والے قرضہ پر ہو یا اس قرض پر لیا جائے جو حکومت شہریوں سے لیتی ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا ''نہ تمہیں ظلم کرنا ہے، ورنہ تم پر ظلم کیا جائے گا یعنی جو پہلے تم سود لے چکے ہو اسے اگر تمہارے اصل مال میں شمار کر لیں اور اس میں سے کاٹ لیں تو تم پر ظلم ہوگا، اور ممانعت کے بعد کا سود چڑھا ہوا اگر تم مانگو تو یہ تمہارا ظلم ہے۔''

احادیث نبویہ میں بھی سودی کاروبار کے بارے میں نہایت سختی سے ممانعت کی گئی ہے جن میں سے چند ایک احادیث حسب ذیل ہیں:

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سود لینے والے، سود دینے والے، سودی دستاویز لکھنے والے اور سود کے معاملہ کی گواہی دینے والے، ان سب پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا کہ یہ سب معصیت کے ارتکاب میں برابر ہیں۔

(مسلم، رقم: ۲۹۸۱، ابن ماجہ: ۲۲۷۷، ابن حبان: ۱/۳۹۹، سنن الدارمی: ۲/۲۳۴، سنن کبریٰ بیہقی: ۵/۲۷۵، مسند ابی داؤد طیالسی: ۲۵، مسند احمد: ۱/۳۹۳)

ایک اور حدیث سیدنا عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سود کا ایک درہم جس کو آدمی جان بوجھ کر کھاتا ہے 36 بار زنا کرنے سے زیادہ سنگین ہے۔''

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جو سود نہ کھائے گا، اور اگر کوئی سود نہ کھائے گا تو اس کو اس کا غبار ضرور پہنچے گا۔''

(ابن ماجہ، رقم: ۲۲۷۸، ابوداؤد فی التجارات، سنن کبریٰ بیہقی: ۵/۲۷۵، شرح السنہ بغوی: ۸/۵۵، مستدرک حاکم: ۲/۱۱، مسند احمد: ۲/۴۹۴، مسند ابی یعلیٰ موصلی: ۱/۱۰۵، تہذیب الکمال: ۱۰/۳۱۶)

احتکار:

احتکار کا مطلب یہ ہے کہ دولت سمٹ کر کسی ایک ہی طبقہ میں محدود و محصور ہو کر رہ جائے۔ اسلام نے احتکار کی سخت مذمت کی ہے کیونکہ اسلام کے معاشی نظام میں یہ بات ہرگز برداشت نہیں کی جا سکتی کہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے۔ اس کے اثرات معاشرہ پر نہایت برے پڑتے ہیں۔ جس طرح خون تمام جسم میں جب تک دورہ نہ کرے

اس وقت تک جسم صحیح طور پر تندرست نہیں رہ سکتا، اسی طرح جب تک دولت تمام معاشرہ میں گردش نہ کرے اور ہر شخص کی جیب تک پہنچ نہ جائے معاشرہ صحیح طور پر درست نہیں رہ سکتا۔ سرمایہ داری کے اس کافرانہ نظام میں دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہے۔

پیدائش دولت کے باب میں رزق حلال کی تاکید کی گئی ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں جو لوگ زیادہ سرمایہ دار ہوتے ہیں ان کی پیدائش دولت کے طریقے اکثر و بیشتر ناجائز اور حرام ہوتے ہیں۔ رزق حلال کی جدوجہد ذاتی اغراض کے ٹکراؤ سے معاشرہ کو محفوظ کر دیتی ہے اور انسانی توانائیاں مثبت اور مفید تعمیری کاموں پر مرکوز ہو جاتی ہیں جس سے دولت کی پیدائش کا عمل تیز اور مفاسد سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ معاشرہ کے تمام افراد کو اپنی صلاحیتیں بیکار چھوڑنے کے بجائے مفید پیداواری کاموں میں صرف کرنی چاہئیں۔ گداگری اور طفیلی پن کی ہر شکل معاشرہ کے توازن کو خراب کر دیتی ہے۔

اسلام نے اکتساب مال کے ایسے تمام ذرائع کی سختی سے ممانعت کر دی ہے، چنانچہ منشیات، سود، جوا، رشوت، لاٹری، چوری، ذخیرہ اندوزی، بلیک مارکیٹ، فحش اور مخرب اخلاق اشیاء کی پیدائش اور فروخت، قحبہ گری، عفت فروشی، رقص و سرود، کلب اور اس طرح کی دیگر اشیاء کی سرگرمیوں کے ذریعہ روزی کمانا اور ان کی خرید و فروخت اور ان کی پیدائش میں کسی قسم کی معاونت کو حرام اور ناجائز قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس سے لاتعداد اور ان گنت معاشی، اقتصادی، معاشرتی، سماجی اور اخلاقی مفاسد جنم لیتے ہیں، اور معاشرہ کے حسن اور اس کے سکون کو تہ و بالا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں اسلامی نظام معیشت میں ضرر اور غرر، اکراہ اور بیگار اور اس قسم کے دیگر ذرائع آمدنی کی بھی ممانعت کر دی گئی، کیونکہ اس سے نہ صرف انسانی عظمت پر دھبہ لگتا ہے بلکہ معاشی سرگرمیوں کا توازن بھی یک قلم بگڑ جاتا ہے۔ جب دولت کی پیدائش پر اس قدر پابندیاں اور قدغنیں ہوں تو یقین جانئے نہ تو اس زمانہ میں کوئی شخص کروڑ پتی اور ارب پتی ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی غریب ایسی غربت کی زندگی بسر کر سکتا ہے جس میں اس کو اپنی غربت کا احساس ہو۔

اسلام نے اسراف و تبذیر کی مذمت کے ساتھ ساتھ بخل اور شح کی بھی مذمت کی ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب و سزا کی سخت وعید بھی اسی سلسلہ کی کڑی

ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿الذين يبخلون ويامرون الناس بالبخل ويكتمون ما اتاهم الله من فضله، واعتدنا للكافرين عذابا مهينا﴾

(نساء: ۳۷)

''جو لوگ خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی تعلیم دیتے ہیں، اور جو شے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے اس کو چھپاتے ہیں، اور ہم نے ایسے ناشکروں کے لیے اہانت والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

اسلام نے وہ ساری چیزیں اپنی تعلیمات میں بیان فرمادیں جن سے احتکار کا قلع قمع ہوتا ہے اور دولت سمٹ کر ایک طبقہ میں یا چند ہاتھوں میں محصور و محدود ہو کر نہیں رہ جاتی بلکہ پورے معاشرہ میں گردش کرتی ہے اور ہر شخص اس سے مستفید ہوتا ہے۔

اسلام ہی وہ دین ہے جس نے سرمایہ داروں کو احتکار سے روکا۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

﴿لایحتکر الا خاطئ﴾ (ابوداؤد: ۲/۱۳۲، ابن ماجہ رقم: ۲۱۵۴)

''احتکار کرنے والا گنہگار اور خطا کار ہے۔''

(والحدیث اخرجہ ایضاً مسلم فی المساقاۃ، والترمذی فی البیوع، وابن حبان: ۱۱/۳۰۸، وابن ابی شیبۃ: ۶/۱۰۲، والبیہقی فی السنن الکبریٰ: ۶/۲۹، والبغوی فی شرح السنۃ: ۸/۱۷۹، والحاکم فی المستدرک: ۲/۱۲، مصنف عبدالرزاق: ۸/۲۰۳، مسند احمد: ۳/۴۵۳، مسند الدارمی: ۲/۲۴۸)

امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک احتکار صرف غذائی اشیاء میں ہے۔ (ملاحظہ ہو المغنی لابن قدامہ: ۴/۲۲۲، نووی شرح مسلم: ۱۱/۴۳)

لیکن امام ابو یوسفؒ کے نزدیک احتکار کی حرمت صرف غذائی اشیاء میں نہیں ہے بلکہ ہر وہ شے جس سے عامۃ الناس کو ضرر پہنچے اس کا چند ہاتھوں میں سمٹ جانا اور اس کو روک رکھنا احتکار اور حرام ہے۔ (رد المحتار: ۵/۲۸۲)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے احتکار کرنے والے کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿المحتکر ملعون﴾

(ابن ماجہ: ۲۱۵۳، مسند الداری: ۲/۱۹۵، کامل ابن عدی: ۵/۱۸۴۷، نصب الرایہ: ۴/۲۶۱، کنز العمال: ۴/۹۷)

''احتکار کرنے والے پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار۔''

ابن ماجہ ہی کی ایک اور روایت میں ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

''جو شخص احتکار کا جرم کرے اور مسلمانوں پر کھانے کی اشیاء کو روک دے اللہ تعالیٰ اس کو جذام اور افلاس میں مبتلا کرے۔''

(رواہ احمد فی مسندہ: ۱/۲۱، ابن ماجہ، رقم: ۲۱۵۵، اخرجہ البیہقی فی دلائل النبوۃ: ۵/۳۲۵، کنز العمال: ۴/۹۷)

قمار:

جوا جسے آج کل کی اصطلاح میں سٹہ بھی کہتے ہیں۔ یہ بھی احتکار ہی کی ایک جزئی ہے۔ سٹہ سے مراد جوئے کی وہ عام شکل نہیں جو مال سے کھیلا جاتا ہے بلکہ اس میں جوئے کی وہ تمام صورتیں داخل ہیں جو موجودہ زمانہ میں تجارت کے نام پر کھیلی جاتی ہیں۔ اس کو تجارتی جوا کہتے ہیں۔ اسلام میں ہر قسم کا جوا خواہ وہ تجارتی ہو یا غیر تجارتی، اسلام میں حرام ہے۔ یہ تجارتی جوا ملک کے معاشی نظام کو تباہ کرتا ہے جب کہ غیر تجارتی جوا گھروں اور خاندانوں کو تباہ و برباد کرتا ہے۔

سٹہ کیا ہے؟ سٹہ دراصل بیع قبل القبض کا نام ہے یعنی جو چیز قبضہ میں نہیں ہے اس کی خرید و فروخت کرنا۔ اسلام نے اس قسم کی بیع کو ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اناج خریدے وہ قبضہ سے قبل اس کو فروخت نہ کرے۔'' (مسلم، رقم: ۳۷۳۲)

سے کا یہ کام قمار ہوتا ہے، اور قمار کے بارے میں ارشاد ربانی ہے:

﴿یاایها الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوه لعلکم تفلحون﴾ (مائدہ:۹۰)

''اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بتوں کے پاس نصب شدہ پتھر اور فال کے تیر محض ناپاک ہیں شیطانی کاموں میں سے ہیں، سو تم ان سے اجتناب کرو تا کہ تم کامیاب ہو۔''

اس آیت میں جوئے کو بھی شراب کی طرح حرام قرار دیا گیا ہے۔ جوا کی تعریف یہ ہے کہ وہ کھیل جس میں یہ شرط ہو کہ مغلوب کی کوئی چیز غالب کو دی جائے گی، قمار اور میسر کہلاتی ہے۔ (التعریفات، میر سید شریف جرجانی: ص ۷۷)

یہی تعریف دوسرے لوگوں نے بھی کی ہے۔ قمار قمر سے ماخوذ ہے۔ اور قمر کبھی کم ہوتا ہے اور کبھی زیادہ، اور جوئے کو قمار اس لیے کہتے ہیں کہ جوا کھیلنے والوں میں سے ہر ایک اپنا مال اپنے ساتھی کو دینے اور اپنے ساتھی کا مال لینے کو شرط کے ساتھ جائز سمجھتا ہے، یہ نص قرآن سے حرام ہے۔ اور اگر صرف ایک جانب سے شرط لگائی جائے تو یہ جائز ہے۔ (ردالمحتار ۵/ ۲۵۸)

اس آیت میں دس وجوہ سے شراب اور جوئے کو حرام کیا گیا ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ جوئے سے ایک فریق کو بغیر کسی محنت اور عمل کے بہت فائدہ ہوتا ہے اور دوسرا فریق ناگہانی طور پر بہت بڑے نقصان سے دوچار ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے وہ ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں، اور بسا اوقات یہ دشمنی قتل اور خون ریزی کی طرف پہنچاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ شراب اور جوئے میں شخصی اور اجتماعی اور دینی اور دنیاوی بہت سی خرابیاں ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اس باب میں یورپ نے اسلام کے قانون سے باغی ہو کر اپنے ہاتھوں اپنا جو حال کیا ہے اور کر رہا ہے وہ ظاہر ہے۔ خودکشی اور اقدام خودکشی کے کتنے واقعات قمار بازی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ پھر مالی ابتری کا اندازہ اس سے کیجیے کہ یورپ کی پہلی جنگ عظیم سے اکیلے انگلستان سے متعلق تخمینہ ہے کہ کم از کم دس کروڑ پونڈ سالانہ کی رقم اپنے مالکوں کے قبضہ سے نکل کر جواریوں کے ہاتھ میں پہنچتی ہے۔ یہ تخمینہ یورپ کے

صرف ایک ملک اور ایک چھوٹے سے رقبہ سے متعلق ہے اور وہ بھی جنگ عظیم سے قبل کا۔

خلاصہ یہ کہ اسلام میں اس قسم کے تمام تجارتی کاروبار کے لیے مطلق کوئی گنجائش نہیں جو صریح قمار اور جوا ہوں یا ان کی تہ میں مال بٹورنے کا وہی جذبہ کارفرما ہو جو قمار میں پایا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں ہر قسم کی لاٹری بھی قمار میں داخل ہے جس کی کئی صورتیں بازاروں میں رائج ہیں۔ آج کل وبا کی طرح قمار کی ایک صورت معمول کی شکل میں عام ہوگئی ہے۔ بعض شہروں میں بچے اخروٹ اور کانچ کی گولیوں وغیرہ سے ہار جیت کرتے ہیں اور اس پر شرطیں لگاتے ہیں۔ یہ بھی قمار وغیرہ میں داخل ہے۔ آج کل تو کرکٹ اور دوسرے کھیلوں پر بھی شرطیں لگائی جاتی ہیں۔ یہ سب حرام ہیں اور اس میں کسی قسم کی اعانت بھی حرام ہے۔

لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھانا:

قرآن حکیم نے ایک ایسی اصطلاح استعمال کی ہے کہ لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھانا، اس کی رو سے ہر وہ مال لینے والے کے لیے ناجائز اور حرام ہے جو دوسرے سے غلط اور باطل طریق سے لیا جائے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وتدلوا بها الی الحکام، لتاکلوا فریقاً من اموال الناس بالاثم، وانتم تعلمون﴾ (بقرہ: ۱۸۸)

''اور ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق کھاؤ اور نہ (بہ طور رشوت) وہ مال حاکموں کو دو تاکہ تم جان بوجھ کر لوگوں کا کچھ مال گناہ کے ساتھ کھاؤ۔''

اس بارے میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لایحل مال امرئ مسلم الا بطیبة نفس منه﴾

(رواہ احمد: ۵/۷۲، تفسیر قرطبی: ۱۲/۳۱۳، مجمع الزوائد: ۳/۲۶۸)

''کسی مسلمان کا مال دوسرے کے لیے جائز نہیں ہے مگر طیب نفس

اور رضامندی کے ساتھ۔"

لہٰذا جو مال دوسرا شخص خوش دلی اور رضامندی سے نہ دے وہ جائز نہیں ہے۔

خرید وفروخت میں جھوٹ بولنا:

اسلام میں تجارت اسلامی نظام معیشت کا جزو اعظم ہے۔ اس وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ:

"اس دنیا میں تجارت تمام معاشی اعمال میں سب سے بڑا وسیلۂ معاش ہے اور تمدن وحضارت کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب ہے۔"

اس وجہ سے اسلام نے تجارت کی بڑی ترغیب دی کیونکہ اقتصادی اور معاشی ترقی کا راز سب سے زیادہ تجارت ہی میں مضمر ہے۔ چنانچہ اسلام میں ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مال اور املاک کو مزید نفع کمانے اور اس طرح اپنی ملکیت اور مال میں اضافہ کرنے کے لیے استعمال کرے۔ وہ اپنے مال سے خود تجارت کر سکتا ہے اور دوسرے کاروباری شخص کے واسطے سے بھی اپنا منشاء پورا کر سکتا ہے۔ لیکن اس نے مال کمانے پر یہ قدغن لگا دی کہ "اپنے مالوں کو آپس میں باطل طریقوں سے نہ کھاؤ بلکہ باہمی رضامندی کے ساتھ تجارت کی راہ سے نفع حاصل کرو۔ (النساء:)

اس آیت میں ایک لفظ "بالباطل" فرما کر تمام ناجائز طریقوں سے حاصل کیے ہوئے مال کو حرام قرار دے دیا۔ ان ناجائز طریقوں کی تفصیل حدیث میں آئی ہے۔ آیت کے پہلے جملہ میں ناحق اور ناجائز طریقوں سے کسی کے مال میں تصرف کرنے کو حرام قرار دیا گیا۔ دوسرے جملہ میں جائز طریقوں کو حرمت سے مستثنیٰ کرنے کے لیے ارشاد فرمایا: "الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم" یعنی دوسروں کا وہ مال حرام نہیں جو بذریعہ تجارت باہمی رضامندی سے حاصل کیا گیا ہو۔ چنانچہ تجارت کی حدیث میں بڑی فضیلت آئی ہے، اور سچے اور امانت دار تاجر کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ قیامت کے روز نبیوں، صدیقوں، شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔ ایک اور حدیث میں جو سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"سب سے زیادہ پاک کمائی تاجروں کی کمائی ہے بشرطیکہ وہ جب بات کریں تو جھوٹ نہ بولیں، اور جب وعدہ کریں تو وعدہ خلافی نہ کریں اور جب ان کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت نہ کریں، اور جب کوئی سامان کسی سے خریدیں تو (تاجروں کی عادت کے مطابق) اس سامان کو برا اور خراب نہ بتائیں، اور جب اپنا سامان فروخت کریں تو واقعہ کے خلاف اس کی تعریف نہ کریں، اور جب ان کے ذمہ کسی کا قرض ہو تو اس کو ٹالیں نہیں، اور جب ان کا قرض کسی کے ذمہ ہو تو اس کو تنگ نہ کریں۔" (حاشیہ تفسیر مظہری)

اسلام نے تجارت کے لیے کچھ بنیادی اصول رکھے ہیں جو کاروبار کی صحت اور درستی کے لیے نہایت ضروری ہیں۔

1- تجارت کا جواز چونکہ باہمی تعاون پر مبنی ہے لہٰذا تجارت کے تمام معاملات میں جانبین سے تعاون کا وجود ضروری ہے یعنی یہ نہ ہونا چاہیے کہ ایک فریق کی طرف سے تعاون ہو اور دوسرے کی طرف سے تعاون نہ ہو۔

2- تجارت میں جانبین سے حقیقی رضا کا وجود ضروری ہے، اضطراری رضا معتبر نہیں کیونکہ قرآن نے باہمی رضامندی کی شرط لگائی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ:

﴿نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع المضطر﴾

(ابوداؤد، کتاب البیوع)

"رسول اللہ ﷺ نے زبردستی اور جبری بیع سے منع فرمایا۔"

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہؒ جبری اور اضطراری رضا کو اسلامی نقطۂ نظر سے غیر معتبر قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"اس لیے کہ "مفلس" مضطر اور مجبور ہوتا ہے کہ جس شے کے پورا کرنے پر قدرت نہیں رکھتا اس کو اپنی بے چارگی کی وجہ سے اپنے ذمہ واجب کر لیتا ہے، اور یہ رضا ہرگز حقیقی رضا نہیں ہے۔ پس سود جیسا معاملہ ناپسندیدہ معاملات میں سے ہے اور نہ کاروبار کے صالح اور درست معاملات میں سے ہے، اور بلا شک وشبہ

یہ معاملہ باطل اور ظلم ہے۔(وانما ھو باطل و سحت)(حجۃ اللہ البالغہ ۲/۱۰۳)

3- ایک اور بنیادی اصول اسلام نے تجارت کا یہ رکھا ہے کہ نہ نقصان اٹھانا ہے اور نہ کسی کو نقصان پہنچانا ہے۔جیسا کہ حدیث میں ہے "لاضرر و لاضرار"

ان اصولوں کی روشنی میں اسلام نے کئی قسم کی خرید وفروخت کو جائز قرار نہیں دیا جیسے بیع ملامسہ، بیع منابذہ، دھوکے کی بیع، بیع پر بیع کرنا، بیع بخش، تلقی جلب کی ممانعت، قبضہ سے قبل کسی چیز کی فروخت، مجہول ڈھیر کی بیع، ظہور صلاحیت سے قبل درختوں پر پھلوں کی بیع، ہنڈی کی بیع، حرام چیزوں کی خرید وفروخت جیسے کتے کی بیع، شراب، خنزیر اور بتوں اور تصاویر کی خرید وفروخت وغیرہ۔

3- اپنی ملکیت میں تصرف کا طریقہ:

اسلام نے اپنے حق ملکیت میں تصرف کرنے پر بھی کچھ پابندیاں عائد کی ہیں، ان پابندیوں میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

اسراف وتبذیر:

اگرچہ ہمارا مال ہماری ملکیت ہے لیکن اسلام نے اس کے خرچ کرنے پر دو پابندیاں لگائیں۔ایک اسراف کی اور دوسری تبذیر کی۔ اسراف نام ہے ضروریات کی تکمیل کے لیے مقدار یا معیار کے اعتبار سے زائد از ضرورت مال صرف کرنے کا۔ سہولت، آرام اور زیب وزینت کے لیے مال صرف کرنا اسراف نہیں ہے بشرطیکہ اعتدال ملحوظ رکھا جائے۔ارشاد خداوندی ہے:

"کھاؤ، پیو اور اسراف نہ کرو، بے شک اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" (اعراف:۳۱)

ایک اور مقام پر فرمایا کہ" اللہ کے بندے وہ ہیں جو خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ ان دونوں کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔" (الفرقان:۶۷)

قرآن حکیم نے اپنی جائز اور حلال کمائی کو خرچ کرنے کو دو شرطوں کے ساتھ

مشروط کر دیا۔ ایک ''اسراف'' اور دوسری ''تبذیر'' علامہ ماوردی نے ''اسراف'' اور ''تبذیر'' کے باہمی فرق کو یوں بیان کیا ہے:

''کمیت یعنی مقدار خرچ میں حد سے تجاوز کرنا ''اسراف'' ہے، اور یہ ثبوت ہے اس عائد شدہ حقوق کی مقدار سے جہالت کا جو اس کے ذمہ ہیں، اور کیفیت یعنی مواقع صرف میں حد سے تجاوز کا نام ''تبذیر'' ہے، اور یہ شہادت ہے ان مواقع صرف سے نادان بننے کی جو صحیح اور حق مواقع ہیں۔'' (روح المعانی: ۱۵/۵۹)

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک لوگ ایسے مکان نہ بنانے لگیں جن کو وہ منقش کپڑوں کی مثل (آراستہ) کریں گے۔''

(الادب المفرد، بخاری: ص ۹۷)

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں گورنروں کو ایک خط لکھا تھا:

﴿ان لا تطیلوا بنانکم فانه من شر ایامکم﴾ (الادب المفرد: ۶۶)

''بلند و بالا عمارتیں نہ بناؤ کیونکہ یہ طرز زندگی بدترین زمانہ کی نشانی ہے۔''

معلوم ہوا کہ اسراف کی ممانعت کا مقصد انسان کو صرف مال میں ایک معتدل اور متوازن زندگی پر قائم رکھنا ہے۔ اسراف کے تین مختلف پہلو ہیں۔

1- مقدار یا وصف کے اعتبار سے حد اعتدال سے تجاوز
2- اہم ترین ضروریات کو نظر انداز کر کے غیر اہم امور پر مال خرچ کرنا
3- اجتماع کے عام معاشی حالات کے لحاظ سے فضول اخراجات۔

اسلام میں اسراف کی ان تینوں قسموں کی ممانعت کر دی گئی۔

اسلام اقتصاد اور میانہ روی اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے، مثلاً عام حالات میں خرچ آمدنی سے بڑھنا نہیں چاہیے۔ چنانچہ ارشاد نبوت ہے:

﴿الاقتصاد فی النفقه نصف المعیشة﴾

(کنز العمال عن ابن عمر، مجمع الزوائد: ۲۶۰/۱)

"(آمد و صرف میں) میانہ روی معاشی زندگی کی خوشگواری کا نصف حصہ ہے۔"

اسی طرح اسلام نے عیش کوشی سے بھی منع فرمایا۔ گویا اسلام نے انسان کو حق ملکیت دینے کے ساتھ اس پر عیش کوشی کی پابندی لگا دی۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

﴿ایاک والتنعم! فان عباد الله لیسوا بالمتنعمین﴾

(مسند احمد، ۵/۲۴۳)

"اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم نہیں دیا کہ ہم پتھر اور مٹی کو کپڑے پہنائیں۔"

بات دراصل یہ ہے کہ دنیا کی لذتوں میں انہماک ایک انسان کو آخرت کی زندگی سے غافل اور اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں سے بے پروا بنا دیتا ہے۔ اسی وجہ سے عیش کوش آدمی اپنی دولت کو مقاصد زندگی میں خرچ نہیں کرتا بلکہ ادھر ادھر خرچ کر کے ضائع کر دیتا ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ریشم و دیباج کے کپڑے نہ پہنو، سونے اور چاندی کے برتنوں میں پانی نہ پیو، نہ ان سے بنے ہوئے بڑے پیالوں میں کھانا کھاؤ، یہ سب دنیا کی زندگی میں ان دنیا پرستوں کے لیے ہے۔" (رواہ مسلم والبخاری وابوداؤد والترمذی)

یہ عیش کوشی کی زندگی تبذیر میں آتی ہے جس کے بارے میں قرآن کا فیصلہ ہے کہ "تبذیر کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔" (بنی اسرائیل: ۲۷)

(2) شح (بخل):

جس طرح اسلام نے اسراف و تبذیر کی ممانعت فرمائی اسی طرح مسلمان کو بخل اور شح سے سختی سے روکا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿ومن یوق شح نفسه، فاولئک هم المفلحون﴾ (تغابن: ۱۶)

"اور جو اپنے نفس کے بخل اور حرص سے بچا لیا گیا، پس وہی کامیاب ہے۔"

بخل اور شح کا مفہوم قریباً ایک ہی ہے، تاہم بعض حضرات کہتے ہیں کہ اپنے مال

کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنا بخل ہے، اور لوگوں کے مال کو ناجائز طریقے سے ہڑپ کر جانا شح ہے، اور یہ بخل سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنے مال میں سے زکوٰۃ ادا کرتا ہے اور حسب ضرورت صدقہ و خیرات کرتا ہے، اور مال حاصل کرنے کے لیے ناجائز حربے اور ذرائع اختیار نہیں کرتا ہے وہ گویا شح نفس سے بچ لیا گیا جو اس کے عند اللہ کامیاب ہونے کی دلیل ہے، اور اس کے برعکس رویہ بخل اور شح ہے جو انسان کی تباہی و بربادی کی علامت ہے۔ عصمنا اللہ منہ

اس سلسلہ میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''ظلم کرنے سے بچو اس لیے کہ ظلم قیامت کے اندھیروں کا باعث ہوگا۔

﴿واتقوا الشح، فان الشح اھلک من کان قبلکم، حملھم علیٰ ان سفکوا دماء ھم واستحلوا محارمھم﴾
(مسلم، رقم: ۲۵۷۸)

''اور شح (بخل اور حرص) سے بچو، اس لیے کہ اسی شح نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کر دیا۔ اس شح نے ہی انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ آپس میں خون ریزی کریں اور حرام کردہ چیزوں کو انہوں نے حلال کر لیا۔''

(3) اضاعۃ المال:

اسلام نے جہاں فرد کو ملکیت کا حق دیا وہاں اسے اپنی ملکیت کو ضائع کرنے کی بھی ممانعت فرما دی کیونکہ مالک حقیقی تو حق تعالیٰ ہیں، اور یہ مال انسان کے پاس ان کی امانت ہے، اور ایک امین کو امانت میں خیانت کا کوئی حق نہیں۔ قرآن حکیم میں مال کے ضائع کرنے کو فساد کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

''اور جب وہ لوٹ کر جاتا ہے تو زمین میں اس لیے دوڑ دھوپ کرتا پھرتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ و برباد کرے حالانکہ اللہ تعالیٰ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔'' (بقرہ: ۲۰۵)

حضرت شاہ ولی اللہ اور دوسرے کئی حضرات نے ''تولی'' کا مطلب حکومت اور اقتدار کیا ہے اس معنی سے مطلب یہ ہوگا کہ جب اس کو ملک میں اقتدار حاصل ہوتا ہے تو وہ اس بات کی سعی وکوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے (یعنی فیملی پلاننگ کرے)

حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے صراحت سے فرمایا کہ ''مال کو ضائع کرنا ممنوع ہے۔'' (الادب المفرد، ۲۵)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تین چیزوں کو تمہارے لیے پسند فرماتے ہیں اور تین چیزوں کو ناپسند۔ پس جن تین چیزوں کو پسند فرماتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ تم صرف اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور تم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور تشتت وافتراق کا شکار نہ ہو جاؤ، اور تمہاری جن تین چیزوں کو ناپسند فرماتے ہیں وہ یہ ہیں:

﴿قیل و قال، و کثرۃ السوال، و اضاعۃ المال﴾

(مسلم، رقم: ۱۷۱۵)

''قیل وقال کرنا، زیادہ سوال کرنا اور مال کو ضائع کرنا۔''

محدثین نے مال کو ضائع کرنے کا مطلب یہ لکھا ہے:

''اضاعت مال سے مراد مال کو غیر شرعی طور پر صرف کرنا اور بے جا تلف کرنا ہے۔ ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ یہ معاشرہ میں بگاڑ اور فساد پیدا کرنے کے مترادف ہے، اور حق تعالیٰ شانہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ علاوہ ازیں جب کوئی شخص اپنا مال ضائع کر دے گا تو پھر وہ کسی دوسرے کے مال پر قبضہ کرنے کی فکر میں لگ جائے گا۔'' (نووی شرح مسلم)

قرآن حکیم میں ہے:

''تمہارے مال جن کو اللہ نے تمہاری زندگی کے قیام کا ذریعہ بنایا۔'' (النساء:۵)

معلوم ہوا کہ مال ایک نہایت مفید شے ہے۔ اس سے بہت سے دینی کام ہو سکتے ہیں۔ مفید اشیاء کو ضائع اور تلف کرنا انسانیت کا مشترکہ نقصان ہے۔ لہٰذا مال کو ضائع

کرنے سے منع کیا گیا۔

اسلام کے بالمقابل سرمایہ دارانہ نظام میں ملکیت کا مطلق تصور دیا گیا جو حدود و قیود سے نا آشنا ہے لیکن اسلام میں جو تصور ملکیت ہے وہ محدود اور مقید ہے۔ اس میں مال کو ضائع اور تلف کرنے کی مطلق اجازت نہیں۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو اس کو حکومت وقت سے بھی پرسش ہوگی اور روز قیامت بھی مواخذہ ہوگا۔ جن ممالک میں سرمایہ دارانہ نظام رائج ہے، وہاں اموال تجارت اور صنعتی اور زرعی پیداوار کو بجائے غرباء اور فقراء کو دینے یا انہیں سستا فروخت کرنے سے منع کرتے ہیں تا کہ مجموعی منافع میں اضافہ ہو جائے۔ اسلام میں اس طرح مال کو ضائع کرنے سے روکا گیا۔

(4) دوسروں کو ضرر اور نقصان دینا:

اسلام نے انفرادی ملکیت پر یہ قدغن لگا دی کہ اس سے دوسروں کو ضرر نہ پہنچے۔ چنانچہ کسی مالک کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی ملکیت میں اس قسم کا تصرف کرے جس سے دوسروں کو نقصان پہنچے یا ان پر کسی قسم کی زیادتی ہو، بلکہ اسلام تو ایسی ملکیت مالک سے چھیننے کا بھی حق رکھتا ہے جس سے مفاد عامہ کو ضرر اور نقصان پہنچے، چنانچہ سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے یہ معاملہ کیا۔

واقعہ یہ ہوا کہ سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ انصار کے ایک شخص کے باغ میں ان کا ایک کھجور کا درخت تھا۔ سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ اکثر و بیشتر اس باغ میں جاتے جس سے باغ کے مالک کو بڑی اذیت اٹھانی پڑتی۔ باغ والے نے اس بارے میں جناب رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی۔ آپ ﷺ نے سمرہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر کہا کہ تم یہ درخت باغ کے مالک کے ہاتھ فروخت کر دو۔ انہوں نے بیچنے سے انکار کر دیا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تم اس کو کہیں اور منتقل کر دو۔ انہوں نے اس بات سے بھی انکار کیا۔ آپ ﷺ نے ان کو ترغیب کے طور پر فرمایا کہ اس طرح تمہیں اور اس کو بہت فائدہ ہوگا لیکن سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ برابر انکار کرتے رہے۔ آخر آپ نے فرمایا کہ تو اس باغ والے کے نقصان کا باعث ہے۔ آپ نے انصاری سے کہا: ''جا کر اس کا درخت جڑ

سے اکھڑ دو۔" (رواہ ابو داؤد، رقم ۳۶۳۶)

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ضحاک بن خلیفہ انصاری کا ہے۔ ان کی زمین تک پانی سیدنا محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کے باغ سے ہو کر جاتا تھا۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اپنے باغ کے راستے سے اس پانی کے جانے کو روک دیا۔ سیدنا ضحاک نے اس بارے میں سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ انہوں نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر کہا کہ تم اپنے باغ میں سے پانی گزرنے کی اجازت دے دو؟ انہوں نے انکار کر دیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! اگر اس کے پانی گزرنے کی تم نے اجازت نہ دی تو میں تیرے پیٹ کے اوپر سے اس کو گزار دوں گا۔ (موطا امام مالک)

پڑوسی کے لیے حق شفعہ:

اسلام میں پڑوسی کا بڑا حق رکھا گیا ہے۔ (النساء: ۳۶) اس بارے میں رسول اللہ ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا:

﴿مازال جبریل یوصینی بالجار حتی ظننت انه سیورثه﴾

(بخاری، رقم ۶۰۱۴، مسلم ۲۶۲۴)

"مجھے جبرئیل برابر پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنے کی وصیت کرتے رہے یہاں تک کہ میں یہ گمان کرنے لگا کہ وہ اسے وراثت کا مستحق قرار دے دیں گے۔"

اور سیدنا امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ اپنی اونٹنی پر سوار تھے۔ اس حالت میں میں نے آپ کو فرماتے ہوئے سنا:

"لوگو! میں تمہیں پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کرتا ہوں۔"

آپ ﷺ نے یہ کئی بار فرمایا اور اتنی زور دے کر فرمایا کہ میں سمجھنے لگا کہ آپ اسے وراثت میں حق دار قرار دے دیں گے۔

(ترمذی، رقم ۱۹۴۳، ابو داؤد، رقم ۵۱۵۲، مسند احمد ۵/۲۶۷)

پڑوسی کے اور بھی بہت سے حقوق ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔ انہی حقوق میں

سے ایک حق شفعہ ہے۔ اسلام نے پڑوسی کی ملکیت پر یہ قید لگا دی ہے کہ اگر وہ اپنی کسی ملکیت کو فروخت کرے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے اپنے پڑوسی سے پوچھے۔ اگر اس نے پڑوسی کو فروخت سے قبل نہیں پوچھا تو شریعت نے پڑوسی کو شفعہ کا حق دیا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿الجار احق بسقبه﴾ (بخاری: ۲۲۵۸)

”کیونکہ پڑوسی قریب ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ حق دار ہے۔“

مصلحت عامہ کے تحت بعض ملکیت ختم کی جا سکتی ہے:

اسلام یہ چاہتا ہے کہ زمینیں آباد ہوں اور مخلوق خدا کو رزق کی کوئی تنگی نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل تمام دنیا میں جاگیرداری اور زمینداری کا نظام رائج تھا۔ اس نظام کی وجہ سے زمین زمینداروں اور جاگیرداروں کے ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ گئی اور کاشت کاروں اور ہاریوں کا طبقہ جبر وتحکم اور تشدد واستبداد کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہر قسم کے وحشیانہ مظالم برداشت کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس طبقہ کو نہ زمین چھوڑ کر دوسرا پیشہ تبدیل کرنے کا اختیار تھا اور نہ اپنے آقا سے سرخروئی کی امید۔

جبر واستبداد کی اس فضا میں اسلام ایک عالمگیر انقلاب کی شکل میں امانت و عدالت، افادیت ورحمت، اخوت ومساوات اور ایثار وقربانی کا پیغام لے کر ”وادی غیر ذی زرع“ میں نمودار ہوا، اور تھوڑی ہی عرصہ کے بعد اس نے دنیا کی زہریلی ہواؤں کو نسیم سحر کے جھونکوں میں تبدیل کر دیا اور ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس میں نہ تو ملکیت کی آڑ میں جور واستبداد کی گنجائش باقی رہ گئی اور نہ روٹی کی خاطر انسان غیر اللہ کی غلامی پر مجبور رہا۔

اسلام میں جاگیریں تو ملتی ہیں جو لوگوں کو مفاد عامہ کے پیش نظر اسلامی ریاست کی طرف سے دی جاتی ہیں جن کو عربی میں ”قطائع“ کہتے ہیں، لیکن جاگیرداری نظام کو یک قلم ختم کیا کیونکہ جو جاگیریں اسلامی ریاست کی طرف سے دی جاتیں ان کے انتظام کی دو صورتیں رائج تھیں:

(1) کسی کو کاشت کے لیے زمین دی جاتی تھی اور وہ خود اس پر کاشت کرتا تھا۔

(2) اگر مفاد عامہ کی کوئی خدمت سپرد ہونے کی بنا پر وہ خود کاشت نہ کر سکتا تو دوسرے کے ذریعہ سے کاشت کراتا تھا، اور آمدنی یا پیداوار میں دونوں شریک ہوتے تھے۔

اسلامی ریاست میں کبھی تو اس جاگیر کی یہ صورت ہوتی کہ صرف زمین کی منفعت کا مالک بنایا جاتا اور ذات زمین پر کسی قسم کے تصرف بیع، ہبہ وغیرہ کا اختیار نہ ہوتا تھا، اور کبھی زمین اور اس کی منفعت دونوں کا مالک بنا دیا جاتا۔ اس صورت میں ہر قسم کے تصرفات جیسے بیع اور ہبہ وغیرہ کے اختیارات بھی اس کو حاصل ہوتے۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں مفاد عامہ کا نظریہ مضمر ہوتا، اور وہ نظریہ اکثر و بیشتر بنجر زمین کے احیاء کا ہوتا، لیکن اس میں گورنمنٹ کا ٹیکس ضرور لیا جاتا۔ چنانچہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

﴿الاقطاع اعطاء الارض للاحیاء سواء وجب فیه العشر او الخراج﴾ (فیض الباری: ۳/ ۳۰۸)

''اقطاع کسی کو آباد کاری کے لیے زمین دینا خواہ اس میں عشر واجب ہو یا خراج۔''

اجتماعی مفاد کے لیے خلیفہ کے اختیارات بہ نسبت دوسری زمینوں کے ''قطائع'' پر زیادہ ہوتے تھے۔ چنانچہ انہی اختیارات کے پیش نظر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے دیئے ہوئے بعض قطائع کو جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے واپس لے لیا تھا، اور اس واپسی پر مفاد عامہ کے علاوہ اور کوئی جذبہ کارفرما نہ تھا۔ جس طرح رسول اللہ نے مفاد عامہ کی خاطر ''جاگیر'' دی تھی اسی طرح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مفاد عامہ کے پیش نظر واپس لے لیا تھا۔ گویا کہ جاگیر دینے اور اس کے لینے دونوں میں مفاد عامہ کی روح کارفرما تھی۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے سیدنا بلال بن حارث المزنی رضی اللہ عنہ کو پوری وادی عقیق جاگیر میں دے دی لیکن وہ اس کا ½ حصہ آباد نہ کر سکے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں ان سے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو یہ زمین اس لیے نہ دی تھی کہ نہ خود اس کو آباد کریں اور نہ کسی دوسرے کو آباد کرنے دیں، لہٰذا جتنی زمین آپ آباد کر سکتے ہیں اتنی اپنے پاس رکھیں اور بقیہ ریاست کو واپس کر دیں۔

بات صاف تھی اور مفاد عامہ کے حق میں تھی لیکن یہ سن کر سیدنا بلال بن حارث ؓ نے کہا: ''میں رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی زمین کبھی واپس نہیں کروں گا خواہ میں اس کو آباد کروں یا نہ کروں۔'' سیدنا عمرؓ نے واپسی پر بہت اصرار کیا اور بلآخر آباد شدہ حصہ چھوڑ کر باقی تمام زمین واپس لے لی۔

(کتاب الاموال ص ۲۹۰، کتاب الخراج لابی یعلی ۹۳)

ایسے ہی اور کئی واقعات کتابوں میں ملتے ہیں کہ ایک شخص کو سرکار دو عالم ﷺ نے قطعہ زمین دیا اور سیدنا عمرؓ نے آباد شدہ حصہ کو چھوڑ کر بقیہ زمین واپس لے لی۔ (کتاب الخراج لابی یعلی موصلی ۷۸)

حقوق متعلقہ ملکیت

اسلام نے اقتصادی توازن برقرار رکھنے اور مفاد عامہ کے لیے انسان کی ملکیت پر کچھ حقوق فرض کیے ہیں تاکہ ریاست کے محتاجوں، غرباء اور فقراء کی ضروریات زندگی مہیا کی جاسکیں اور اہل دولت اور اغنیاء فقراء اور غرباء کے بارے میں اپنے ان حقوق کے بارگراں سے سبکدوش ہوسکیں جو شریعت اسلامیہ نے مالدار ہونے کی وجہ سے ان پر عائد کیے ہیں۔ وہ حقوق حسب ذیل ہیں:

(1) زکوۃ:

موجودہ دنیا میں جس قدر بھی نظام ہائے معیشت رائج ہیں، ان سب میں ایک خرابی بہ درجۂ اتم موجود ہے، اور وہ خرابی ہے ارتکاز دولت یعنی دولت کا چند ہاتھوں میں سمٹاؤ۔ اشتراکیت تو دنیا میں ایک صدی کے اندر اندر فیل ہوگئی، اور سرمایہ دارانہ نظام نے غریبوں، مزدوروں، کاشت کاروں اور ہاریوں کی زندگی اجیرن کی ہوئی ہے کہ غریب روز بروز غریب تر ہوتا جا رہا ہے، اور دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی ہے، جس کے اثرات معاشرہ پر بہت برے پڑ رہے ہیں۔ اسلام ہی دنیا میں ایک ایسا نظام معیشت پیش کرتا ہے جس میں کسی صورت ارتکاز دولت نہیں ہوتا۔ بلکہ دولت کے ارتکاز کو روکنے کے لیے اور دولت کی گردش میں اضافہ کرنے اور معاشرہ میں دولت کی منصفانہ تقسیم کے لیے بڑے موثر اقدامات تجویز کیے گئے ہیں۔ ان اقدامات میں ایک نظام زکوۃ ہے۔

مالی عبادات میں سب سے پہلی چیز زکوۃ ہے اور اسلام میں نماز کے بعد جو

فریضہ سب سے اہم ہے، وہ زکوۃ ہے۔ نماز حقوق اللہ میں سے ہے جب کہ زکوۃ حقوق العباد میں سے ہے، اور یہ دونوں آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ قرآن حکیم میں بیس (20) مقامات پر اقامت صلوۃ کے ساتھ ایتاء زکوۃ کا ذکر ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں زکوۃ کی کیا اہمیت ہے۔ وفد عبدالقیس نے 5ھ میں بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے نماز اور پھر زکوۃ کا بیان فرمایا۔ (بخاری: ۱/۱۸۸)

سورۃ التوبہ آیت 34-35 میں اس مال کو کنز کہا گیا ہے جس کی زکوۃ نہ دی جائے۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں حدیث ہے کہ جس مال کی زکوۃ نکال دی جائے وہ مال کنز میں داخل نہیں ہے۔ امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ ''کنز'' کا مطلب ہے مال کو اوپر تلے رکھنا، مال جمع کر کے اس کی حفاظت کرنا۔ چنانچہ خزانہ کو ''کنز'' کہتے ہیں۔ احادیث نبویہ میں ان لوگوں کی سخت مذمت آئی ہے جو مال تو جمع کرتے ہیں لیکن اس کی زکوۃ ادا نہیں کرتے۔ چنانچہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا اور اس نے اس کی زکوۃ ادا نہیں کی، قیامت کے روز اس کے لیے ایک گنجا سانپ بنایا جائے گا جس کے دو زہریلے ڈنگ ہوں گے۔ اس سانپ کو اس کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا، پھر وہ اس کو اپنے جبڑوں سے پکڑے گا اور کہے گا: ''میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔'' پھر رسول اللہ ﷺ قرآن کی آیت نمبر 314 پڑھی۔

(بخاری، رقم: ۱۴۰۳، نسائی، رقم: ۲۴۸۲، موطا امام مالک، رقم: ۳۰۵، ابن خزیمہ، رقم: ۲۲۵۷، مسند احمد بن حنبل: ۲/۹۸، التمہید لابن عبدالبر: ۲/۵۴۲)

زکوۃ کو مال کا حق کہا گیا، اور مال کا حق کیا ہے؟ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تم نے اپنے مال کی زکوۃ ادا کر دی تو تم نے اس حق کو ادا کر دیا جو تم پر واجب تھا۔''

(ترمذی، رقم: ۶۱۸، ابن ماجہ: ۱۷۸۸، معرفۃ السنن والآثار بیہقی، رقم: ۸۴۲۷، سنن کبری بیہقی: ۴/۸۴، شرح السنۃ بغوی: ۶/۷۴، ابن حبان: ۳۲۱۸، مستدرک حاکم: ۱/۳۹۰، التمہید لابن عبدالبر: ۴/۲۱۱)

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ایک اسلامی ریاست کی غرض و غایت ہی یہ بیان فرمائی:

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہو جائے تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، اور نیک کاموں کا حکم دیں گے اور برے کاموں سے روکیں گے، اور تمام امور کا انجام تو اللہ ہی کے پاس ہے۔''

(حج:۴۱)

زکوٰۃ کی اہمیت کے پیش نظر امام نوویؒ فرماتے ہیں:

''جس نے زکوٰۃ کے وجوب کا انکار کیا اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تکذیب کی، لہٰذا اس کے کفر کا حکم دیا جائے گا۔'' (المجموع: ۵/۳۳۴)

(2) خراج:

خراج کی عام لفظوں میں یہ تعریف ہے کہ خراج اس کرایہ کا نام ہے جو اسلامی ریاست اپنی مملوکہ زمین پر وصول کرتی ہے۔ (الخراج فی الدولۃ الاسلامیۃ: ۱۵۶)

خراجی زمینیں وہ ہیں جن کے غیر مسلم مالکوں سے صلح کر لی گئی ہو یا جن کو بزور قوت فتح کرنے کے بعد خلیفہ نے ان کے سابق مالکوں کے قبضہ میں رہنے دیا ہو۔ ان زمینوں پر ان شرحوں کے مطابق محصول (خراج) وصول کیا جائے گا جو از روئے معاہدہ طے پائی ہوں یا جو خلیفہ نے مقرر کر دی ہوں۔ (کتاب الاموال ۵۵، ۴۸)

کرایہ دار کی حیثیت عام کرایہ داروں جیسی بھی ہو سکتی ہے اور موروثی کاشتکاروں جیسی بھی۔ جو غیر مسلم کاشت کار اپنی زمینوں کے مالک نہ ہوں بلکہ اسلامی حکومت کی مملوکہ زمین پر کرایہ دار یا موروثی کاشت کار کی حیثیت سے کاشت کر رہے ہوں، ان سے حکومت اس زمین کا کرایہ وصول کرے گی جسے خراج کہا جاتا ہے، اس کرایہ کی کوئی شرح شریعت نے متعین نہیں کی ہے بلکہ مختلف زمانوں میں زمین کی کیفیت کے لحاظ سے حکومت خراج کی مختلف شرائط طے کر سکتی ہے۔ البتہ اس شرح کے تعین میں کاشت کار کی ضروریات اور زمین کی کیفیت کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

جو غیر مسلم فوجی کشمکش کے بعد اسلامی اقتدار کے تحت آئے ہوں، ان کی زمینیں ان کی ملکیت نہیں رہ جاتیں بلکہ اسلامی ریاست کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہیں۔ خراج کا تعلق اصلاً ایسی ہی زمینوں سے ہے۔

(کتاب الاموال: ۳۲۸، ۲۷۹، الخراج فی الدولۃ الاسلامیۃ: ص ۱۱۱، ضیاء الدین الریس)

سرکار دو عالم ﷺ نے جب خیبر فتح کیا تو وہاں کے یہودیوں نے کہا کہ ہم ان زمینوں کے مالک ہیں۔ ان کو کاشت کرنا ہم تم لوگوں سے زیادہ بہتر جانتے ہیں لہٰذا تم ان کو ہمارے قبضہ ہی میں رہنے دو اور ہمارے ساتھ بٹائی پر معاملہ کر لو۔ سرکار دو عالم ﷺ نے ان کی یہ درخواست منظور فرمائی اور نصف پیداوار پر معاملہ طے ہو گیا۔ اسی طرح فدک کے لوگوں نے بھی بٹائی پر آپ سے معاملہ طے کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ کا ان سے یہ معاملہ مزارعت کی قسم کا ہے جسے اہل مدینہ "مساقات" کہتے ہیں۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے خیبر کی پیداوار کا تخمینہ چالیس ہزار وسق لگایا تھا۔ (ایک وسق 23 من کے برابر ہے)

(کتاب الاموال: ص ۴۰۸، کتاب الخراج ابی یوسف: ص ۵۰)

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے عہد خلافت میں ان لوگوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا۔ (کتاب الخراج ابی یوسف: ص ۵۰)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جب شام اور عراق کے علاقوں کو فتح کیا تو پہلے تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ ہی سے ان پر سرسری طور پر کچھ رقم مقرر کر دی گئی تھی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے اپنی مجلس مشاورت سے کہا کہ مجھے کوئی ایسا ماہر اور دانش مند شخص بتایئے جو ان زمینوں کا مناسب طور پر بندوبست کرے، اور کاشت کاروں پر ان کی برداشت کے مطابق خراج تجویز کر دے۔ سب حضرات نے بالاتفاق سیدنا عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کا نام پیش کیا۔ انہوں نے عراق و شام کا بندوبست کیا۔ ان کی معاونت کے لیے سیدنا حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ ان دونوں حضرات نے عراق کا جو بندوبست کیا وہ کچھ اس طرح تھا، رقبہ طول میں 375 میل، اور عرض میں 240 میل یعنی 3000 میل مربع ناپ لیا گیا، اور پہاڑ، صحرا اور نہروں کو چھوڑ کر قابل زراعت رقبہ تین

فرمایا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

﴿في مالك حق سوى الزكوة﴾ (محلی لابن حزم ۱۸۵/۶)

"تیرے مال میں زکوۃ کے علاوہ بھی حقوق ہیں (جو ٹیکسوں اور صدقات نافلہ کی صورت میں ادا کیے جا سکتے ہیں۔)"

بہت سے ائمہ فقہ نے بھی لکھا ہے کہ جب دشمن سے جنگ ہو اور خزانہ حکومت میں مال کی کمی ہو تو رئیس حکومت کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ زکوۃ اور خراج کے علاوہ ٹیکس بھی زبردستی لے سکتا ہے۔

(کتاب ابن تیمیہ شیخ محمد ابوزہرہ ص ۲۷۲ حقوق الانسان فی الاسلام للوافی ص ۷۷)

جزیہ:

اسلامی ریاست کے غیر مسلموں (ذمیوں) سے ان کی جان و مال کی حفاظت کا ایک ٹیکس وصول کیا جاتا ہے جس کو جزیہ کہتے ہیں۔ یہ جزیہ صرف ایسے مردوں پر لگایا جاتا ہے جو فوجی خدمت کے قابل ہوں، اس لیے عورتیں، بچے اور بوڑھے اس سے مستثنیٰ ہیں، اور وہ تمام لوگ جیسے مسکین، غریب اور اپاہج وغیرہ جو مال نہیں رکھتے وہ بھی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ نادار اور مذہبی پیشواؤں کو بھی اس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

جزیہ پر غیر مسلموں کی رضامندی کا اظہار اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے اپنے علاقہ پر اسلام کی سیادت کو تسلیم کر لیا ہے، لیکن اگر انہوں نے جزیہ دینے سے انکار کر دیا تو ان کے خلاف جنگ جائز ہوگی۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں فرمایا تھا کہ جو لوگ تمہیں جزیہ دیں ان سے جزیہ قبول کرو، اور جو جنگ پر اتر آئیں ان سے جنگ کرو۔ (سنن سعید بن منصور، ۲۴۴/۲)

جزیہ اور خراج دونوں غیر مسلموں سے وصول کیے جاتے ہیں لیکن ان دونوں میں فرق ہے۔ خراج زمین کا ٹیکس ہے۔ چنانچہ بعد میں اگر مالک زمین اسلام بھی قبول کر لے پھر بھی اس کی زمین خراجی ہی رہتی ہے۔ لیکن جزیہ فرد کا ٹیکس ہے جو اس کی جان اور مال کی حفاظت کے عوض لیا جاتا ہے۔ چنانچہ جزیہ ادا کرنے والے ذمی کو فوجی خدمت سے

مستثنیٰ رکھا گیا ہے لیکن اگر وہ کوئی فوجی خدمت کے لیے تیار ہوں اور ریاست ان پر اعتماد کر سکتی ہو تو ان کو جزیہ سے بری کیا جا سکتا ہے۔ (الخراج، مولانا مودودی، ص ۱۱)

اگر کوئی ذمی مسلمان ہو جائے تو جزیہ اس سے ساقط ہو جائے گا جب کہ خراج ساقط نہیں ہوگا۔ اور دوسرا فرق یہ ہے کہ خراج سنت سے ثابت ہے قرآن حکیم میں اس کا کوئی ذکر نہیں جب کہ جزیہ کا ذکر خداوند قدوس نے قرآن حکیم میں کیا ہے۔ (توبہ ۲۹)

جزیہ کی اسلام میں کوئی شرح متعین نہیں۔ اس لیے وہ براہ راست سربراہ مملکت اور قوم کی صوابدید پر ہے۔ جیسے خلافت صدیقی میں فتح ہوا تو سیدنا خالد بن ولید ؓ نے ان لوگوں سے فی کس دس درہم کے حساب سے ان سے جزیہ وصول کر کے معاہدہ طے کر دیا۔

(کتاب الاموال ص ۴۷)

بہر حال اس کی شرح ذمیوں کی مالی حالت دیکھ کر ہی متعین کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ امام ابو یوسف نے سیدنا ابن عباس ؓ سے نقل کیا ہے کہ "ذمیوں کے مالوں میں سے صرف اتنا ہی لیا جائے جو ان کی ضرورت سے زائد ہو۔" (کتاب الخراج ابی یوسف، ص ۱۲۳)

دیگر صدقات:

اللہ تعالیٰ نے اغنیاء پر بعض مخصوص زمانوں میں کچھ صدقات ضروری قرار دیے ہیں جن سے فقراء اور مساکین کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اور ان صدقات کو شریعت نے واجب یا سنت مؤکدہ قرار دیا ہے جیسے صدقہ فطر، عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی اور حج کی ہدی (قربانی) وغیرہ۔ زکوۃ الفطر جس کو صدقہ فطر بھی کہتے ہیں یہ ۲ھ میں واجب قرار دی گئی۔ رمضان کے روزے بھی اسی سال فرض ہوئے۔ اس کے وجوب کا مقصود شارع کے نزدیک یہ ہے کہ روزہ دار لغو و رفث سے پاک و صاف ہو جائیں اور اس کا کفارہ ہو جائے اور مساکین اور حاجت مندوں کے لیے غذا اور دوسری ضروریات فراہم ہو جائیں اور وہ عید کے روز سوال کی ذلت سے بچ جائیں۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عباس ؓ کی حدیث سے بھی یہی ظاہر ہوتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے زکوۃ الفطر اس لیے فرض فرمائی کہ روزہ دار لغو و رفث سے پاک ہو جائے اور مساکین کو کھانا

میسر آ جائے۔ (رواہ ابوداؤد فی باب زکوٰۃ الفطر)

حاکم نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے (مستدرک حاکم: ۱/ ۴۰۹) اور کہا ہے کہ یہ حدیث بخاری کی شرائط کے مطابق ہے۔ حافظ ذہبیؒ نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے۔ امام دار قطنی نے بھی اپنی سنن: ص ۲۱۹ میں اس کو روایت کیا ہے۔

(مرقاۃ: ۴/ ۳/ ۷۷، نصب الرایہ: ۲/ ۴۱۱)

زکوٰۃ الفطر اور دوسری زکوٰۃ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ زکوٰۃ الفطر اشخاص اور افراد پر عائد ہوتی ہے جب کہ دوسری زکوٰۃ مال پر عائد ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے فطرانہ میں ملکیت نصاب وغیرہ کوئی شرائط نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے فقہاء نے اسے اشخاص کی زکوٰۃ کہا ہے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ الفطر کی فرضیت کا اعلان رمضان میں فرمایا کہ ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو ہر مسلمان آزاد اور غلام، مرد اور عورت پر فرض ہے۔

(رواہ الترمذی، رقم: ۶۷۰، وقال حدیث حسن صحیح)

شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک زکوٰۃ الفطر فرض ہے اور بعض شوافع اور بعض مالکیوں کے نزدیک صدقۂ فطر سنت۔ داؤد ظاہری کا بھی یہی قول ہے۔ (نووی: ۱/ ۳۱۷)

اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صدقۂ فطر واجب ہے۔ (ہدایہ مع فتح القدیر: ۲/ ۲۱۸)

ائمہ ثلاثہ چونکہ فرض اور واجب میں فرق نہیں کرتے اس لیے وہ صدقۂ فطر پر فرض اور واجب دونوں کا اطلاق کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کی نگاہ چونکہ دقیق اور گہری ہے، اس لیے وہ فرماتے ہیں کہ جس شے کا لزوم قرآن حکیم سے دلالت قطعیہ سے ثابت ہو وہ فرض ہے، اور جس چیز کا لزوم احادیث اور اخبار احاد سے ثابت ہو، وہ واجب ہے، اور صدقۂ فطر کا لزوم چونکہ احادیث سے ثابت ہے، اس لیے وہ واجب ہے۔

اور عید الاضحیٰ پر قربانی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿من وجد سعة لأن يضحي فلم يضح، فلا يحضر (وفي رواية فلا يقربن) مصلانا﴾

(رواہ الحاکم مرفوعاً و صححه موقوفاً، الترغیب والترہیب: ۱/ ۲۷۷)

والے کو بھی کھلاؤ۔ چنانچہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ انسان کو اپنی ہدی (قربانی) سے کھانا مستحب ہے اور اس میں اجر بھی ہے۔

صدقاتِ مستحبہ:

اسلام اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اغنیاء فقراء اور مساکین کے لیے صدقات دیں اور ان صدقات کو اللہ تعالیٰ نے اپنے قرب کا ذریعہ فرمایا ہے:

﴿وآتى المال على حبه ذوي القربى واليتامى والمساكين وابن السبيل، وفي الرقاب﴾ (بقرہ:۱۷۷)

''(یعنی نیکی اس شخص کی ہے جو) مال سے اپنی محبت کے باوجود (اللہ کے حکم سے) رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوالیوں اور غلام آزاد کرانے کے لیے خرچ کرے۔''

اسی طرح قرآن حکیم کی مختلف آیات میں صدقہ کرنے کی مبادرت اور جلدی کا حکم دیا، کسی آیت میں اس کے اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا۔

(ملاحظہ ہو سورۃ البقرہ: ۲۵۴، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۴، ۲۶۷، ۲۹۱)

ایک حدیث میں سیدنا حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اور (خرچ کرنے کی) ابتداء ان لوگوں سے کر جن کی کفالت تیرے ذمہ ہے، اور بہترین صدقہ وہ ہے جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد ہو، اور جو سوال سے بچنا چاہے اللہ تعالیٰ اسے بچا لیتا ہے، اور جو لوگوں سے بے نیازی اختیار کرے اللہ اسے بے نیاز کر دیتا ہے۔

(بخاری: ۲/۳۳۴، مسلم، رقم: ۱۰۳۴)

اسی طرح ایک اور حدیث سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں مکہ میں بیمار تھا اور رسول اللہ ﷺ میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنا سارا مال فقراء اور مساکین کے لیے

صدقہ کر دوں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔'' میں نے عرض کیا: ''آدھا مال۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔'' میں نے عرض کیا: ''ایک تہائی۔'' آپ نے فرمایا: ایک تہائی بہت ہے۔ اگر تم اپنے وارثوں کو غنی چھوڑ دو تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم انہیں غریب چھوڑ دو اور وہ لوگوں سے مانگتے پھریں۔ جو کچھ بھی تو ان پر خرچ کرے گا وہ صدقہ میں شمار ہوگا یہاں تک کہ وہ لقمہ جو تو اپنے اہلیہ کے منہ میں ڈالے۔''

(رواہ الترمذی، رقم: ۲۰۷۵، وقال حدیث حسن صحیح)

اس طریقہ سے اسلام نے اغنیاء کے اجر و ثواب کے لیے اور ان کے رزق میں زیادتی کے لیے اور محتاج اور فقراء کی حاجات کو پورا کرنے کے لیے تاکہ امراء و غرباء میں باہمی محبت و مودت قائم رہے، زکوٰۃ، صدقۂ فطر اور صدقات مستحبہ کی تاکید کی۔ اس کے ساتھ بعض گناہوں اور خطاؤں کے کفارہ کے طور پر مال خرچ کرنے کے لیے کہا تاکہ فقراء اور مساکین نہایت احسن طریق سے اپنی زندگی گزار سکیں۔ چنانچہ ظہار کا کفارہ رکھ کر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے اور قسم کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا رکھا گیا۔ جو لوگ کسی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتے وہ اپنے روزے کا فدیہ دیں اور ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ ایسے کئی گناہوں اور خطاؤں کی معافی اور بخشش کے کفارات رکھے جن سے مقصود فقراء اور غرباء کی خوش حالی ہے۔

وقف:

انفاق فی سبیل اللہ کے اخلاقی وسائل میں ایک بہترین وسیلہ وقف بھی ہے۔ اسلام میں اس کی بہت ترغیب دی گئی ہے۔ وقف کیا ہے؟ اپنی منقولہ یا غیر منقولہ ذاتی ملکیت سے کچھ حصہ نکال کر ''فی سبیل اللہ'' دے دینا، اسلامی اصطلاح میں وقف کہلاتا ہے۔ اس بارے میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی نے کیا خوب فرمایا ہے:

''ارباب ثروت کی شبانہ روز زندگی کا یہ نقشہ ہمارے سامنے ہے کہ ایک شخص اپنی پیدا کی ہوئی یا دوسرے جائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت کو اگرچہ اپنی ضروریات سے فاضل سمجھتا ہے پھر بھی دولت کی محبت اور سرمایہ کی فراہمی کا

عشق اکثر و بیشتر اس کو حاجت مندوں کی اعانت اور جماعت کے غریب افراد کی امداد کی جانب کسی طرح متوجہ نہیں ہونے دیتا، لیکن جب اس کا آخری وقت آتا ہے اور وہ موت کے فولادی پنجہ کی گرفت میں آکر مغلوب ہو جاتا ہے تو باحسرت و یاس اس دولت سے منہ موڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن اس صبح و شام پیش آنے والے منظر کے باوجود دولت میں سرشار دولت مندوں کو وقت سے پہلے اس کا تصور بھی نہیں آتا، اور یتامیٰ، بیوگان اور دوسرے حاجت مندوں کی فریادیں اس کی ہوس کے مستحکم قلعوں کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں، اس لیے اسلام اہل ثروت کے اجتماعی حقوق سے تغافل کو دور کرنے اور جذبات عالیہ اور اخلاق حسنہ کی روح پیدا کرنے کے لیے توجہ دلاتا ہے کہ اہل ثروت کی فاضل دولت کو کار خیر میں صرف کرنے اور اجتماعی حیات کو فروغ دینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ انسان موت کے فولادی پنجہ کی گرفت میں آنے سے قبل بحالت صحت و تندرستی اور بقاء ہوش و حواس اپنی دولت کا ایک حصہ "صدقۂ جاریہ" کر دے۔ اسی کا نام وقف ہے۔"

(اسلامی اقتصادی نظام: ص ۳۶۱۔۳۶۲)

وقف صدقۂ جاریہ کی ایک قسم ہے، اور صدقۂ جاریہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس کا اجر و ثواب انسان کو مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔"

(مسلم، رقم: ۱۶۳۱، مسند احمد: ۳۷۲/۲، ابوداود، رقم: ۲۸۸۰، ترمذی، رقم: ۱۳۷۶، نسائی: ۲۵۱/۵)

اسلام میں سب سے پہلے واقف سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہیں جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر میں کچھ زمین ملی۔ آپ نے سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: "یا رسول اللہ! میرا سب سے زیادہ عزیز اور بہتر مال وہ ہے جو خیبر میں میری جاگیر ہے۔ میں اس کو اللہ کی راہ میں صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ فرمائیں کیا کروں؟" آپ نے ارشاد فرمایا: "اصل زمین کو اپنے قبضہ میں رکھو اور اس کی پیداوار اناج اور پھل وغیرہ اللہ کی راہ میں وقف کر دو۔ چنانچہ سیدنا

عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو وقف کر دیا اس شرط کے ساتھ کہ اس زمین کو نہ فروخت کیا جائے اور نہ وراثت اس میں جاری ہو اور نہ کسی کو ہبہ کیا جائے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فقراء، رشتہ داروں، قیدیوں، ناداروں اور مسافروں کے لیے اس زمین کی پیداوار کو وقف کر دیا۔

(رواہ البخاری: ۹۸۲/۲، ومسلم)

علامہ یوسف قرضاوی نے لکھا ہے کہ "سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو زمین کی پیداوار وغیرہ اللہ کی راہ میں وقف کر دینے کا حکم دے کر رسول اللہ ﷺ نے خیراتی وقف کے لیے شرعی بنیاد فراہم کر دی جو ہر دور کے مسلم معاشرے میں کافی مؤثر کردار ادا کرتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشرہ کی ضروریات میں سے کوئی ضرورت ایسی نہیں جس کے لیے معاشرہ کے اہل ثروت نے اپنی دولت کا کچھ حصہ وقف نہ کر دیا ہو"

اسی وجہ سے مسلم معاشرہ میں شکستہ حال لوگوں اور محتاجوں کے لیے برصغیر پاک و ہند میں اوقاف کا ایک نہایت وسیع نظام قائم تھا جن کو انگریزوں نے ضبط کر کے ان کو اپنے انگریزی نظام تعلیم کے تعلیمی اخراجات میں صرف کیا اور بعض مساجد، مدارس اور اوقاف کی زمینوں کو گرجا گھروں میں تبدیل کر دیا۔

(جمال الدین افغانی: العروۃ الوثقیٰ: ۲۱۳، عبدالمنعم نمر، تاریخ الاسلام فی الہند: ۲۵، عبدالعزیز نوار، الشعوب الاسلامیہ: ۵۶)

وراثت:

اپنی ضروریات پر خرچ کرنے، راہ خدا میں صدقہ و خیرات کرنے اور زکوٰۃ وغیرہ کی ادائیگی کے باوجود جو دولت ایک جگہ سمٹ کر رہ گئی ہو، اس ارتکاز کو بھی اسلام پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ اس ارتکاز دولت کو ختم کرنے کے لیے اور اس سمٹی ہوئی دولت کو گردش میں لانے کے لیے اسلام نے ایک اور تدبیر اختیار کی جس کو قانون وراثت کہتے ہیں۔ اس قانون کی غرض و غایت دولت کو دور و نزدیک کے رشتہ داروں میں ایک ضابطہ کے تحت منقسم کرنا ہے۔ اور اگر کسی کا کوئی وارث نہ ہو تو مال کو اسلامی ریاست کے بیت المال میں داخل کر کے قومی ملکیت قرار دیا گیا ہے۔

وراثت ایک غیر اختیاری انتقال ملکیت ہے جس کے ذریعہ ایک مرنے والے کا ترکہ اس کے ورثاء میں بطریق جانشینی منتقل ہو جاتا ہے۔ کسی مرد یا عورت کے انتقال پر اس کے مال متروکہ کے بارے میں قرآن حکیم کا قانون یہ ہے کہ وہ مال اس کے والدین، اس کی اولاد اور اس کی بیوی یا شوہر کے درمیان ایک مقررہ نسبت کے ساتھ تقسیم کیا جائے۔ اور اگر والدین اور اولاد نہ ہو تو اس کے حقیقی، علاتی اور اخیافی بھائی بہنوں میں تقسیم کیا جائے۔ (اس کے بارے تفصیلی احکام سورۃ النساء: ۷، ۱۲، ۱۷۶ میں بیان ہوئے ہیں)

اس بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اقسموا المال بين اهل الفرائض علىٰ كتاب الله﴾

(رواہ مسلم وابوداؤد)

"اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق اپنا مال ان لوگوں میں تقسیم کرو جن کا حق مقرر کر دیا گیا ہے۔"

اسلام کا یہ قانون وراثت دولت کی تقسیم کے لیے ایک ایسا معتدل اور مدبرانہ طریقہ ہے کہ اگر اس کو صحیح طور پر اختیار کیا جائے اور معاشرہ میں اس کا رواج عام ہو جائے تو نہ اس سے ارتکاز دولت کا امکان باقی رہتا ہے اور نہ ہی افراد و اشخاص کے مابین افلاس اور فاقہ مستی کو فروغ ہو سکتا ہے، کیونکہ اس نظام سے دولت ہر وقت گردش میں رہتی ہے اور اس سے ہر فرد کو فائدہ پہنچتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے وراثت کے علم کو "علم الفرائض" فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ لوگو! علم الفرائض خود بھی سیکھو اور دوسروں کو بھی سکھاؤ کیونکہ وہ نصف علم ہے، اور بے شک وہ بھلا دیا جائے گا، اور سب سے پہلے جو علم میری امت سے اٹھا لیا جائے گا وہ علم الفرائض ہے۔ قرآن حکیم نے سورۃ النساء آیت نمبر 7 تا 10 میں ان حصوں کو بیان کیا ہے۔

اسلام کا منشاء یہ ہے کہ مرنے والے شخص کے مال کا دو تہائی تو لازماً وراثت کے مطابق تقسیم ہو اور باقی ایک تہائی مرنے والے کے اختیار تمیزی پر چھوڑا گیا ہے۔ اس طرح مرنے والا اپنے مال کے ایک تہائی ترکہ کی تقسیم سے قبل اس میں سے تجہیز و تکفین کے اخراجات اور قرض کی ادائیگی کے بعد وصیت کے مطابق ترکہ تقسیم ہوگا اور بقیہ اعزاء و

اقرباء میں قانون وراثت کے تحت تقسیم ہوگا۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿ان اللہ اعطیٰ کل ذی حق حقہ، فلا وصیۃ لوارث﴾

(رواہ الترمذی، رقم ۹۷۵)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دیا ہے، پس وراث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔''

کفالت عامہ:

کفالت عامہ سے مراد یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے حدود کے اندر بسنے والے ہر انسان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام ایک اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے، اور یہ اہتمام اس درجہ تک ہونا چاہیے کہ ریاست کا کوئی فرد ان ضروریات سے محروم نہ رہے۔ ان بنیادی ضروریات میں غذا، لباس، مکان اور علاج شامل ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے:

''جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنایا ہے اور وہ ان کی ضروریات اور فقر سے بے پروا ہو کر بیٹھ رہا، اللہ تعالیٰ بھی اس (نگران) کی ضروریات اور فقر سے بے نیاز ہو جائے گا۔''

(ابوداؤد، باب مایلزم الامام من امر الرعیۃ)

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو امام (صدر مملکت) ضرورت مندوں، فقراء اور مساکین پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات، فقر اور مسکینی پر آسمان کے دروازے بند کر لیتا ہے۔'' (ترمذی، باب ماجاء فی امام الرعیۃ)

رعایا کی خیر خواہی سے مراد ان کی ضروریات زندگی کی تکمیل کا انتظام و اہتمام ہے جو ایک اسلامی ریاست کے سربراہ پر شریعت نے لازمی قرار دیا ہے۔ چنانچہ اسی خیر خواہی کی بابت ایک اور روایت میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جو امیر مسلمانوں کے امور کا نگران ہو اور پھر ان کی بھلائی اور بہتری کے لیے سعی و کوشش نہ کرے اور ان کی خیر خواہی نہ کرے وہ ان کے ساتھ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔" (مسند ابی عوانہ: ۱/۳۲)

اگر ایک حکمران رعایا کی دل کی گہرائیوں اور خلوص نیت کے ساتھ خیر خواہی نہیں کرتا، اور صرف وعدوں پر ٹال دیتا ہے اور زبانی جمع خرچ کر کے ان کو سنہری الفاظ میں ٹال دیتا ہے، اور ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دوسرے میڈیا کے ذریعہ انہیں یہ کہتا ہے کہ "حکومت نے تمہاری امداد کا تہیہ کر رکھا ہے یا ان کو بارہ بارہ کلوں اور روٹی، کپڑا اور مکان کی حسین خواب دکھاتا ہے اور عملی طور پر ان کے لیے کچھ نہیں کرتا تو وہ نہ صرف ان کی خیر خواہی نہیں کرتا بلکہ اپنے جھوٹے وعدوں سے انہیں دھوکہ دے رہا ہے۔ اس دھوکہ دہی کا عذاب اسے الگ ہو گا۔ شریعت نے تو سربراہ مملکت کو تمام رعایا کا ولی بنایا ہے، اور اس کی ولایت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ مملکت کے افراد کی بنیادی ضروریات زندگی کی تکمیل کا اہتمام کرے۔

(ترمذی: ۱۳۳۲، ابوداؤد، کتاب النکاح رقم: ۲۹۴۸، مستدرک: ۴/۹۳، مسند احمد ۵/۲۳۸)

یہ تمام مسلمانوں کا اجتماعی حق ہے کہ جب کسی مسلمان کو کوئی مرض، غریبی یا بیکاری یا عجز و مجبوری یا بڑھاپا اور معذوری لاحق ہو جائے جس سے وہ کام کرنے سے معذور ہو جائے اور غریبی اور فاقہ کی وجہ سے اس کے لیے زندگی بسر کرنے کا انتظام کرے اور اس کے لیے روٹی، کپڑا اور مکان کی فراہمی کا بندوبست کرے۔

ویسے بھی بحیثیت مسلمان ہونے کے ہر مسلمان پر ضروری ہے کہ وہ آپس میں محبت و مودت کے جذبات قائم کریں کیونکہ ان کی مثال ایک جسم کی ہے جس کے ایک حصہ سے دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے۔ (رواہ البخاری: ۵/۲۲۳۸، مسلم: ۱۶/۱۴۰)

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کی مثال باہمی محبت و رحمت اور جان گساری کے بارے میں ایک جسم کی سی ہے۔ جب کسی جسم کا کوئی عضو بیمار ہوتا ہے یا اس کو کوئی درد لاحق ہوتا ہے تو پورا جسم بخار، بیداری سے بے چین ہو جاتا ہے۔ (بخاری: ۵/۲۲۳۸، مسلم: ۱۶/۱۴۰)

اور ایک روایت میں سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا:

﴿خیر الناس من ینفع الناس﴾ (الفتح الکبیر ۲: ۹۸)
''تم سے بہتر لوگ وہ ہیں جو لوگوں کو نفع پہنچاتے ہیں۔''
قرآن حکیم میں خیر کو کامیابی اور فلاح کا ضامن کہا گیا ہے۔ فرمایا:
﴿وافعلوا الخیر لعلکم تفلحون﴾ (حج۔۷۷)
''اور نیکی کرو تا کہ تمہیں فلاح و کامرانی نصیب ہو۔''
اور لوگوں کو نفع پہنچانا سب سے بڑی نیکی ہے۔ اس وجہ سے وہ لوگ جو دوسروں کو نفع پہنچاتے ہیں وہ ''خیر الناس'' ہیں۔ ایک اور روایت میں ان لوگوں کو بہتر اور خیر کہا گیا جس سے لوگ خیر کی امید کریں اور شر سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے کہ سرکار دو عالم ﷺ ان کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا: ''کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں سے اچھے کون ہیں اور برے کون ہیں؟'' لوگ خاموش رہے۔ آپ ﷺ نے ان سے تین مرتبہ یہی فرمایا تو ایک شخص نے عرض کیا: ''کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول! بتائیے!'' آپ نے فرمایا:
﴿خیر کم من یرجی خیرہ، ویؤمن شرہ، وشرکم من یرجی خیرہ ولا یؤمن شرہ﴾ (ترمذی: ۲۲۶۳، مسند احمد: ۲/ ۳۶۸)
''تم میں بہتر لوگ وہ ہیں جن سے لوگ خیر کی امید رکھیں اور شر سے محفوظ رہیں، اور تم میں برے لوگ وہ ہیں جن سے لوگ خیر کی امید تو رکھیں مگر شر سے محفوظ نہ ہوں۔''
اسلام اس کے دعویٰ اسلام کو سچا سمجھتا ہے جو ہمیشہ نیک کام انجام دے اور برے کاموں سے باز رہے اس لیے کہ وہ ہمیشہ رسول اللہ کا یہ ارشاد پیش نظر رکھتا ہے کہ:
''جو شخص اس حال میں صبح کرے کہ اسے مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کی کوئی فکر نہ ہو وہ مسلمانوں میں سے نہیں۔'' (مستدرک حاکم ۴/ ۳۲۰)
وجہ اس کی یہی ہے کہ ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کی خیر خواہی اور فلاح و بہبود کے بارے میں تگ و دو کرے، ان کی حاجتوں کو پورا کرے جس طرح وہ اپنی حاجتوں کو پورا کرتا ہے۔ یہ حکم ایک عام مسلمان

کے لیے بھی اور ارباب اقتدار کے لیے بھی ہے کیونکہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود میں دلچسپی لینا ارباب اقتدار کے لیے زیادہ ضروری ہے۔ارشاد نبوی ہے:

﴿لا یزال اللہ فی حاجة العبد مادام العبد فی حاجة اخیه﴾

''اللہ تعالیٰ بندے کی حاجت اس وقت تک پوری کرتا رہتا ہے جب تک وہ اپنے بھائی کی حاجت پوری کرتا رہے۔''

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان، رقم: ۷۶۱۵، مسلم، رقم: ۲۶۹۹، کتاب الذکر والدعاء)

ایک اور روایت میں کچھ زیادہ وضاحت سے فرمایا:

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرے اور نہ ہی اسے بے یارو مددگار چھوڑ دے۔ جو شخص اپنے بھائی کی حاجت روائی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی ضرورتیں پوری کرے گا، اور جو کسی مسلمان کی کوئی تکلیف دور کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیفوں میں سے ایک تکلیف دور فرمائے گا، اور جو کسی مسلمان (کے عیوب ونقائص) کی ستر پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ستر پوشی کرے گا۔''

(مسلم، رقم: ۲۵۸۰، کتاب البر والصلة، بخاری، کتاب المظالم، رقم: ۲۴۴۲)

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے رسول اور ایک اسلامی ریاست کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے ایک نومسلم قبیلہ کے سردار زرعہ بن ذی یزن کے نام ایک خط میں اس کے قبیلہ حمیر کو مخاطب کر کے فرمایا:

''اے اہل حمیر! میں تمہیں اچھا طریقہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہوں، نہ تو خیانت کرتا اور نہ ہی مخالفانہ روش اختیار کرتا۔ اللہ کا رسول تمہارے مالدار اور غریب لوگوں کا سرپرست ہے (ان رسول اللہ مولیٰ غنیکم وفقیرکم) اور صدقہ کا مال محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے گھر والوں کے لیے جائز اور حلال نہیں ہے بلکہ یہ زکوٰۃ ہے جسے تم اپنی پاکیزگی کے لیے غریب مسلمانوں

کے نیچے نکالتے ہو۔" (کتاب الاموال ابی عبید: ۲۰۲)

ایک سربراہ ریاست کے لیے ضروری بنیادی ضروریات کی تکمیل کرنا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ افراد مملکت کی دوسری ضروریات کی تکمیل بھی ضروری ہے۔ چنانچہ فتوحات کے بعد کافی مال بیت المال میں جمع ہونے لگا تو سرکار دو عالم ﷺ نے اعلان فرما دیا کہ جو لوگ مقروض ہوں اور وہ وفات پا جائیں، ان کے قرضے اسلامی ریاست کے خزانے سے ادا کیے جائیں۔

(بخاری، باب من ترک کلا او ضیاعا فالی)

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے نہایت واضح الفاظ میں فرمایا۔

"متوفی جو مال چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کا ہے اور جو ذمہ داریاں یعنی قرض وغیرہ چھوڑ کر مرے وہ اللہ کے ذمہ، اور کبھی یہ فرمایا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ ہیں۔ امام ابو عبید فرماتے ہیں: "اس سے مراد ہمارے نزدیک وہ تمام افراد ہیں جن کی کفالت متوفی کے ذمہ ہو اور بچے بھی اس میں شامل ہیں۔" (کتاب الاموال: ۲۳۷)

رسول اللہ ﷺ نے سربراہ مملکت کے علاوہ ہر خاندان، محلّہ، برادری اور شہر کے لوگوں پر یہ ضروری قرار دیا کہ وہ باہم ایک دوسرے کی مدد و اعانت کریں۔ اغنیاء اور مال دار لوگ فقراء، غرباء اور مساکین کو روٹی، کپڑا اور مکان کی ضروریات مہیا کریں جو کہ زندگی گزارنے اور عبادت الٰہی کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ حدیث میں فرمایا: "اگر محلّہ والے اس طرح رات گزاریں کہ ان میں کوئی شخص رات کو بھوکا سویا ہو تو ان سے اللہ اور اس کا رسول بری الذمہ ہیں۔ (بخاری مع فتح الباری، ۱۰/۲۴۰ ۵، مسلم رقم: ۲۵۷۳)

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لیس المؤمن الذی یشبع وجارہ جائع الی جنبہ﴾

(الادب المفرد: ۱۱۲ و صححہ الحاکم)

"وہ شخص مومن نہیں ہے جو خود تو پیٹ بھر کر سویا ہو اور اس کے پڑوس میں اس کا پڑوسی بھوکا رات گزار رہا ہو۔"

رسول اللہ ﷺ کی انہی ہدایات نے آپ ﷺ کے بعد آنے والے سربراہان سلطنت کو ہوشیار اور خبردار کر دیا، اور وہ اس بات کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے کہ ان کی سلطنت کے حدود و ثغور میں نہ صرف انسانوں بلکہ جانوروں کو بھی کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہنچے، بلکہ ان کی ضروریات زندگی کی تکمیل کا اہتمام ہوتا رہے۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا مشہور مقولہ ہے:

''اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی بکری بھی (ایک روایت میں اونٹ کا لفظ ہے) بے سہارا ہونے کی وجہ سے مر جائے تو مجھے گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس بارے میں مجھ سے ضرور باز پرس کریں گے۔''

(سیرۃ عمر بن خطاب لابن جوزی: ص ۱۶۱)

آپ اکثر یہ فرمایا کرتے تھے:

''اگر کسی نہر کے کنارے کوئی خارشتی بکری اس حال میں چھوڑ دی جائے کہ اسے علاج کے طور پر تیل کی مالش نہ کی جا سکے تو مجھے اندیشہ ہے کہ قیامت کے روز مجھ سے اس کے بارے میں جواب طلب کیا جائے گا۔''

(التبر المسبوک، امام غزالی: ص ۱۷)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کفالت عامہ کی ذمہ داری میں دوا اور علاج کو بھی داخل سمجھتے تھے۔ جو حکمران جانوروں کے علاج کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھتا ہو وہ انسانوں کے علاج کو بدرجہ اولیٰ اپنی ذمہ داری میں داخل سمجھے گا۔

آپ اپنے ماتحت حکام کو بھی اس ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے۔ بصرہ کے گورنر سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جب ایک وفد کے ساتھ آپ سے ملاقات کے لیے آئے تو آپ نے ان لوگوں کو ہدایت فرمائی:

''لوگوں کے گھروں میں ان کے لیے فراخی کا سامان فراہم کرو اور ان کے متعلقین کو کھلانے کا سامان کرو۔'' (سراج الملوک، طرطوشی: ص ۱۰۹)

کفالت عامہ کی ذمہ داری صرف مسلمان شہریوں تک محدود نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ غیر مسلموں کو بھی اس سلسلہ میں وہی حیثیت حاصل تھی جو مسلمانوں کو تھی۔ سیدنا

عمرؓ نے بیت المال کے نگران کو ہدایت فرمائی تھی کہ ضرورت مند غیر مسلموں کا پتہ لگا کر ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے۔

غیر مسلم رعایا کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور ان کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنا اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے، کیونکہ سرکارِ دو عالم ﷺ اور سیدنا ابوبکرؓ کے زمانوں میں بھی غیر مسلم رعایا کے ساتھ ایسا اچھا سلوک کیا گیا کہ آج بھی دنیا تعجب کرتی ہے۔ چنانچہ سیدنا ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت میں سیدنا خالد بن ولیدؓ نے اہلِ حیرہ کے ساتھ جو عیسائی تھے، معاہدہ کیا۔ اس معاہدے میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ

"میں نے ان کا یہ حق قرار دیا ہے کہ ایسا بوڑھا آدمی جو محنت کرنے سے معذور ہو جائے، یا اس پر کوئی مرض یا مصیبت آن پڑے، یا جو آدمی پہلے مالدار رہا ہو اور اب ایسا غریب ہو جائے کہ اس کے ہم مذہب اسے خیرات دینے لگیں، اس کا جزیہ ساقط کر دیا جائے، اور جب تک وہ دارالاسلام اور دارالہجرت میں مقیم رہے گا اس کی اور اس کے اہل و عیال کی کفالت مسلمانوں کے بیت المال سے کی جائے گی۔" (کتاب الخراج لابی یوسف: ص ۱۷۲)

﴿ایہا الناس! ان اللہ قد کلفنی ان اصرف عنہ الدعاء﴾

(قواعد الاحکام فی مصالح الانام: ۱/۱۲۸، العز ابن عبدالسلام)

"اے لوگو! مجھ پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ میں اللہ کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکوں۔"

اللہ کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکنے کا مطلب یہ ہے کہ سربراہِ ریاست ظالموں کے مقابلہ میں مظلوموں کے ساتھ انصاف کرے تاکہ ان کے ہاتھ انصاف کی طلب میں آسمان کی طرف نہ اٹھیں۔ اسی طرح وہ لوگوں کی ضروریاتِ زندگی اور ان کی حاجتیں پوری کرے تاکہ انہیں ان کی تکمیل کی دعا کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔

عام الرمادہ میں سیدنا عمرؓ نے جو کچھ کیا تاریخ کے اوراق نے ان سب کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھا ہوا ہے، اور قحط کا وہ زمانہ گزر جانے کے بعد لوگ کہا کرتے تھے:

"اگر اللہ تعالیٰ عام الرمادہ میں قحط دور نہ کر دیتا تو ہمیں خطرہ تھا کہ عمر مسلمانوں

کے اس مسئلہ کے حل کی فکر کرتے کرتے اس دنیا سے انتقال ہی نہ کر جائیں۔"

کفالت عامہ کی اس ذمہ داری کو ہر نیک دل سربراہ مملکت نے محسوس کیا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں تو کتابوں میں آتا ہے کہ وہ کفالت عامہ کی اس گراں بار ذمہ داری کا خیال کر کے اکثر و بیشتر روتے رہتے تھے کہ کہیں قیامت کے روز عدالت خداوندی کے کٹہرے میں مجرموں کی حیثیت سے نہ کھڑے ہونا پڑے۔ چنانچہ آپ کی اہلیہ محترمہ فاطمہ کہتی ہیں کہ میں ایک روز آپ کے کمرہ میں گئی۔ آپ جائے نماز پر تھے اور آنسوؤں سے آپ کی ریش مبارک تر تھی۔ میں نے پوچھا: "کیا کوئی نئی بات ہو گئی؟" فرمایا:

"میں نے پوری امت کی ذمہ داری لے لی ہے، لہٰذا میں بھوکے فقیروں، بے سہارا مریضوں، مجاہدین، مظلوم اور ستم رسیدہ افراد، غریب الدیار قیدیوں، بہت بوڑھے افراد اور ان لوگوں کے بارے میں غور و فکر کر رہا تھا جو بکثرت اہل و عیال والے ہیں مگر مال دار نہیں، اور مختلف علاقوں میں اسی قسم کے لوگوں کے بارے میں متفکر تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ عنقریب قیامت کے روز اللہ تعالیٰ مجھ سے ان کے بارے میں پوچھے گا اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں میرے مقابلہ میں ان کے وکیل رسول اللہ ﷺ ہوں گے۔ مجھے خطرہ ہوا کہ جرح میں میری بات پایۂ ثبوت کو نہ پہنچ سکے گی تو میں اپنی جان پر ترس کھا کر رونے لگا۔"

(کامل ابن اثیر: ۵/۴۳، کتاب الخراج، ص ۱۰، سیرت عمر ابن عبدالعزیز، ابن عبد الحکم، ص ۱۷۸)

انہی عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں ایک علاقہ میں زبردست قحط پڑا۔ قحط زدہ علاقہ سے کچھ لوگ ایک وفد کی شکل میں آپ کے پاس آئے۔ ان کے رئیس وفد نے کہا:

"امیر المومنین! ہم ایک شدید ضرورت کی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ ہمارے جسم کی چمڑی سوکھ گئی ہے کیونکہ اب ہڈیاں بھی میسر نہیں آتیں، اور ہماری مشکل کا حل صرف بیت المال کے ذریعہ ممکن ہے۔ آپ کے اس حکومتی خزانہ کی حیثیت تین میں سے ایک ہو سکتی ہے، یا تو یہ اللہ کے لیے ہے، یا بندگان خدا کے لیے، یا پھر آپ کے لیے۔ اگر یہ اللہ کے لیے ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر یہ بندگان خدا کے لیے ہے تو اسے

انہیں دے دیجیے، اور اگر یہ آپ کے لیے ہے تو صدقہ کے طور پر انہیں عطا فرما دیجیے۔ اللہ صدقہ کرنے والوں کو جزائے خیر دے گا۔"

یہ سن کر سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور آپ نے فرمایا، اس کی حیثیت وہی ہے جو تم نے بیان کی۔ آپ نے اسی وقت حکم دیا کہ ان لوگوں کی تمام ضروریات زندگی بیت المال سے پوری کی جائیں۔

(التبر المسبوک فی نصائح الملوک، امام غزالی: ص ۶۱)

دوسری بنیادی ضرورت:

بنیادی ضروریات میں سے ایک اہم بنیادی ضرورت "تعلیم" ہے۔ اسلامی ریاست اپنے شہریوں کو لکھنا اور پڑھنا سکھانے کا بھی پورا پورا اہتمام کرنا چاہیے۔ سرکار دو عالم ﷺ پر جو سب سے پہلی وحی نازل ہوئی تھی اس میں پہلا لفظ ہی "اقراء" کا تھا، کیونکہ لکھنا پڑھنا نہایت ضروری ہے اور اس وحی کے ذریعہ لوگوں کو لکھنے پڑھنے کی تاکید فرمائی گئی۔ کیونکہ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب میں سب سے بڑا سبب تعلیم اور جہالت ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ اس بات کا خاص اہتمام فرماتے تھے کہ لوگ پڑھنا لکھنا سیکھیں۔ آپ ﷺ ہی کے حکم سے سیدنا زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ نے یہود کی زبان سریانی لکھنا اور پڑھنا سیکھی تھی۔ (ابوداؤد، باب روایت حدیث اہل کتاب)

بدر کے موقع پر متعدد قیدیوں کا فدیہ یہ قرار دیا گیا کہ ان میں سے ہر ایک مدینہ طیبہ کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔ (طبقات ابن سعد ۲/۲۲۲)

بعض روایات میں ہے آپ نے سیدنا سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو اس بات پر مامور کیا تھا کہ مدینہ کے لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھائیں۔ (استیعاب ۱/۲۹۳)

ایک مرتبہ آپ نے انصار میں سے ستر (70) آدمیوں کو جو اپنے زمانہ میں قرأ (عالم قرآن) کہلاتے تھے اور جو دن میں لکڑیاں چنتے تھے اور رات کو لکھتے پڑھتے تھے۔ عرب کے بعض قبائل کی طرف دین سکھانے کے لیے بھیجا گیا۔ (بخاری، کتاب المغازی)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے زمانہ میں سرکار دو عالم ﷺ کے اس طریقہ کو

جاری وساری رکھا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، اس بارے میں کہ اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ محروم اہل حاجت کی حاجت روائی کا اہتمام کرے امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ:

''یہ باتیں فرض کفایہ میں شامل ہیں ...... مسلمانوں کی تکالیف دور کرنا مثلاً ننگے کو کپڑا پہنانا اور بھوکے کو کھانا کھلانا جب کہ یہ ضروریات زکوٰۃ اور بیت المال کے ذریعہ نہ پوری ہو رہی ہوں۔ (منہاج الطالبین: ص ۱۲۵)

اس کی شرح میں علامہ شہاب الدین رملیؒ نے لکھا ہے کہ:

''ایسا لباس فراہم کرنا ضروری ہے جس سے پورا بدن ڈھک جائے اور جو جاڑے اور گرمی کے حالات کے لیے موزون ہو۔ نیز کھانے اور کپڑے کے ساتھ وہ چیزیں ثابت ہیں جو اتنی ہی ضروری ہوں، مثلاً طبیب کا معاوضہ، ادویات کی قیمت اور معذوروں کے لیے خادم۔''

(نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج: ۱۹۴/۶)

علامہ ابن حزمؒ نے ایک اسلامی ریاست کی ذمہ داریوں میں یہ لکھا ہے کہ:

''ملک کے مالدار لوگوں پر فرض ہے کہ اپنے غریب لوگوں کی کفالت کریں۔ اگر زکوٰۃ کی آمدنی اور سارے مسلمانوں کی فئے اس کے لیے کافی نہ ہو تو حاکم وقت ان کو ایسا کرنے پر مجبور کرے گا۔ ان اہل حاجت کے لیے اتنے مال کا انتظام کیا جائے گا جس سے وہ بقدر ضرورت غذا حاصل کرسکیں، اور اسی طرح جاڑے اور گرمی کا لباس اور ایک ایسا مکان جو انہیں بارش، گرمی، دھوپ اور راہ گیروں کی نظروں سے محفوظ کرسکے۔'' (المحلی لابن حزم: ۱۵۶/۹)

مختصر یہ کہ غذا، لباس اور سر چھپانے کے لیے مکان ایسی بنیادی ضروریات ہیں جن کی تکمیل نہ ہونے سے آدمی کی جان چلی جانے کا اندیشہ ہے۔ لباس میں اوڑھنے اور بچھانے کے لیے اس سامان کو بھی شامل سمجھنا چاہیے جو سردی سے بچاؤ کے لیے ناگزیر ہو۔ یہی حیثیت مریض کے علاج کی ہے۔ چونکہ قیام حیات شریعت کے اولین مقاصد میں سے ہے، لہٰذا ان چار ضروریات کی تکمیل کو لازماً کفالت عامہ کے اصول میں شامل کیا جاسکتا

ہے۔ بعض احادیث میں معذور افراد کے لیے خادم فراہم کرنے کا ذکر بھی آیا ہے۔ یہ ضرورت ایسی ہے کہ اگر معذور افراد اپنے خاندان والوں کے تعاون سے یا خود اپنے مال کے ذریعہ خادم (نوکر) رکھ کر گزارہ نہ کر سکتا ہو تو حکومت یا معاشرہ کو اس کی یہ ضرورت پوری کرنی چاہیے کیونکہ اگر اسے پورا نہ کیا گیا تو اس کے لیے زندگی گزارنا ممکن نہیں رہے گا۔ بہر حال یہ ایک اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہوگی کہ ہر معذور فرد کو کوئی مناسب سہارا مل جائے۔

اسلامی ریاست جو جہاد بھی کرتی ہے وہ دنیوی اغراض کے لیے جنگ نہیں ہوتی۔ لیکن اگر دین کی راہ میں جہاد کرنا پڑے تو اس سے مسلمانوں کو معاشی فوائد بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ جنگ بدر کے موقع پر سرکار دو عالم ﷺ نے جو دعا کی تھی وہ یہاں واضح کرنے کے لیے نقل کی جا رہی ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ کو مسلمانوں کی معاشی فلاح بھی مطلوب تھی اور اس کے لیے آپ اللہ سے دعا بھی فرماتے تھے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بدر کے موقع پر تین سو پندرہ مجاہدین کے ساتھ جنگ کے لیے نکلے تو سرکار دو عالم ﷺ نے بارگاہ خداوندی میں یہ دعا کی:

﴿اللھم انھم حفاۃ فاحملھم، اللھم انھم عراۃ فاکسھم، اللھم انھم جیاع فاشبعھم﴾

''اے اللہ: یہ لوگ پیدل ہیں انہیں سواریاں عطا فرما، یہ لوگ ننگے ہیں ان کو کپڑے پہنا، اے اللہ! یہ لوگ بھوکے ہیں ان کے پیٹ بھر دے۔''

چنانچہ حق تعالیٰ نے بدر کی جنگ میں فتح عطا فرمائی، اور جب یہ لوگ واپس لوٹے تو ہر آدمی اپنے ساتھ ایک یا دو اونٹ لے کر لوٹا اور ان کو پہننے کے لیے کپڑے مل گئے اور یہ شکم سیر ہو گئے۔ (ابوداؤد)

اسی طرح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عراق میں جہاد کے لیے جانے والے مسلمانوں سے یہ فرمایا تھا:

''ایک ایسی قوم کے ساتھ جہاد کے لیے جاؤ جو امور معاش میں حاوی اور ترقی یافتہ ہے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں سے تمہارا حصہ عطا کرے گا، اور

تم بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ اس ترقی اور خوشحالی سے فیض یاب ہوتے ہوئے زندگی گزار سکو گے۔" (طبری حوادث ۱۳ھ ص ۲۱۸۸)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ عوام سے فرماتے کہ وظیفے کی رقم کو منفعت بخش کاموں میں لگاؤ۔ چنانچہ وہ فرماتے تھے کہ کم سواد عربوں میں سے جس کسی کو وظیفہ ملے اسے چاہیے کہ بکریاں خرید کر اپنے سرمایہ میں شامل کر لے اور جب دوبارہ وظیفہ ملے تو مویشی خرید لے کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ میرے بعد ایسے لوگ تمہارے والی اور حاکم بنیں گے جو تمہارے وظیفے جاری نہیں کریں گے۔ اگر تم میں سے کوئی اس وقت تک زندہ رہا تو اس کے پاس اتنی جمع پونجی ہو گی کہ وہ اس کے سہارے زندگی بسر کر لے۔ اور اکثر لوگ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی اس نصیحت پر عمل کرتے تھے اور اپنی پونجی کو سرمایہ کے طور پر Invest کر کے اپنی اموال میں مزید اضافہ کرتے۔

اک دفعہ خالد بن عرفطہ عذری سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے دریافت فرمایا کہ جہاں سے آ رہے ہوں وہاں کے لوگوں کا کیا حال ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں انہیں اس حال میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے تھے کہ ان کی عمروں میں سے کچھ مدت کم کر کے آپ کی عمر میں اضافہ کر دے۔ جس نے بھی قادسیہ کے میدان میں قدم رکھا تھا اس کا وظیفہ دو ہزار یا پندرہ سو درہم سالانہ ہے۔ ہر بچہ کے لیے خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی، پیدا ہوتے ہی سو درہم اور دو جریب غلہ مقرر ہو جاتا۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتوح البلدان بلاذری ص ۴۳۹)

حق قضا

اسلام میں قضاء کو مشروع قرار دیا گیا تا کہ لوگوں میں عدل قائم کیا جا سکے اور لوگوں کے تلف شدہ حقوق کو حاصل کیا جا سکے۔ اس کی دلیل یہ ہے:

﴿انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما ارٰئک الله، ولا تکن للخائنین خصیما﴾ (النساء: ۱۰۵)

''بے شک ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی تا کہ آپ لوگوں کے درمیان اس چیز کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو دکھائی ہے، اور آپ خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنیں۔''

اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اذا اجتهد الحاكم فاصاب فله اجران، واذا اجتهد فاخطا فله اجر﴾ (بخاری: ۲۶۷/۶، مسلم ۱۳/۲)

''جب کوئی حاکم (قاضی) اجتہاد کرتا ہے اور اس کا اجتہاد صحیح ہوتا ہے تو اس کے لیے دو اجر ہیں۔ اور اگر اس کے اجتہاد میں خطا اور غلطی ہو جاتی ہے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔''

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''حسد صرف دو آدمیوں میں ہو سکتا ہے، ایک وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو اور وہ اس کو نیک اور حق کاموں میں صرف کرے، اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے حکمت اور علم عطا فرمایا

ہو اور وہ اس کے مطابق فیصلے کرتا ہو اور عمل کرتا ہو۔" (بخاری: ۱/۳۹، مسلم: ۱/۲۷۹)

شریعت کے ان دلائل کی روشنی میں تمام مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ لوگوں میں حق و صداقت اور عدل و انصاف کو قائم کرنے کے لیے قضا مشروع ہے۔ یہ قضا دین کا ایک مستقل شعبہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس دنیوی حیات میں مختلف معاملات میں لوگوں کے مابین فیصلے کیے۔

قرآن حکیم کی مختلف آیات سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا ایک مقصد یہ بھی بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ دنیا میں عدل و انصاف کو فروغ دیں تاکہ ظلم و جور میں پسے ہوئے لوگوں کو سکھ اور امن و چین کا سانس لینا نصیب ہو۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا داؤد علیہ السلام کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

"اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ (حاکم) بنایا، پس تم لوگوں میں حق و انصاف سے فیصلہ کرتے رہنا اور نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کرنا (کیونکہ اگر تم ایسا کرو گے) وہ تمہیں اللہ کے راستہ سے بھٹکا دے گی، بے شک جو لوگ اللہ کے راستہ میں بھٹکتے ہیں، ان کے لیے سخت اور شدید عذاب ہے، اس لیے کہ وہ روز حساب کو بھولے ہوئے ہیں۔" (ص:۲۶)

اس آیت کی تفسیر میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں:

یعنی خدا نے تم کو زمین میں اپنا نائب بنایا لہٰذا اس کے حکم پر چلو اور معاملات کے فیصلے عدل و انصاف کے ساتھ شریعت الٰہی کے موافق کرتے رہو، کبھی کسی معاملہ میں خواہش نفسانی کا ادنیٰ شائبہ بھی نہ آنے پائے کیونکہ یہ چیز آدمی کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دینے والی ہے، اور جب انسان اللہ کی راہ سے بہکا تو پھر ٹھکانہ کہاں؟

"عموماً خواہشات نفسانی کی پیروی اسی لیے ہوتی ہے کہ آدمی کو حساب کا دن یاد نہیں رہتا، اگر یہ بات مستحضر رہے کہ ایک روز اللہ کے سامنے جانا اور ذرہ ذرہ عمل کا حساب دینا ہے تو آدمی کبھی اللہ کی مرضی پر اپنی خواہش کو مقدم نہ رکھے۔ ممکن ہے کہ "یوم حساب" کو تعلق "لهم عذاب شديد" کے ساتھ

ہو، "نسوا" کے ساتھ نہ ہو یعنی اللہ کے احکام بھلا دینے کے سبب سے ان پر سخت عذاب ہوگا حساب کے دن۔ (فوائد عثمانی ص ۶۰۲)

سیدنا داؤد علیہ السلام کو خلافت الٰہی کی ذمہ داریاں سپرد کرنے کے ساتھ ہی سب سے پہلا فرض جو ان پر عائد فرمایا، وہ عدل کا قیام ہے یعنی لوگوں کے درمیان حق و انصاف کے ساتھ فیصلے کرنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک اسلامی ریاست کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ ملک میں اسلامی نظام عدل کو قائم کرے، اور اسلامی اصولوں کے مطابق ایک ایسی عدلیہ قائم کرے جو لوگوں کے مابین عدل و انصاف کے قیام میں ممد و معاون ہو۔ یہ شے اسلامی ریاست کے سربراہ کے لیے تو فرض عین کا درجہ رکھتی ہے لیکن عوام کے لیے یہ فرض کفایہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اگر ملک میں لوگوں کو عدل و انصاف مہیا کرنے کے لیے عدالتیں قائم نہ ہوں یا قائم تو ہوں لیکن اسلامی عدل و انصاف کے مطابق فیصلے نہ کر رہی ہوں اور لوگوں کو انصاف مہیا نہ کر رہی ہوں تو پوری امت گنہگار ہوگی۔

لوگوں میں عدل و انصاف کو قائم کرنے کے لیے اور مختلف قسم کے جرائم کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لیے محکمۂ قضا (عدلیہ) کا قیام ضروری ہے بلکہ بقول علامہ کاسانیؒ فرض ہے تا کہ وہ عدل گستری کے فریضہ کو بطریق احسن ادا کر سکے۔ عدلیہ کے ذمہ یہ فرض ہے کہ وہ عدل کو پھیلائے، ظلم و جور کو مٹائے، لوگوں کو حق سے تجاوز کرنے سے روکے، حدود شریعت کی حفاظت کروائے اور لوگوں کو سنت کے طریقہ پر چلنے کی تلقین کرے۔ قضا کا معنی شریعت میں یہ ہے کہ کسی حاکم وقت کا وہ فیصلہ جو اس نے کسی ایسے معاملہ میں دیا ہو جو اس کے نزدیک ثابت ہو چکا ہو۔ چنانچہ جو شخص یہ فیصلے کرتا ہے اس کو قاضی (اور موجودہ دور میں جج) کہتے ہیں، اور منصب قضا کا مطلب ہے مقدمات کا نمٹانا، لوگوں کے مابین جھگڑوں کو ختم کرنا۔ چنانچہ فقہاء کے نزدیک قضا سے مراد دو یا دو سے زیادہ فریقوں کے مابین اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اور شریعت اسلامیہ کے مطابق فیصلہ کرنا اور ان کا جھگڑا ختم کرا دینا ہے۔ (تبصرۃ الاحکام ۱/۱۲)

ایک اسلامی حکومت میں نظام قضا کی اشد ضرورت ہے کیونکہ یہ ارشاد خداوندی کے مطابق ایک محکم فریضہ اور ایک ایسی سنت ہے جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین

عمل پیرا ہوتے رہے۔ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو قاضی مقرر فرمایا اور کہا:

﴿اقض بین الناس فانی فی شغل﴾

''تم لوگوں کے درمیان فیصلے کرو کیونکہ میں دوسرے کاموں میں مشغول ہوں۔''

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نظام قضا کو نہایت مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم کیا۔ وہ آزادی اور مساوات سے بے حد محبت کرتے تھے۔ جس کا آسان سا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو کمزوروں اور محتاجوں کی سطح پر رکھتے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلا خطبہ جو انھوں نے مسجد نبوی میں لوگوں کے سامنے دیا اس میں صاف لفظوں میں فرمایا:

''خدا کی قسم! تمہارا ہر کمزور آدمی میرے نزدیک سب سے قوی ہے تا آنکہ میں اس کے لیے اس کا حق وصول نہ کرلوں، اور تمہارا ہر طاقتور آدمی میرے نزدیک سب سے کمزور ہے تا آنکہ میں اس سے حق وصول نہ کرلوں۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس خطبہ میں نظام قضا (عدلیہ) کی اہمیت اور غرض و غایت بھی بیان کردی گئی، چنانچہ جب تک نظام قضا قائم رہے گا اس وقت تک زمین و آسمان بھی قائم رہیں گے، حکومتیں بھی اسی وجہ سے قائم رہتی ہیں کیونکہ کفر اور حکومت جمع ہوسکتی ہے لیکن حکومت اور ظلم اکٹھے نہیں ہوسکتا۔ اسی وجہ سے ضروری ہے کہ ہر حکومت میں اور خصوصی طور پر ایک اسلامی اور مسلمان حکومت میں نظام قضا نہایت مضبوط بنیادوں پر استوار ہو، اور اس محکمہ کے کارندوں اور قاضیوں میں وہ تمام صفات موجود ہوں جو اسلام کا تقاضا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے قاضی کے منصب کو ان نعمتوں میں سے قرار دیا ہے جن کے حصول کے لیے کسی پر رشک کیا جاسکتا ہے۔ بخاری میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''صرف دو چیزیں ایسی ہیں جن میں حسد (رشک) کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ شخص جس کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے مال و دولت سے نوازا ہو اور حق کے راستہ میں اس کو خرچ کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائی، اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے حکمت و دانش سے نوازا ہو وہ اس کے مطابق فیصلے بھی کرتا

ہے اور لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیتا ہے۔" (بخاری: ۱/۳۱، مسلم: ۶/۹۷)

قضا میں عدل ومساوات:

اسلام لوگوں کے درمیان عدل وانصاف میں مساوات کا تقاضا کرتا ہے اور جو حقوق کسی نے دوسرے کے غصب کیے ہیں ان کو واپس لینا ضروری سمجھتا ہے۔ اس معاملہ میں شریف و ذلیل، آزاد اور غلام، متقی اور فاسق و فاجر، چھوٹا اور بڑا اور عاقل و مجنون اور دانش مند اور بے وقوف کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کرتا بلکہ ان میں سے ہر ایک کو اس کا جائز حق دیتا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

﴿واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل﴾

(النساء: ۵۸)

"اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔"

اسلام مسلمان اور کافر، کالا اور گورا اور مرد اور عورت ان میں کسی سے قضا کے لحاظ سے زیادتی کا قائل نہیں بلکہ یہ عدل وانصاف کے معاملہ میں مساوات کا قائل ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے مقدمہ کے جو حقائق پیش کیے جاتے آپ اس کے مطابق فیصلہ صادر فرماتے۔ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دو شخص حاضر ہوئے جن کا وراثت کے بارے میں جھگڑا تھا اور دلیل دونوں کے پاس کوئی نہیں تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کی بات سن کر فرمایا: "تم میرے پاس اپنے تنازعات لے کر آتے ہو، اور میں ایک بشر ہوں، ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اپنی طلاقت لسانی اور اپنی چرب بیانی سے میرے سامنے اپنے دلائل اس طریقہ سے پیش کرے کہ ان سے متاثر ہوکر اس کے حق میں فیصلہ کردوں۔ اگر میں اس کے کسی بھائی کے حق کا فیصلہ اس کے حق میں کردوں تو اسے دوسرے کا حق نہیں لینا چاہیے۔ اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ میں نے اس کے حق میں فیصلہ کیا ہے لہٰذا میں غلط ہونے کے باوجود سچا ہوں کیونکہ پیغمبر نے میرے حق میں ڈگری کی ہے، تو وہ مجھ سے جہنم کا پروانہ لے کر جارہا ہے۔ (بخاری: ۶/۲۲۲، مسلم: ۱۲/۴)

قاضیوں کا تقرر:

چونکہ نظام قضا فرض کفایہ ہے اور حق تعالیٰ شانہ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا ہے:
''بے شک اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے اہلوں کے سپرد کرو، اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلے کرو تو عدل کے ساتھ فیصلے کرو۔''

(النساء:۵۸)

اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے زمانہ میں مختلف لوگوں کو قاضی بنا کر بھیجا۔ کتب حدیث میں ''کتاب الاقضیہ'' کے عنوان سے جو ابواب ہیں ان کی روایات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قاضی کے فرائض و واجبات، عہدہ کے شرائط و آداب اور شہادت کے احکام وغیرہ نہایت تفصیل سے بیان فرمائے ہیں۔ اگرچہ معاملات حکومت میں آخری فیصلہ آپ ہی کا نافذ ہوتا تھا، لیکن مملکت میں توسیع کے باعث ہر مقدمہ آپ خود فیصلہ نہیں فرما سکتے تھے، اس لیے اپنی جانب سے آپ نے مختلف علاقوں قاضی مقرر فرمائے، اور ان کو بھیجتے وقت آپ نے ان کو خاص ہدایات ارشاد فرمائیں۔

چنانچہ سیدنا علی ؓ کو جب آپ ﷺ نے یمن کا قاضی مقرر فرمایا تو انہوں نے عرض کیا کہ میں تو کم عمر ہوں اور مجھ کو قضا کا نہ کوئی علم ہے اور نہ تجربہ۔ رسول اللہ ﷺ نے جواب میں فرمایا:

﴿اللهم ثبت لسانه واهد قلبه﴾ (البدایہ والنہایہ: ۵/۱۰۷، مسند احمد)
''اے اللہ! اس کی زبان کو استواری عطا فرما اور اس کے قلب کو راہ دکھا۔''

یہ بھی فرمایا کہ ''جب تم دو آدمیوں کا جھگڑا چکانے بیٹھو تو جس طرح تم نے پہلے فریق کی بات سنی ہے اسی طرح جب تک دوسرے فریق کی بات نہ سن لو، کوئی فیصلہ نہ کرو۔ یہی طریقہ ہے جس سے تمہارے لیے فیصلہ کرنا آسان ہوگا۔

(سنن ابوداؤد: ۳۰۴۷، ۲/۲۷۴، ترمذی: ۳/۶۱۸، ابن ماجہ: ۲/۷۷۴، سنن الدارمی: ۱/۶۹)

اسی طرح سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو قاضی بنا کر یمن بھیجا تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا: "جب تمہارے پاس مقدمات آئیں تو تم کیونکر حکم (فیصلہ) کرو گے؟" انہوں نے عرض کی: "میں کتاب اللہ کی روشنی میں فیصلہ کروں گا۔" فرمایا: "اگر کتاب اللہ میں تم اس کا حکم نہ پاؤ تو؟" عرض کی: "پھر میں سنت رسول ﷺ کی روشنی میں فیصلہ کروں گا۔" اب سوال کیا: "اگر سنت رسول ﷺ میں بھی تم اس کا جواب نہ پاؤ؟" سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "ایسی صورت میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوتاہی نہ ہونے دوں گا۔" سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کے منہ سے یہ جواب سن کر سرکار دو عالم ﷺ کا چہرۂ انور خوشی اور مسرت سے تمتما اٹھا۔ آپ نے خوشی سے ان کے سینہ پر پیار سے ہاتھ مارا اور فرمایا: "سب تعریفیں اس اللہ کے لیے جس نے رسول اللہ ﷺ کے رسول کو اس بات کی توفیق دی جو رسول اللہ ﷺ کی پسندیدہ ہے۔

(سنن ابی داؤد: ۲/۱۴۹، سنن دارمی: ۲/۷۸، مسند احمد بن حنبل: ۵/۲۳۰، سنن کبریٰ بیہقی: ۱۰/۱۱۴)

ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جو شخص مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ الفاظ، اشارات اور ان کو بٹھانے وغیرہ میں عدل اور مساوات سے کام لے۔" (رواہ الدارقطنی والطبرانی والبیہقی، الفتح الکبیر: ۳/۱۴۵)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص دو مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ ان دونوں میں سے ایک سے اونچی آواز سے مخاطب نہ ہو اگر وہ دوسرے سے اونچی آواز سے مخاطب نہیں ہوا۔

(رواہ الطبرانی والبیہقی، الفتح الکبیر: ۳/۱۴۵)

اگر حاکم خود فریق مقدمہ ہو تو اس کو بھی اپنے آپ کو پیش کر دینا چاہیے۔ چنانچہ جنگ بدر میں رسول اللہ ﷺ صفوں کو سیدھا فرما رہے تھے اور ان کے ہاتھ میں نیزہ کی ایک لکڑی تھی جس سے آپ لوگوں کو صف میں سیدھا فرما رہے تھے۔ سواد بن غزیہ رضی اللہ عنہ صف میں سے ذرا ہٹے ہوئے تھے۔ آپ نے وہ لکڑی ان کے پیٹ میں چبھوئی اور فرمایا: "سواد! سیدھے کھڑے ہو۔" سواد رضی اللہ عنہ نے کہا: "یا رسول اللہ! آپ

نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حق اور عدل کے ساتھ بھیجا ہے۔ میں آپ سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔'' آپ نے فوراً اپنا پیٹ اس کے سامنے بدلہ لینے کے لیے ننگا کر دیا، اور فرمایا: ''بدلہ لے لو۔'' سواد رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے بطن مبارک سے چمٹ کر بوسے دینے لگے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''سواد! تجھے کس چیز نے اس بات پر آمادہ کیا؟'' عرض کی: ''یا رسول اللہ! اسی چیز نے جواب آپ ﷺ دیکھ رہے ہیں، میں چاہتا تھا کہ آپ کے جسم سے اپنا جسم لگاؤں (تاکہ برکت ہو) رسول اللہ ﷺ نے اس کے لیے خیر کی دعا فرمائی۔

(کتاب: ''ہذا الحبیب محمد ﷺ یا محب، شیخ ابوبکر الجزائری، ص ۲۲۰)

ایک مرتبہ ایک یہودی نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خلاف سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں مقدمہ دائر کر دیا۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں آپ کی عدالت میں پیش ہوئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ یہودی کو تو اس کے نام سے مخاطب کرتے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ان کی کنیت ابوالحسن سے پکارتے۔ مؤرخین بتاتے ہیں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے چہرے پر غصہ کے آثار ظاہر ہو گئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: کیا آپ اس لیے ناراض ہو گئے ہیں کہ آپ کا مدمقابل ایک یہودی ہے جس کے ساتھ آپ ایک قاضی کے سامنے کھڑے ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بات ایسی نہیں ہے بلکہ میرے غصے میں آنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان مساوات سے کام نہیں لے رہے۔ آپ ایک فریق کو تو اس کے نام سے بلا رہے ہیں جب کہ مجھے میری کنیت سے مخاطب کر رہے ہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کے اس رویے کی وجہ سے یہودی یہ سمجھے گا کہ مسلمانوں میں عدل و انصاف کی اقدار ختم ہو گئی ہیں۔ (کیونکہ کسی کو اس کی کنیت سے مخاطب کرنا اس کی تعظیم ہے۔ اور اس وقت عدالت کے سامنے ہم دونوں کی حیثیت برابر ہے، لہٰذا آپ کو مجھے بھی کنیت سے نہیں بلکہ میرے نام ہی سے مخاطب کرنا چاہیے۔)

(علی ـ امام المتقین، لعبد الرحمن شرقاوی، ص ۱۰۴)

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، سیدنا عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ، اور سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ

وجہ تھی جو اس خدمت پر مامور رکھا۔ علامہ سرخسیؒ نے لکھا ہے کہ یہ حضرات عہد صدیقیؓ میں قاضی نہیں تھے بلکہ اصحاب افتاء تھے۔ (مبسوط ۱۶: ۱۰۹)

صدر اول میں قاضی کو بھی مفتی کہتے تھے، لیکن اگر یہ قاضی بھی مان لیے جائیں تو سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ صدیقی دور میں قاضی القضاۃ (Chief Justice) کے عہدہ پر فائز تھے، اور اہم معاملات کا فیصلہ آپ ہی فرماتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ تاریخوں میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے لیے افتاء کا نہیں بلکہ قضاء کا لفظ آیا ہے۔

طبری میں ہے کہ جب سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے خود فرمایا: "انا اکفیک القضاۃ" میں آپ کے لیے قاضی کا کام کروں گا، لیکن چونکہ وہ دور خیر القرون کا تھا اس لیے سال بھر تک کوئی جھگڑا اور قضیہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش نہ ہوا۔ (طبری ۲/ ۶۱۷)

ابن اثیر نے الکامل میں لکھا ہے:

"اور اس سال سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو قاضی مقرر فرمایا اور وہ تمام خلافت صدیقی میں قضا کا کام کرتے رہے۔"

تاریخ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس حق قضا کو پوری آزادی سے استعمال کیا اور مقدمات کے فیصلہ کے بارے میں وہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے کی بھی پروا نہ کرتے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو قاضی تو آپ تھے ہی لیکن صوبوں کا انتظام، حکومت کے وسیع معاملات اور اعلیٰ سیاست نے انہیں ان تمام ذمہ داریوں سے غافل کر رکھا تھا۔ چنانچہ آپ نے جلد ہی یہ محسوس فرما لیا کہ وہ ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو رہے جن کے بارے میں اپنی بیعت کے روز انہوں نے عوام سے وعدہ کیا تھا۔ عراق و شام کے اسلامی لشکروں کی خبریں ان کی بہت سی توجہ اور ان کا بہت سا وقت لے لیتی ہیں، اور مملکت کے مختلف حصوں میں ان کے گورنر کیا کچھ کر رہے ہیں، ان کے بارے میں بھی وہ سوچتے رہتے تھے۔ آپ نے ارادہ فرمایا کہ وہ اپنی مختلف ذمہ داریوں کے بوجھ کو مختلف معاونین کے سپرد کریں جو عوامی مفاد کے لیے اس طرح کام کریں کہ

اس سے حکومت کا مفاد متاثر نہ ہو۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے انہوں نے عدالتی فرائض سے سبک دوش ہو کر یہ خدمت سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے سپرد فرما دی اور انہیں قاضی کے نام سے موسوم کر دیا کہ لوگ اگر مقدمات اور خصومات ان کے پاس لائیں تو ان کا فیصلہ کتاب وسنت اور اپنے اجتہاد کی روشنی میں کریں۔ بعض روایات میں ہے کہ جب سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ لوگوں کے تنازعات اور خصومات کے فیصلے کریں اور جنگی امور سے علیحدگی اختیار کر لیں۔

(سیرۃ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ لابن جوزی: باب ۳۳ ص: ۱۱۲)

حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ:

"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ ہوتے ہی مدینہ کا قاضی سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا اور ملک شام کے لیے اپنا نائب سیدنا ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا۔ (البدایہ والنہایہ: ۷/۱۶۲)

قضاۃ کا انتخاب:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے جوہر شناسی کا ملکہ ودیعت فرمایا تھا، لیکن آپ نے قضاۃ کے انتخاب میں گورنروں کے انتخاب کی طرح بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کا ثبوت دیا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ خود فقہ وشریعت کے عالم تھے اور ان کی نظر اس قدر گہری تھی کہ اس وقت میں کوئی اور ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ آپ نے قاضی شریح کو کوفہ کا قاضی مقرر فرما دیا جہاں وہ ساٹھ برس تک اس منصب پر قائم رہے۔ کوفہ کا پہلے قاضی آپ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا جن کی قابلیت اور فقاہت بے مثال تھی۔ ان کی جلالت وعظمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کوفہ کا قاضی اور معلم بنا کر بھیجا تو اہل کوفہ کو لکھا:

"میں تمہاری طرف عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو علی الترتیب امیر اور معلم بنا کر بھیج رہا ہوں۔ یہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں اور اہل بدر میں سے بھی ہیں، لہٰذا تم (اپنے دائرہ

میں) ان دونوں کی پیروی کرنا اور ان کے اقوال کو عملی جامہ پہنانا۔"

(اعلام الموقعین: ۹۲/۲)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بعد 19ھ میں شریح کو قاضی مقرر فرمایا۔ یہ اگرچہ صحابی رسول نہ تھے لیکن اپنی ذہانت اور معاملہ فہمی میں تمام عرب میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ سلمان ربیعہ الباہلی، عبدالرحمن بن ربیعہ، ابوقرہ الکندی اور جمیل بن معمر وغیرہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مختلف علاقوں کے قاضی تھے جو اپنے زمانہ کے علم و فضل، ذہانت اور معاملہ فہمی میں نہایت جلیل القدر حضرات تھے۔ بصرہ کے قاضی کعب بن سور الازدی تھے جو اپنے زمانہ کے علم و فضل اور معاملہ فہمی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ فلسطین کے قاضی سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ تھے۔ مدینہ کے ایک قاضی سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی تھے جو رسول اللہ ﷺ کے کاتب وحی بھی تھے اور علم الفرائض میں تمام عرب میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔

عراق کے قاضی سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک خط لکھا تھا جس میں قضاء کے بارے میں انہیں مختلف ہدایات دیں جو قیامت تک آنے والے قاضیوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ آپ نے ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو لکھا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○ اللہ کے بندے امیر المومنین کی طرف سے عبداللہ بن قیس کے نام، سلام علیک! اما بعد: واضح ہو کہ فیصل مقدمات ایک اہم فریضہ ہے جس پر ہر زمانہ میں عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔ جب کوئی مقدمہ تمہارے پاس آئے تو اس کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھو (اور جب صحیح فیصلہ سمجھ میں آ جائے تو اسے نافذ کر دو کیونکہ زبانی فیصلہ بے سود ہے تاوقتیکہ اسے عملاً نافذ نہ کیا جائے۔ مدعی اور مدعا علیہ کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرو کیونکہ کسی ایک فریق سے بات کرنے یا عدالت میں بٹھانے یا انصاف کرنے میں کوئی امتیاز نہ برتو تاکہ "بڑا آدمی" یہ توقع نہ کرے کہ تم اس کے ساتھ رعایت کرو گے، اور "غریب اور کمزور" کو یہ اندیشہ نہ ہو کہ اس کے ساتھ ناانصافی سے پیش آؤ گے۔ جو شخص دعویٰ کرے اس سے گواہ طلب کیے جائیں، اور جو دعویٰ

نہ مانے (یعنی مدعا علیہ) اس سے قسم لی جائے۔ مسلمانوں کے درمیان صلح کرانا جائز ہے بشرطیکہ اس سے قرآن حکیم کا کوئی قانون نہ ٹوٹے۔ اگر کل تم نے کوئی فیصلہ کیا اور آج اس سے بہتر فیصلہ تمہاری عقل اور سمجھ بوجھ نے تمہیں بتا دیا تو اپنے پہلے فیصلے کو رد کر سکتے ہو، اس لیے کہ حق ازلی ہے اور اس کی طرف رجوع کرنا غلطی پر اڑے رہنے سے بہتر ہے۔ جس مسئلہ میں شبہ ہو اور وہ تمہیں قرآن و حدیث میں نہ ملے تو اس پر غور کرو، پھر غور کرو اور اس کی امثال و نظائر کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے قیاس و اجتہاد سے کام لو۔ کوئی شخص اگر اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لیے مہلت مانگے تو اسے مہلت دو، اور اگر وہ گواہ پیش کر دے تو اس کا حق دلوا دو، ورنہ مقدمہ خارج کر دو۔ اس سے شک مٹے گا اور ظلم و ستم کی سیاہی دور ہو گی۔ ہر مسلمان ثقہ ہے سوائے ان اشخاص کے جنہیں کسی جرم میں کوڑے لگائے جا چکے ہیں یا جنہوں نے جھوٹی گواہی دی ہو یا ولد و نسب میں مشکوک ہوں۔ تمہاری چھپی ہوئی بداعمالیوں کا معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا میں قانونی سزا سے بچنے کے لیے اس نے گواہی میں حلف ضروری قرار دیا ہے۔ خبردار! تمہارے دل میں اہل مقدمہ سے خفگی، اکتاہٹ یا چڑچڑا پن نہ ہو۔ کیونکہ جو شخص حق و انصاف کے موقع پر حق و انصاف قائم کرتا ہے وہ اللہ کے انعام اور اچھی شہرت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ جس کسی نے اپنی نیت درست رکھی، اس کے اور لوگوں کے درمیان اللہ کافی ہے، اور جو ان سے بناوٹی اخلاق کے ساتھ پیش آیا اس کے لیے اللہ کے رزق اور رحمت کی امید نہ رکھو والسلام۔

(سنن دار قطنی: ص ۵۱۳، عیون الاخبار لابن قتیبہ: ۶۶/۱، البیان و التبیین، جاحظ: ۱۴۴/۲، نہایۃ الارب نویری: ۱۳۵/۶، مقدمہ ابن خلدون: ۱۸۳/۱، ازالۃ الخفا: ۱۱۹/۲، سنن کبریٰ بیہقی: ۱۱۹/۱۰)

شعبی کا بیان ہے کہ کھجوروں کے کاٹنے پر سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے مابین کچھ نزاع ہو گئی۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ رو دیے اور کہا: ''عمر!

تمہاری خلافت میں ایسا ہوا؟'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے اور اپنے درمیان کسی کو فیصل بنا لو۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو فیصل بناتا ہوں۔'' یہ دونوں حضرات سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہم دونوں تمہارے پاس اس لیے آئے ہیں تاکہ تم ہمارے درمیان فیصلہ کرو۔'' سیدنا زید رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں بیٹھ کر فیصلہ دیا کرتے تھے۔ سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس بٹھانا چاہا اور کہا: ''امیر المومنین! یہاں تشریف رکھئے۔'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''پہلا ظلم ہے جو تمہارے فیصلے میں جاری ہوا۔ میں مدعی کے ساتھ بیٹھوں گا۔'' یہ دونوں حضرات سیدنا زید رضی اللہ عنہ کے سامنے بیٹھ گئے۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے دعویٰ پیش کیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے دعویٰ سے انکار کیا۔ سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے کہا: ''امیر المومنین! کو قسم کھانے سے معذور رکھو۔ (شرعی قاعدہ کی بنا پر اگر مدعی کے پاس گواہ نہ ہوں تو مدعا علیہ سے قسم لی جاتی ہے۔) اور میں قسم کی معافی کا کسی کے لیے سوائے ان کے سوال نہیں کرتا ہوں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی اور پھر قسم کھا کر فرمایا: ''زید رضی اللہ عنہ صحیح فیصلہ پر نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ عمر رضی اللہ عنہ اور مسلمان رعایا ان کے نزدیک برابر نہ ہوں۔'' (کنز العمال ۳/۱۷۴، ۱۸۱)

یہ واقعہ بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی عدل گستری کی ایک روشن مثال ہے جس کو سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ ایک مصری سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: ''امیر المومنین! میں ظلم سے آپ کی پناہ پکڑنے آیا ہوں۔'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں نے تجھے پناہ دی۔'' اس شخص نے کہا: ''میں نے گورنر مصر عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے کے ساتھ دوڑ کی بازی لگائی اور میں اس سے آگے نکل گیا۔ اس نے غصہ میں آکر مجھے کوڑے سے مارنا شروع کیا اور کہتا تھا: ''میں بڑے آدمی (گورنر مصر) کا بیٹا ہوں۔'' یہ سن کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے گورنر مصر سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ اپنے بیٹے کو لے کر بارگاہ خلافت میں حاضر ہوں۔'' سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے کو لے کر مدینہ حاضر ہوئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وہ مصر کا رہنے والا کہاں ہے؟'' جب وہ حاضر ہوا تو فرمایا: ''یہ لے کوڑا اور اس بڑے آدمی کے بیٹے کو اسی طرح مار جس طرح اس نے تجھے مارا تھا۔'' اس

مصری نے کوڑا لے کر گورنر مصر کے بیٹے کو مارنا شروع کیا یہاں تک کہ اس نے اپنا بدلہ لے لیا۔ اس کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اب عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی چندیا پر بھی کوڑے مارو'' مصری نے کہا: ''امیر المؤمنین! اس کے بیٹے نے مجھے مارا ہے انہوں نے نہیں مارا، اور میں اپنا بدلہ لے چکا ہوں'' آپ نے فرمایا: ''اس کو بھی کیونکہ اس کی شہ پر اس نے تجھے مارا تھا'' پھر آپ نے سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

﴿متی استعبدتم الناس؟ وقد ولدتهم امهاتهم احرارا﴾

''تم نے کب سے لوگوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا ہے۔''

سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''مجھے اس واقعہ کا کچھ علم نہیں اور نہ یہ شخص شکایت لے کر میرے پاس آیا'' (کنز العمال، ۴/۴۲۰)

کسی مسلمان نے شام میں ایک ذمی کو قتل کر دیا۔ اس کا مقدمہ سیدنا ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا۔ سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا۔ آپ نے جواب میں فرمایا: ''اگر اس مسلمان میں ذمیوں کو قتل کرنے کی عادت پڑ چکی ہے تو اس کی گردن مار دو، اور اگر طیش میں آ کر جلد بازی کی ہے تو اس کی دیت ادا کرواؤ۔ (کنز العمال: ۷/ ۲۹۸)

اسی طرح کا ایک واقعہ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا بھی ہے کہ انہوں نے اپنی ایک زرہ کے بارے میں قاضی شریح کی عدالت میں ایک یہودی پر مقدمہ دائر کر دیا۔ قاضی شریح رحمہ اللہ نے خلیفۂ وقت سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے شہادت طلب کی۔ وہ اپنے بیٹے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور اپنے غلام کو گواہ کے طور پر لائے۔ قاضی شریح نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی شہادت کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ بیٹے کی باپ کے حق میں شہادت قابل قبول نہیں۔ چنانچہ آپ نے یہودی کے حق میں زرہ کا فیصلہ کر دیا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ خلیفۂ وقت ہونے کے باوجود کچھ نہ کر سکے۔ یہودی اس عدل سے بہت متاثر ہوا، اور اسی وقت مسلمان ہو گیا، اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے کہا یہ زرہ واقعی آپ کی ہے۔ آپ کا دعویٰ درست اور صحیح تھا۔ آپ صفین سے واپس آ رہے تھے تو یہ زرہ آپ کے اونٹ سے گر گئی تھی۔ لہٰذا آپ اپنی زرہ

لے لیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اب جب کہ تو مسلمان ہو گیا، اب یہ زرہ میری نہیں بلکہ تمہاری ہے۔ (البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر: ۴/۸، اخبار القضاۃ لوکیع: ۲/۱۹۴)

مقدمہ کے فریقین کے بارے میں برابری اور مساوات اور پھر عدل وانصاف پر مبنی فیصلوں سے اسلامی تاریخ بھری پڑی ہے، خصوصی طور پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں دنیا میں عدل وانصاف کی مثالیں قائم کیں۔ خلافت راشدہ کے بعد بھی مدتوں تک اگرچہ خود بادشاہوں میں کئی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں لیکن مسلمانوں کا عدالتی نظام قرآن و سنت پر مبنی قائم رہا۔ عدلیہ بالکل آزاد رہی اور بڑے بڑے لوگ قاضیوں کی عدالتوں میں ملزموں کے طور پر کھڑے رہے۔ اور قاضیوں نے ان بڑوں کے خلاف فیصلے کیے۔ موجودہ دور کی طرح ''نظریہ ضرورت'' کا استعمال نہیں کیا۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان اور اس کے بعد آنے والے دوسرے خلفاء بھی قاضیوں کے فیصلوں کے خلاف بے بس رہے۔

خلیفہ مامون الرشید ایک روز عدالت میں فیصلے کر رہا تھا تو سب سے آخر میں اس کے پاس ایک عورت آئی جو معلوم ہوتا تھا کہ سفر کر کے آئی ہے اور لباس اس کا پھٹا پرانا تھا۔ وہ خلیفہ مامون الرشید کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور عرض کیا کہ ایک شخص نے مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے۔ خلیفہ نے پوچھا: ''وہ کون ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''امیر المومنین! وہ آپ کے سر کے پاس کھڑا ہے۔'' اور اس نے عباس بن مامون الرشید کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ مامون نے کوتوال سے کہا: ''اے احمد بن ابی خالد! عباس کو ہاتھ سے پکڑ کر اس عورت کے ساتھ بٹھا دو۔ چنانچہ عباس کو مدعیہ کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ اب اس عورت نے اونچی آواز سے اپنی روداد غم سنانی شروع کی۔ عورت کی آواز تو اونچی تھی، جبکہ مامون کا بیٹا عباس رک رک کر اور آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ احمد بن ابی خالد نے اس عورت سے کہا: ''اے اللہ کی بندی! تو امیر المومنین کے سامنے ہے، اور تو امیر المومنین سے بات کر رہی ہے لہٰذا نیچی آواز سے بات کرو۔ مامون نے یہ سن کر کہا: ''احمد! اس کو کچھ نہ کہو، اس کے حق نے اس کی آواز کو اونچا کیا ہے اور عباس کے جھوٹے ہونے نے اس کو گونگا کر دیا ہے۔ پھر مامون نے اس عورت کے حق میں فیصلہ کیا اور اس پر کیے گئے مظالم کا ازالہ کیا۔ اور شہزادے سے جرمانہ کی بڑی رقم وصول کر کے عورت کو دی۔ (حقوق الانسان فی الاسلام للزحیلی: ص ۳۰)

امام ابو یوسفؒ امام ابو حنیفہؒ کے خاص شاگرد تھے۔ آپ تین عباسی خلفاء ہادی، مہدی اور ہارون الرشید کے زمانوں میں قاضی القضاۃ (Chief Justice) کے عہدے پر فائز رہے۔ انہوں نے اپنے عہد قضا میں ہر ممکن کوشش کی کہ فیصلہ عدل و انصاف سے ہو، اور ہارون الرشید خصوصی طور پر آپ کے علم و تقویٰ اور عدالتی فیصلوں سے بڑا متاثر تھا۔ ایک مرتبہ ہارون الرشید قاضی ابو یوسفؒ کے ساتھ بیٹھ کر مختلف مقدمات سن رہا تھا کیونکہ خلیفہ ہفتہ میں کچھ روز خود بھی قاضی ابو یوسفؒ کے ساتھ بیٹھ کر مقدمات سنا کرتا تھا۔ اس روز میں ہارون خود کرسی عدالت پر بیٹھا ہوا تھا کہ نصرانی بڈھے نے خود ہارون الرشید کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا۔ دعویٰ یہ تھا کہ فلاں باغ میرا ہے جس پر خلیفہ نے غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔ قاضی ابو یوسفؒ نے خلیفہ سے کہا کہ اس بڈھے کا آپ کے اوپر دعویٰ ہے کہ آپ نے مدعی کے باغ پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔

خلیفہ کو قاضی کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی کیونکہ عدلیہ اس زمانے میں صحیح معنوں میں آزاد تھی، آج کل کی طرح مجبور و مقہور نہ تھی۔ قاضی نے پوچھا: ''بڑے میاں! آپ کا دعویٰ کیا ہے؟'' اس نے کہا: ''میرے باغ پر امیر المومنین نے قبضہ کر لیا ہے جس کے خلاف میں داد رسی چاہتا ہوں۔ قاضی صاحب نے خلیفہ سے کہا کہ آپ اس دعویٰ کے جواب میں کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ ہارون نے کہا: ''میرے قبضہ میں اس شخص کی کوئی چیز نہیں، اور نہ خود باغ ہی میں اس کا کوئی حق ہے۔ قاضی صاحب نے مدعی سے اس کے دعویٰ کے ثبوت میں دلیل طلب کی۔ اس نے کہا کہ ''امیر المومنین سے قسم لے لی جائے۔'' ہارون نے قسم کھا کر کہا کہ یہ باغ میرے والد مہدی نے مجھے دیا تھا۔ میں اس کا مالک ہوں۔ بڈھے نے یہ سنا تو بڑبڑاتا ہوا غصے میں باہر نکل گیا کہ جس طرح کوئی ستو گھول کر پیتا ہے اس طرح اس شخص نے بآسانی قسم کھا لی ہے۔ ایک معمولی آدمی کے منہ سے یہ ہتک آمیز الفاظ سن کر ہارون کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا، لیکن قاضی ابو یوسف کی دینی جلالت و عظمت کے باعث وہ آپ کے عادلانہ فیصلے کے خلاف چوں بھی نہ کر سکا۔

محمد تغلق ہندوستان کا شہنشاہ تھا۔ ایک روز اپنے باغ میں ٹہل رہا تھا کہ اچانک سامنے سے ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور بادشاہ سے ٹکرا گیا۔ بادشاہوں کی نازک مزاجی تو

تاب تخت نہیں رکھتی، ایک لڑکے کا بادشاہ وقت سے ٹکرانا تو بہت بڑی بات تھی۔ محمد تغلق کو بچے کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا اور اس نے اسے چھڑی سے پیٹ ڈالا۔

لڑکا روتا ہوا عدالت میں پہنچا کیونکہ اس زمانہ میں وکیلوں اور فیسوں سے عدالت میں نہیں جایا جاتا تھا۔ قاضی القضاۃ کے پاس ہندوستان کے شہنشاہ محمد تغلق کے خلاف اس نے استغاثہ دائر کر دیا کہ اس نے مجھے ناجائز اور بے قصور پیٹا ہے۔ عدالت نے بادشاہ کے نام سمن جاری کر دیئے اور اس کو عدالت میں طلب کیا۔

محمد تغلق ایک ملزم کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہوا اور ملزموں کے کٹہرے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے قاضی کے سامنے اپنا جرم تسلیم کر لیا۔ قاضی نے بادشاہ کو ایک روز کی مہلت دی اور کہا کہ کل تک اس لڑکے کو راضی کر لو ورنہ قصاص کے لیے تیار ہو جاؤ۔

محمد تغلق نے لڑکے کو راضی کرنے کے لیے بہت سا مال و زر دینا چاہا لیکن وہ کسی صورت رضا مند نہ ہوا۔ دوسرے روز بادشاہ قاضی کی عدالت میں پیش ہوا اور بچے کو راضی کرنے میں اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ قاضی نے قصاص کا حکم جاری کر دیا۔ چنانچہ قاضی کے حکم سے لڑکے نے اس چھڑی سے جس سے بادشاہ نے اسے پیٹا تھا، بادشاہ کے جسم پر 21 بید مارے۔ بادشاہ نے نہایت صبر و تحمل سے اس چھڑی کی ضربوں کو برداشت کیا اور اف تک نہ کی۔ سزا کے بعد بادشاہ نے دو رکعت نفل شکرانہ ادا کی کہ حق تعالیٰ شانہ نے اسے عدل و انصاف پر ثابت قدم رکھا اور دنیا میں اس سے جو غلطی ہوئی تھی اس کی سزا اسے دنیا ہی میں مل گئی۔

اصل میں انسان بری الذمہ ہے:

یہ ایک فقہی اور اصولی قاعدہ ہے کہ جرائم میں انسان بری الذمہ ہے۔ اس کو مجرم ثابت کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔ (ملاحظہ ہو الاشباہ والنظائر للسیوطی ص ۳۵)

اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

﴿ادرؤوا الحدود بالشبهات، ان الامام أن يخطئ في العفو خير من ان يخطئ في العقوبة﴾

(سنن الترمذی مع تحفۃ الاحوذی: ۲/ ۶۸۸، المستدرک: ۴/ ۳۸۳)

''شبہات کی موجودگی میں حدود ساقط کردو، کیونکہ حاکم غلطی سے معاف کردے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ غلط سزا دے۔''

شریعت نے کسی جرم کے اعتراف پر سختی اور زبردستی کرنے سے منع فرمایا۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

﴿رفع عن امتی الخطاء والنسیان وما استکرھوا علیه﴾

''اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطا، بھول چوک (نسیان) اور وہ گناہ معاف کردیا ہے جو زبردستی اس سے کرایا جائے۔''

(رواہ ابن ماجہ: ۱/۶۵۹، والبیہقی: ۷/۳۵۶، والدار قطنی: ۴/۱۷۱ وھو حدیث حسن)

جو آدمی کسی حق کا دعویٰ کرے یا کوئی جرم ثابت کرنا چاہے تو اس کا اثبات اور دلیل مدعی کے ذمہ ہے۔ اگر کسی دعویٰ ہی کی وجہ سے لوگوں کو حق دینا شروع کردیا جائے تو لوگ لوگوں کے مال اور خون تک کا دعویٰ کرنا شروع کردیں گے، لیکن جو دعویٰ سے انکار کرے اس کے ذمہ قسم ہے۔ اور بیہقی کی روایت میں ہے:

﴿البینة علی المدعی والیمین علی من انکر﴾

''مدعی کے ذمہ دلیل اور شہادت ہے اور جو انکار کرے اس کے ذمہ قسم ہے۔''

(بخاری: ۴/۱۶۵۶، مسلم: ۱۲/۲، مسند احمد: ۱/۳۴۳، سنن کبریٰ بیہقی: ۱۰/۲۵۲)

(3) مواخذہ صرف مجرم کو ہے:

شریعت اسلامیہ میں ہر شخص اپنے جرم کی وجہ سے ماخوذ ہوگا۔ یہ نہیں کہ بیٹا جرم کرے اور باپ پکڑا جائے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں بھی ہے:

﴿من یعمل سوءا یجز به﴾ (النساء: ۱۲۳)

''جو شخص کوئی برا کام کرے گا اسے اس کی سزا دی جائے گی۔''

اور ایک اور آیت میں فرمایا:

﴿ولا تزر وازرة وزر اخری﴾ (الانعام: ۱۶۴)

''اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا''

اور حدیث میں بھی آتا ہے کہ:

﴿لا یؤخذ الرجل بجریرۃ ابیہ، ولا بجریرۃ اخیہ﴾

''کوئی شخص اپنے باپ کے جرم میں نہ پکڑا جائے اور نہ ہی اپنے بھائی کے جرم میں پکڑا جائے'' (ابوداؤد، رقم: ۴۴۹۵/۴، ۱۶۸)

اس سلسلہ میں ایک بات رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمائی:

''تین آدمیوں سے قلم اٹھا لیا گیا: پاگل سے جب تک اس کو عقل نہ آجائے، سونے والے سے جب تک وہ جاگ نہ اٹھے اور بچے سے جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے''

(رواہ ابوداؤد: ۲/۲۲۸، ترمذی: ۴/۲۸۵، ابن ماجہ: ۱/۶۵۸، مستدرک حاکم: ۴/۳۸۹)

گواہوں کی تکریم:

اسلام نے گواہوں کے حقوق کا بھی تحفظ کیا ہے اور تاکید کی ہے کہ ان کو کسی قسم کی ایذا اور تکلیف نہ دی جائے، نہ ان کی اہانت کی جائے اور نہ ان پر کسی قسم کی کوئی زیادتی کی جائے، بلکہ ان کا اکرام واحترام کیا جائے، اور گواہوں سے بھی کہا کہ جب انہیں گواہی کے لیے بلایا جائے تو وہ عدالت میں گواہی کے لیے حاضر ہوں۔

﴿ولا یأب الشھداء اذا ما دعوا﴾ (بقرہ ۲۸۲)

''اور جب گواہوں کو گواہی کے لیے بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔''

اور نہ گواہ کو کوئی تکلیف اور ایذا پہنچائی جائے۔

﴿ولا یضار کاتب ولا شھید﴾ (بقرہ ۲۸۲)

''اور نہ کسی (تحریر) لکھنے والے کو ضرر پہنچایا جائے اور نہ گواہ کو''

''اور اگر کسی نے گواہ کو کوئی ضرر پہنچایا تو وہ گناہ ہوگا'' (بقرہ: ۲۸۲)

یعنی اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ صاحب حق کاتب کو اور گواہ کو ان کے کاموں سے روک کر انہیں لکھنے اور گواہی دینے کے لیے مجبور کریں یا ان کو اس سلسلہ میں

ہونے والے اخراجات ادا نہ کریں یا لکھنے اور گواہی دینے میں جو ان کا وقت صرف ہو اس کا معاوضہ ان کو ادا نہ کریں۔

گواہوں کی تکریم و احترام کرنے اور انہیں کسی قسم کی اذیت اور مضرت پہنچانے سے اس لیے روکا گیا کہ گواہ ہی عدالت کی بنیاد ہیں اور انہی کی گواہی پر مظلوم کو انصاف مہیا ہوگا۔ اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اکرموا الشھود، فان اللہ یحیی بھم الحقوق﴾

(الفتح الکبیر: ۱/۲۲۶، کشف الخفاء: ۱/۱۹۵)

"گواہوں کا اکرام و احترام کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہی کی وجہ سے لوگوں کے حقوق زندہ رکھے ہیں۔"

اسلام میں نہ تو شہادت دینے سے انکار جائز ہے اور نہ ہی کسی معاملہ میں شہادت کو چھپانا جائز ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے کہ:

"جب گواہوں کو بلایا جائے تو وہ شہادت دینے سے انکار نہ کریں۔"

(بقرہ: ۲۸۲)

اور حدیث میں بھی شہادت دینے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "سب سے بہتر گواہ وہ ہے جو پوچھے جانے سے قبل شہادت دے۔"

(موطا امام مالک: ۲/۲۷۵، مسلم کتاب الاقضیہ)

اس حدیث کی شرح میں امام نوویؒ فرماتے ہیں: "جو شخص کسی واقعہ کا گواہ ہو اسے اپنی شہادت چھپانی نہیں چاہیے بلکہ قاضی اور حاکم وقت کے سامنے گواہی دینے میں سبقت کرنی چاہیے۔ فقہاء کے نزدیک اگر اور گواہ مل سکتے ہوں تو شہادت دینے سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری: ۳/۳۵۸، درمختار: ۳/۴۲۷) کیونکہ شہادت فرض کفایہ ہے۔

حق تعلّم

اسلام نے ہر شخص کو اس بات کا حق دیا ہے کہ دین اور دنیا کے ہر ایک امر کی بابت تحقیق کرے اور اس کو سیکھے جو اس کے لیے نفع اور فائدہ کا باعث ہو، بلکہ اسلام نے تو علم سیکھنے کو فرض قرار دیا۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

﴿طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم﴾ (رواہ ابن ماجہ برقم:۲۲۹)

''علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔''

اور لفظ مسلم میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں بلکہ بعض روایات میں ''مسلمۃ'' کا لفظ بھی آیا ہے۔

علم کی مدح:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن حکیم میں علم اور علماء کی مدح اور تعریف فرمائی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون﴾ (زمر:۹)

''آپ کہیے کیا علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں۔''

ایک اور مقام پر حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا:

﴿انما یخشی اللہ من عبادہ العلمٰؤا﴾ (فاطر:۲۸)

''اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی اللہ سے ڈرتے ہیں۔''

علم کی فضیلت اور علماء کی مدح میں اور بھی بہت سی آیات قرآن حکیم میں موجود

ہیں جن کو طوالت کی وجہ سے یہاں نقل نہیں کیا جا رہا ہے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ مجادلہ: ۱۱، سورۃ آل عمران: ۱۸، سورۃ طٰہٰ: ۱۱۴، البقرۃ: ۳۲۔۳۳)

اب دیکھنا یہ ہے کہ علم کیا ہے جس کی اللہ کے ہاں فضیلت ہے۔ حکماء کے نزدیک علم کی تعریف ہے۔

﴿حصول صورة الشئي في العقل﴾

''یعنی کسی شے کی صورت کا عقل میں حاصل ہونا۔''

متکلمین کے نزدیک علم کی مشہور تعریف یہ ہے۔

﴿هو صفة يتجلي بها المذكور لمن قامت هي به﴾

''عالم کے ذہن میں کسی چیز کا انکشاف علم ہے۔''

اس تعریف کا خلاصہ یہ ہے کہ علم انکشاف ذہنی کا نام ہے۔ یہ انکشاف تام اور غیر مشتبہ ہونا چاہیے۔ علم مقولہ کیف میں سے ہے کیونکہ علم کیفیت نفسانیہ کا نام ہے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اتحاف السادۃ المتقین: ۱/۶۵۔۶۶)

لیکن محدثین کی اصطلاح میں علم مومن کے قلب میں ایک نور ہے جو فانوس نبوت کے چراغ سے مستفاد ہوتا ہے۔ یہ علم اقوال، افعال اور احوال نبوت کے ادراک کا نام ہے۔ یہ علم اگر کسی بشر کے واسطہ سے حاصل ہو تو کسبی ہے اور اگر بلاواسطہ ہو تو ''لدنی'' ہے۔

جب علم کا لفظ مطلقاً بولا جائے تو اس سے مراد علم دین ہوتا ہے اور اس کی کئی قسمیں ہیں۔ جو شخص علم دین کے حصول کا ارادہ کرے اور وہ اہل عرب میں سے نہ ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ پہلے عربی زبان اور اس کے قواعد کا علم حاصل کرے اور اس میں مہارت تامہ پیدا کرے۔ پھر قرآن حکیم کے علم کو حاصل کرے اور بغیر احادیث کی معرفت کے قرآن حکیم کے معانی کی وضاحت ممکن نہیں، اور احادیث کا علم آثار صحابہ کی معرفت کے بغیر ممکن نہیں ہے، اور آثار صحابہ کی معرفت کے لیے تابعین اور تبع تابعین کی معرفت ضروری ہے کیونکہ علم دین ہم تک اسی طرح درجہ بدرجہ پہنچا ہے۔ اور جب قرآن، سنت، آثار صحابہ اور اقوال تابعین کا علم حاصل ہو جائے تو پھر اجتہاد کرے، اور متقدمین کے مختلف اقوال میں غور کرے اور جو قول اس کے نزدیک دلائل سے راجح ہو اس

کو اختیار کرے اور جو نئے مسائل پیدا ہوں، ان کا قیاس کے ذریعہ حل تلاش کرے۔
(بیہقی، شعب الایمان: ۲/۲۵۱)

علم کی فضیلت احادیث میں:

احادیث میں بھی رسول اللہ ﷺ نے علم کی بڑی تعریف فرمائی ہے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ نیکی اور اجر کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔ یہ روایت سیدنا ابن عباس سے بھی مروی ہے۔

(بخاری، رقم: ۷۱، مسلم، رقم: ۱۰۳۷، مسند احمد: ۱/۳۰۶، سنن الدارمی، رقم: ۲۳۱، معجم کبیر طبرانی، رقم: ۱۰۷۸۷، شرح السنۃ بغوی: ۱/۲۷۹، سنن الدارمی: ۱/۷۳، ابو نعیم، حلیۃ الاولیاء: ۵/۱۴۳)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص علم تلاش کرنے کے لیے کسی راستہ پر چلا، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کی طرف راستہ آسان کر دیتا ہے۔'' (سنن الترمذی، رقم: ۲۶۴۶)

سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص علم کی طلب میں کسی راستہ پر گیا، اللہ جنت کے راستوں کو اس کے لیے آسان کر دیتا ہے، اور فرشتے طالب علم کی رضا کے لیے اپنے پر جھکاتے ہیں، اور آسمانوں اور زمینوں کی تمام مخلوق طالب علم کی مغفرت کے لیے دعا کرتی ہے حتیٰ کہ پانی کی مچھلیاں بھی، اور بے شک عالم کی فضیلت عابد پر ایسے ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر ہے، اور بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء کسی کو دینار اور درہم کا وارث نہیں بناتے وہ علم کا وارث بناتے ہیں، سو جس نے علم حاصل کیا اس نے عظیم حصہ کو حاصل کیا۔

(سنن ابی داؤد، رقم: ۳۶۴۲، سنن ترمذی: ۲۶۸۲، مسند احمد: ۵/۱۹۶)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ طالب علم کی رضا طلب کرنے کے لیے فرشتے) اپنے پر بچھاتے ہیں۔
(تاریخ دمشق: ۷/۱۳، رقم الحدیث: ۲۰۷۷، جمع الجوامع، رقم: ۱۳۸۸۴، کنز العمال، رقم: ۲۸۷۲۵)

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: علم کی تین قسمیں ہیں، اس کے ماسوا زائد ہیں (1) آیت محکمہ (2) سنت قائمہ (3) یا فریضہ عادلہ۔

(سنن ابی داؤد، رقم ۲۸۸۵، سنن ابن ماجہ، رقم: ۵۴، جامع الاصول، رقم: ۵۸۴۳، شرح السنۃ بغوی: ۱/ ۲۷، سنن کبری بیہقی ۶/ ۲۰۸، مستدرک حاکم: ۴/ ۳۳۲، سنن دارقطنی: ۴/ ۶۸، التمہید لابن عبدالبر: ۴/ ۲۶۶، تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۱۹۵)

آیت محکمہ سے مراد قرآن حکیم کی ان آیات کا علم ہے جن میں کوئی اشتباہ یا اختلاف نہ ہو، اور وہ منسوخ نہ ہوں، اور سنت قائمہ سے مراد یہ ہے وہ احادیث صحیحہ جن کا تعلق رسول اللہ ﷺ سے ہو، اور فریضہ عادلہ سے مراد ہے جس کو احکام شرعیہ کا علم ہو۔ خلاصہ یہ کہ عالم وہ شخص ہے جس کو قرآن مجید، احادیث اور فقہ کا علم ہو اور جب اسے دین کی کسی چیز کی بابت سوال کیا جائے تو وہ قرآن حکیم، احادیث نبویہ اور فقہ اسلامی کی روشنی میں اس کو بتا سکے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک فقیہ شیطان پر ایک ہزار عابدوں کی بہ نسبت زیادہ بھاری ہوتا ہے۔

(سنن الترمذی، رقم: ۲۶۸۱، سنن ابن ماجہ: ۲۲۲، معجم الکبیر طبرانی، رقم: ۱۱۰۹۹، کامل لابن عدی: ۳/ ۴۰۰، جامع بیان العلم لابن عبدالبر ۱/ ۲۶، بیہقی فی شعب الایمان: ۲/ ۲۶۶، تہذیب الکمال: ۹/ ۲۳۷، اخرجہ ایضا ابن حبان فی المجروحین: ۱/ ۲۹۸)

سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عالم کی فضیلت عابد پر اس طرح ہے جس طرح چاند کی فضیلت ستاروں پر ہے۔

(سنن الترمذی، رقم: ۲۶۸۲، مسند احمد: ۵/ ۱۹۶، سنن الدارمی، رقم: ۳۴۹، سنن ابن ماجہ، رقم: ۲۲۳، سنن ابوداؤد: ۳۶۴۱، ابن حبان، رقم: ۸۸، شرح السنۃ: ۱/ ۲۷۵، ابن عساکر: ۷/ ۱۲۵، مشکل الآثار: ۱/ ۴۲۹)

سیدنا ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے دو شخصوں کا ذکر کیا گیا، ان میں سے ایک عابد تھا دوسرا عالم تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

''عالم کی فضیلت عابد پر اس طرح ہے جس طرح میری فضیلت تم میں سے کسی ادنیٰ شخص پر ہے۔'' پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ اور اس کے فرشتے اور تمام آسمانوں اور زمینوں والے حتیٰ کہ چیونٹیاں بھی اپنے بلوں میں اور حتیٰ کہ مچھلیاں بھی پانی میں نیکی کی تعلیم دینے والے پر صلاۃ بھیجتے ہیں (اللہ تعالیٰ رحمت نازل فرماتا ہے اور باقی چیزیں رحمت کی دعا کرتی ہیں۔) (سنن الترمذی، رقم: ۲۶۸۵، معجم کبیر طبرانی، رقم: ۷۹۱۱)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے لیے علم کو طلب کرنے والا، اللہ کے نزدیک مجاہد فی سبیل اللہ سے افضل ہے۔''

(جمع الجوامع، رقم: ۱۳۸۸۵)

سیدنا ہلال بن خباب رضی اللہ عنہ نے ایک روز سیدنا سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''اے ابو عبداللہ! لوگوں کے ہلاک ہونے کی کیا علامت ہے؟'' فرمایا: ''جب ان کے علماء ہلاک ہو جائیں۔'' (سنن الدارمی ۱/۷۷)

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿یوزن یوم القیامة مداد العلماء و دم الشهداء﴾

(جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبدالبر: ۱/۳۱)

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عالم اور متعلم (طالب علم) نیکی میں باہم شریک ہیں جب کہ تمام آدمیوں میں کوئی خیر نہیں۔'' (رواہ الطبرانی، الفتح الکبیر: ۲/۲۳۷)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿العلماء مصابیح الارض، وخلفاء الانبیاء﴾

(رواہ ابن عدی فی الکامل، الفتح الکبیر ۲/۲۵۱)

''علماء زمین کے چراغ ہیں اور انبیاء کرام کے خلفاء ہیں۔''

اور ایک روایت میں سرور دو عالم ﷺ نے فرمایا:

﴿الدنیا ملعونة وملعون ما فیها، الا ذکر الله وما والاہ وعالماً ومتعلماً﴾

(رواہ ابن عبدالبر، مسند وعن ابی الدرداء ۱/۲۷، والترمذی، رقم: ۲۳۲۳)

"یہ دنیا معلون ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ بھی ملعون ہے سوائے ذکر اللہ اور اس کے متعلقات کے، اور عالم اور متعلم کے۔"

علم کے مختلف درجات ہیں۔ بعض علوم کا جاننا فرض عین ہے جیسے علم دین۔ فرائض دین کی ادائیگی کے لیے جو علم درکار ہے اس کا جاننا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اسی طرح اپنی روزی کمانے کے لیے کچھ نہ کچھ جاننا ضروری ہے تاکہ آدمی مانگنے اور سوال کی ذلت سے بچا رہے۔ چنانچہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ایک شخص رسی لے کر جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لائے اور اسے ایندھن کے لیے فروخت کرے یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے مانگتا پھرے، اور وہ اسے کچھ دیں اور یا نہ دیں۔"

اور ایک شخص کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جو کچھ جانتا ہے وہ اپنے بھائی کو بتائے اور اس سے کچھ نہ چھپائے، کیونکہ جس طرح علم حاصل کرنا ضروری ہے اسی طرح اس کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿خیر کم من تعلم القرآن وعلمہ﴾

"تم میں سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح قرآن یا علم کا سیکھنا ضروری ہے اسی طرح اس کا سکھانا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں آتا ہے:

﴿وتعاونوا علی البر والتقوی، ولاتعاونوا علی الاثم والعدوان﴾ (مائدہ:۲)

"اور تم نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بر (نیکی) اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرنے کا حکم دیا ہے۔ بر سے مراد ہر وہ نیک کام جس کا شریعت نے حکم دیا ہے، اور تقویٰ سے مراد ہر اس کام سے اجتناب جس کو کرنے سے شریعت نے روکا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ گناہ سے مراد ہر وہ کام جس سے شریعت نے منع کیا ہے، اور ہر وہ کام جس پر لوگوں کے مطلع ہونے کو انسان ناپسند کرتا ہے۔ اور ظلم کا معنی ہے

دوسروں کے حقوق میں تعدی اور تصرف کرنا، اور اثم وعدوان سے مراد وہ تمام جرائم ہیں جن کی وجہ سے انسان اخروی سزا کا مستحق ہوتا ہے اور حق تعالیٰ شانہ کے حدود سے تجاوز کرتا ہے۔

نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرنا، اس میں ملک وقوم کے اجتماعی مفاد میں ایک دوسرے کی مدد اور اس سے تعاون کرنا، اور سماجی خدمات اور سوشل ورک سب داخل ہیں۔ اسی طرح علم سیکھ کر دوسروں کو سکھانا یہ بھی اس میں داخل ہے کیونکہ یہ بھی ملک وقوم کے وسیع تر مفاد میں ہے۔

مفت تعلیم دینا:

اسلام نے تعلیم مفت دینے کو ترجیح دی ہے، چنانچہ اسلام نے تعلیم کو مسجد سے شروع کیا اور جمعہ کے خطبات اور عیدین میں لوگوں کو تعلیم کے لیے کہا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے بھی کہلوایا کہ میں اپنی دعوت دینے میں تم سے کسی اجر کا خواہاں نہیں ہوں میرا اجر اللہ رب العالمین پر ہے۔ (الشعراء:۱۰۹)

اس آیت سے علماء نے استنباط کیا ہے کہ تبلیغ اور تعلیم دین پر لوگوں سے معاوضہ لینا اور نذرانے وصول کرنا جائز نہیں۔ چنانچہ علامہ اسماعیل حقی فرماتے ہیں:

''جو شخص اللہ کے لیے عمل کرتا ہے وہ اس کا اجر غیر اللہ سے طلب نہ کرے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ علماء جو انبیاء کے وارث ہیں وہ انبیاء علیہم السلام کے آداب کے ساتھ متصف ہوں، اور وہ علوم کی اشاعت اور تبلیغ میں لوگوں سے کچھ طلب نہ کریں اور اپنی تعلیم، تدریس، وعظ اور خطابات سے کوئی نفع حاصل نہ کریں کیونکہ جو علماء اپنے مواعظ اور خطابات کا سننے والوں سے کوئی نذرانہ لیتے ہیں تو ان کے مواعظ سننے والوں کو کوئی برکت حاصل نہیں ہوتی، اور نہ علماء کو وعظ سنا کر نذرانے لینے اور معمولی دنیوی معاوضہ کے بدلہ میں دین فروخت کرنے سے کوئی برکت حاصل ہوگی۔'' (تفسیر روح البیان ۶/۳۰۳)

اسی وجہ سے علماء نے لکھا ہے اور شریعت کا منشاء بھی یہی ہے کہ تعلیم مفت دی

جائے، اس پر کوئی معاوضہ نہ لیا جائے بلکہ رضائے الٰہی کے حصول کے لیے سکھایا جائے۔ چنانچہ سیدنا معاذ بن جبل ؓ فرماتے ہیں: ”علم سیکھو کیونکہ علم کا سیکھنا خشیت الٰہی کا باعث ہے، اور اس کی طلب عبادت ہے اور اس کو پڑھنا تسبیح، اور اس کے بارے میں بحث و تمحیص کرنا جہاد ہے، اور جو علم نہیں جانتا اس کو تعلیم دینا صدقہ ہے، اور علم وحشت میں ساتھی اور مونس، اور مسافرت میں بہتر ہم سفر، خلوت میں بہترین وزیر اور غمگسار ہے۔

(رواہ ابن عبد البر مرفوعاً، الترغیب والترہیب: ۹۴/۱)

سیدنا ابو الدرداء ؓ کا ایک قول کتابوں میں نقل ہے کہ ”میرے لیے ایک مسئلہ کا سیکھنا پوری رات کے قیام سے بہتر ہے۔“

اسلام نے علماء کی معیشت و کفالت کی ذمہ داری مسلمانوں کے بیت المال (یعنی حکومتی خزانہ) پر ڈالی ہے تاکہ وہ علوم نافعہ کی تعلیم کے لیے فارغ البال ہو جائیں اور معیشت اور گذران کی انہیں کوئی ذہنی پریشانی نہ ہو۔

علمی انہماک:

رسول اللہ ﷺ نے امت کو تاکید فرمائی کہ میدان علم میں وہ انہماک اور تنافس پیدا کریں۔ چنانچہ سیدنا ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ تین باتوں میں کوئی ہم پر غالب نہ آجائے، یہ کہ ہم نیکی کا حکم دیں، برائی سے روکیں اور لوگوں کو سنتوں کی تعلیم دیں ﷺ۔ (رواہ احمد فی المسند عن ابی ذر: ۱۶۵/۵)

علم کو چھپانے کی ممانعت:

اسلام میں علم کو چھپانے اور اس کی عدم اشاعت کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿من کتم علماً الجم اللہ بلجام من نار یوم القیامۃ﴾

”جو علم کو چھپائے (اور اس کی نشر و اشاعت نہ کرے) اس کو قیامت کے روز جہنم کی لگام پہنچائی جائے گی۔“

علم ہر ایک کے لیے ایک لازمہ زندگی ہے، اس لیے شریعت نے اس بات کی

سخت ممانعت کی ہے کہ اس کو چھپایا یا اس میں غلط بیانی سے کام لیا جائے۔

حریت تعلیم:

اسلام نے ہر مسلمان کو علم کے سیکھنے میں مکمل آزادی دی ہے اور ہر وہ علم سیکھ سکتا ہے جس سے اس کو فائدہ اور نفع ہو اور اسے کوئی نقصان نہ ہو، لیکن اسلام نے اس کو آزادی مصالحت عامہ کے ساتھ مقید کیا ہے، اس لیے اسلام نے جادو اور کہانت کے علوم کا سیکھنا حرام قرار دیا ہے، کیونکہ ان علوم کو سیکھنے کے بعد آدمی اپنے خالق و مالک کا انکار کرنے لگ جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے علم اور علماء دونوں کی اپنے دوسرے بندوں پر فضیلت کو بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لائے اور وہاں مسجد میں دو مجلسیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ آپ ﷺ نے ان دونوں کو دیکھ کر فرمایا: دونوں بہتر ہیں۔ لیکن ایک دوسری سے بہتر ہے۔ یہ مجلس تو اللہ سے دعا والتجاء میں مشغول ہے اور اس کی طرف رغبت دلا رہی ہے۔ اب اس کی مرضی ہے کہ انہیں ان کی دعا کے موافق عطا فرمائے یا نہ فرمائے۔ لیکن یہ دوسری مجلس لوگوں کو فقہ وعلم کی تعلیم دے رہی ہے اور جاہلوں کو زیور علم سے آراستہ کر رہی ہے، پس یہ افضل ہے۔ اور میں بھی دنیا میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں، پھر آپ اس مجلس میں تشریف فرما ہو گئے۔

(رواہ الدارمی: ۱/۱۰۵، وابن ماجہ: ۱/۸۳)

حق محنت

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو یہ حق دیا ہے کہ وہ کوئی اپنا مناسب حال کام کرے جس کے کرنے پر اس کو قدرت ہو اور وہ کام اس کی زندگی کے قیام کا بھی باعث ہو۔ اس لیے انسان کو مختلف کاموں، تجارت، زراعت اور صناعت میں سے کوئی کام اپنے مناسب حال منتخب کر لے جس سے وہ اپنے لیے رزق حلال تلاش کر سکے، پھر اللہ کا نام لے کر اس کام کو شروع کر دے۔ اللہ اس میں برکت اور اس کی مدد فرمائے گا۔ اور اس طریقہ سے وہ اپنے ہاتھ کو اوپر والا ہاتھ بنائے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خرچ کرتا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿واعملوا صالحا، انی بما تعملون علیم﴾ (المومنون ۵۱)

''اور نیک عمل کرتے رہو، بے شک تم جو بھی کام کرتے ہو میں اس کو خوب جاننے والا ہوں۔''

اس آیت میں پاک چیزوں کو کھانے کا حکم دیا گیا ہے اور پاک چیزوں سے مراد حلال چیزیں ہیں، اور سب سے زیادہ حلال چیز وہ ہے جس کو انسان نے اپنے کسب اور محنت سے حاصل کیا ہو۔ حدیث میں ہے کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی بھیجا اس نے بکریاں چرائی ہیں۔ آپ ﷺ کے اصحاب نے پوچھا:

''اور آپ نے بھی؟'' فرمایا: ''ہاں، میں بھی چند قیراط کے عوض مکہ والوں کی

بکریاں چراتا تھا۔" (بخاری، رقم: ۲۲۶۲، شرح السنۃ: ۲۶۵/۸، سنن کبری بیہقی: ۱۱۸/۶)

قیراط سے مراد درہم و دینار کا ایک جز ہے۔ آپ ہر بکری کو چرانے کا ایک قیراط لیتے تھے۔ (فتح الباری: ۹۹/۵)

اسی طرح سیدنا مقدام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"کسی شخص نے بھی اپنی ہاتھ کی کمائی سے بہتر کھانا نہیں کھایا، اور اللہ کے نبی داؤد اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔"

(بخاری، رقم: ۲۰۷۲، سنن ابن ماجہ، رقم: ۲۱۳۸، مسند احمد، رقم: ۱۷۳۰۲)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے کوئی شخص لکڑیاں کاٹ کر اس کا گٹھا اپنی پشت پر لاد کر لائے وہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے سوال کرے وہ اس کو دیں یا منع کر دیں۔"

(بخاری، رقم: ۲۰۷۴، مسلم، رقم: ۱۰۴۲، سنن نسائی، رقم: ۲۵۸۴، مسند احمد، رقم: ۷۳۱۵)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اے لوگو! بے شک اللہ طیب ہے اور وہ سوائے طیب اور طاہر شے کے اور کسی چیز کو قبول نہیں کرتا۔ (طاہر کا مطلب ہے کہ وہ چیز فی نفسہ حلال ہو اور طیب کا مطلب ہے کہ وہ شے حلال ذرائع سے حاصل کی گئی ہو۔ مثلاً چوری کا دودھ فی نفسہ حلال ہے لیکن حلال ذریعہ سے حاصل نہیں کیا گیا اس وجہ سے وہ طاہر ہے طیب نہیں۔ اور اگر کوئی شخص دودھ خرید کر لائے اور اس میں کوئی ناپاک چیز گر جائے تو وہ دودھ طیب تو ہے لیکن طاہر نہیں۔)

اسلام ایک مسلمان کو بیکار نہیں دیکھنا چاہتا، چنانچہ عید کے روز اور جمعہ کے روز بھی اسلام نے مسلمانوں کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ نماز کے بعد جا کر اپنے کاروبار میں مشغول ہو جائیں، جیسا کہ سورۃ الجمعہ میں فرمایا: (الجمعہ: ۹-۱۱)

اور حج کے دوران بھی روزی کمانے کا جواز قرآن میں بیان کیا گیا۔ فرمایا:

(حج کے دوران) اپنے رب کا فضل (روزی) تلاش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ (بقرہ: ۱۹۸)

اس سلسلہ میں امام بخاریؒ نے روایت نقل کی ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز زمانہ جاہلیت کے بازار تھے۔ جب اسلام آیا تو مسلمانوں نے ان بازاروں میں تجارت کرنے کو گناہ سمجھا، تو یہ آیت نازل ہوئی کہ زمانہ حج میں اپنے رب کا فضل تلاش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

(بخاری: ۱/۲۷۵، سنن ابوداؤد: ۱/۲۴۲)

اس آیت سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ ایام حج میں تجارت کرنا، محنت مزدوری اور جائز طریقہ سے کسب معاش کرنا جائز ہے اور اس سے حج کے اجر وثواب میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

اگر حج کے دوران ضمناً تجارت یا محنت مزدوری ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، لیکن اگر کوئی شخص بالقصد ایام حج میں تجارت کے لیے یا مزدوری کے لیے جائے اور ضمناً حج کر لے تو یہ اخلاص کے منافی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ محنت مزدوری ہی سے یہ دنیا آباد ہے اور اسی سے لوگوں کی ضروریات زندگی اور روزانہ کی حاجات پوری ہوتی ہے۔ چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ بعثت سے قبل بکریاں چرانے کا کام کرتے تھے اور بعد ازیں آپ نے سیدہ خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کے غلام میسرہ کی رفاقت میں مضاربت پر سیدہ رضی اللہ عنہا کی تجارت کی۔ اور خود رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿ما من نبی الا رعی الغنم﴾

(بخاری ۲/۷۸۹، مسلم: ۱۴/۱۶، مسند احمد: ۳/۱۷)

''دنیا میں کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔''

سیدنا داؤد علیہ السلام لوہار کا کام کرتے تھے، اور سیدنا نوح علیہ السلام نجاری کا کام کرتے تھے اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام طبیب تھے۔

انبیاء علیہم السلام کے علاوہ اس امت کے اکابر کا بھی کوئی نہ کوئی ذریعہ معاش ضرور تھا، چنانچہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی خلیفہ بننے سے قبل پیشہ تجارت اختیار کیے ہوئے تھے، سیدنا خباب بن الارت رضی اللہ عنہ لوہار تھے اور سیدنا زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ خیاط

(درزی) اور سیدنا سلمان فارسی حلاق (حجام) تھے۔ اسلام کسی شخص کے عمل کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا اور نہ کام کے چھوٹے بڑے ہونے کی وجہ سے انسان کی شخصیت کا وزن کرتا ہے کہ اس شخص کا کام چونکہ چھوٹا ہے اس وجہ سے یہ آدمی قدر ومنزلت کے لحاظ سے چھوٹا ہے بلکہ وہ انسان کی صفات اور خصوصیات کی وجہ سے اس کے مقام اور اس کی شخصیت کا اندازہ لگاتا ہے۔ (حقوق الانسان فی القرآن والسنۃ بلقلہ کتور محمد الصالح ص ۱۱۲۔۱۱۴)

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿ان الله يحب العبد المؤمن المحترف﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ محنت کرنے والے مؤمن بندے کو محبت کرتے ہیں۔'' (رواہ الترمذی والطبرانی والبیہقی عن ابن عمر، الفتح الکبیر: ۱/۳۵۴)

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿على كل مسلم صدقة﴾

''ہر مسلمان کے لیے صدقہ ضروری ہے۔''

صحابہ کرام ؓ نے عرض کی: ''اگر اس کے پاس صدقہ کے لیے کچھ نہ ہو؟'' فرمایا: ''وہ اپنے ہاتھوں سے کوئی کام کرے جس سے اس کو اپنی ذات کے لیے بھی نفع ہو اور اس محنت کی کمائی سے صدقہ بھی کرے۔'' صحابہ ؓ نے پوچھا: ''اگر وہ یہ بھی نہ کر سکے تو؟'' آپ نے فرمایا: ''پھر وہ حاجت مند بے قرار لوگوں کی مدد کرے۔'' عرض کیا: ''اگر وہ یہ بھی نہ کر سکے؟'' فرمایا: ''پھر وہ لوگوں کو نیکی کا حکم دے۔'' عرض کیا: ''اگر وہ یہ بھی نہ کر سکے؟'' فرمایا: ''پھر وہ برائی کرنے سے رک جائے، یہ بھی اس کے لیے صدقہ ہے۔'' (فتح الباری: ۱۰/۲۰۲۲)

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: ''یا رسول اللہ! کون سا عمل سب سے افضل ہے؟'' فرمایا: ''اللہ پر ایمان اور اس کے راستہ میں جہاد کرنا۔'' پھر پوچھا: ''کون سی گردن چھڑانی افضل ہے؟'' فرمایا: ''جو ان کے اہل کے لیے نفع بخش ہو۔'' صحابی کہتے ہیں میں نے عرض کیا: ''پھر کون سی چیز؟'' فرمایا:

﴿تعين صانعاً او تصنع لاخرق﴾

''تو کسی کاریگر کی مدد کرے یا ایسے شخص کے لیے کچھ بنا دے جو کوئی

کام ہنر نہ جانتا ہو۔ یعنی بے ہنرا ہو۔"

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے کمائی ہوئی روزی سے جو کھانا کھایا جائے وہ سب سے بہتر کھانا ہے۔

﴿وان نبی اللہ داؤد کان یأکل من عمل یدہ﴾

(بخاری ۳/۸۱ برقم: ۲۰۷۰)

"اور بے شک اللہ کے نبی داؤد اپنے ہاتھ سے کما کر کھایا کرتے تھے۔"

سیدنا مسلم بن یسار بعض اشعریین کے ساتھ سفر میں گئے۔ جب واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ان سب نے حاضر ہو کر عرض کی: "یا رسول اللہ! اللہ کے رسول کے بعد فلاں آدمی سے زیادہ اور کوئی افضل نہیں۔ وہ صبح کو روزہ رکھتا ہے اور جب ہم وہاں گئے تو وہ نماز میں مشغول تھا یہاں تک کہ ہم واپس آ گئے۔" آپ نے فرمایا: "اس کے لیے محنت کون کرتا تھا یا خدمت کون کرتا تھا؟" انہوں نے عرض کیا: "ہم" فرمایا: "پھر تم سب اس سے افضل ہو۔"

رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو روزی کمانے کے لیے خصوصی طور پر زراعت کی ترغیب دی۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کوئی مسلمان کوئی پودا اگاتا ہے یا کوئی کھیتی اگاتا ہے اور اس میں سے پرندے، انسان اور چوپائے جو کچھ بھی کھاتے ہیں، وہ اس کے لیے صدقہ ہو جاتا ہے۔" (بخاری: ۲/۱۷۱، مسلم: ۱۰/۲۱۳، والترمذی عن انس، والفتح الکبیر: ۳/۱۱۹)

اور رسول اللہ ﷺ نے سوال کر کے مال کمانے سے سختی سے روکا۔ ایک حدیث میں فرمایا۔ "جو شخص اپنے آپ پر مانگنے کا دروازہ کھولتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر غریبی اور فقر کے ستر دروازے کھول دیتا ہے۔" (ترمذی مع تحفہ: ۲/۶۱۲، مسند احمد: ۳/۲۳۱)

اور بخاری اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

﴿لاتزال المسألة بالعبد حتی یلقی اللہ ولیس فی وجہ مزعۃ لحم﴾ (بخاری: ۲/۵۳۶، مسلم: ۷/۱۳۰)

آدمی برابر مانگتا رہتا ہے (سوال سے باز نہیں آتا) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے جب ملے گا تو اس کے منہ پر گوشت کا ایک ذرا سا

لوٹھڑ: بھی نہ ہو گا (سب ہڈیاں ہو جائیں گی، یہ دنیا میں بھیک مانگتے رہنے کی سزا ہو گی۔)

محنت اور کام کرنا ہی اسلام میں انسان کی قدر و منزلت میں اضافہ کرتا ہے۔ چنانچہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ بار خلافت اٹھانے سے قبل کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ جب خلیفہ ہوئے تو دوسرے روز صبح کے وقت کپڑے کے تھان لے بازار میں تجارت کے لیے جانے لگے۔ راستہ میں آپ کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ مل گئے۔ ان دونوں نے آپ سے کہا کہ آپ کو مسلمانوں کے امور کا والی بنایا گیا ہے اور آپ بازار تجارت کے لیے جا رہے ہیں، ایسے یہ معاملہ کیسے چلے گا؟ آپ نے فرمایا: ''پھر میں اپنے اہل و عیال کو کہاں سے کھلاؤں گا۔'' (فمن این اطعم عیالی؟) انہوں نے کہا کہ ہم بیت المال سے آپ کے اہل و عیال کے کھانے کا انتظام کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے ان کے اور ان کے اہل و عیال کے لیے ضروریات زندگی کا انتظام کر دیا اور آپ امور مملکت کے لیے یکسر فارغ ہو گئے۔ (تاریخ الخلفاء: ص ۷۳)

اسی طرح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو مسجد میں نماز کے لیے دیکھا جو نماز پڑھ کر فارغ بیٹھا تھا اور اپنی روزی کمانے کے لیے کوئی کام کاج نہیں کرتا تھا۔ یعنی پانچوں وقت نماز پڑھتا اور اپنی روزی کمانے کے بجائے مسجد میں پڑا رہتا۔ آپ نے اس کو مسجد سے نکل کر اور روزی کمانے کے لیے کہا اور اس سے فرمایا:

﴿أما علمت أن السماء لا تمطر ذهباً و لا فضة﴾

''کیا تو نہیں جانتا کہ آسمان سونے اور چاندی کی بارش نہیں برساتا۔''

(النظام الاقتصادی، محمد مبارک ص ۱۲۶، فی الحث علی العمل والنہی عن البطالۃ)

امام غزالی نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا ایک قول نقل فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا:

﴿لا یقعد احدکم عن طلب الرزق﴾ (احیاء العلوم: ۲/ ۵۷)

''تم میں سے کوئی شخص بھی طلب رزق کی جدوجہد میں پست ہمت ہو کر نہ بیٹھ جائے۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کی تشریح میں سید مرتضیٰ زبیدی فرماتے ہیں:

''ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ معیشت کے جائز اسباب میں سے کسی سبب اور وسیلہ کو ضرور اختیار کرے جس سے وہ رزق کو حاصل کر سکے۔''

(اتحاف السادۃ: ۵/ ۴۱۷)

محنت کا تعلق صرف جسمانی محنت مزدوری سے ہی نہیں ہے بلکہ تجارت، زراعت، صناعت اور خدمت گاری اور حرفت کے میدان میں ہر جدوجہد خواہ وہ ہاتھوں سے ہو یا ذہن وفکر سے یا تحریر وادب سے، فقہاء کے نزدیک وہ سب محنت میں شامل ہے۔ فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ خلافت وولایت کی بہتری اور مفاد کے لیے جو کام بھی کیا جائے وہ ''محنت'' میں شامل ہے، اور ہر وہ کام جس میں مسلمانوں کی منفعت ہو وہ بھی اس زمرہ میں شامل ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صراحت کرتے ہوئے فرمایا: "انی لا عمل للمسلمین" میں مسلمانوں کے لیے محنت کرتا ہوں۔''

محنت مزدوری آدمی کے گناہوں کا کفارہ ہے:

محنت مزدوری سے نہ صرف آدمی اپنی دنیا بناتا ہے اور اپنی دنیوی زندگی کے لیے روزی کماتا ہے بلکہ محنت مزدوری کرنے سے اس کے گناہوں کا کفارہ بھی ہو جاتا ہے، اور یہ گناہوں کے کفارے کے اسباب میں سے ایک بہت بڑا سبب ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ''جو شخص رات تک محنت مزدوری کرتا ہے رات کو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دیتا ہے۔'' (الترغیب والترہیب: ۲/ ۴)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کئی گناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ نماز و روزہ بھی نہیں اور نہ حج وعمرہ ان کا کفارہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا ''یا رسول اللہ! پھر ان گناہوں کا کفارہ کیا ہے؟'' آپ نے جواب میں فرمایا:

﴿الهموم علىٰ كسب المعيشة﴾

''روزی کمانے کے غم (کسب معیشت میں جو جو پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں وہ ان کا کفارہ ہیں۔)''

اور ایک اور روایت میں یہ فرمایا گیا:

﴿ان من الذنوب ذنوباً لایطهرها الا السعی علی العیال﴾

''بعض گناہ ایسے ہیں جن کو اہل و عیال کی روزی کمانے کی جد وجہد ہی پاک کر سکتی یعنی ان کا کفارہ اہل و عیال کی روزی کمانے کی کوشش اور محنت ہے۔''

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿ان الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاهد فی سبیل الله، او القائم باللیل، الصائم بالنهار﴾

''بیوہ عورت اور مسکین کی امداد کے لیے سعی و کوشش کرنے والا مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح ہے یا رات کو قیام کرنے والا اور دن کو روزہ رکھنے والے کی طرح ہے۔''

(رواہ البخاری: ۵/ ۲۰۴۷، مسلم: ۱۸/ ۱۱۲ والترمذی والنسائی، الفتح الکبیر: ۱/ ۲۹۹)

اسلام مانگنے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا:

اسلام سوال کرنے اور مانگنے کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور انسان کو اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے کما کر کھائے۔ چنانچہ سیدنا انس بن مالک ﷺ بیان کرتے ہیں کہ انصار میں سے ایک شخص سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے سوال کیا۔ آپ نے فرمایا: ''تیرے گھر میں کوئی چیز ہے؟'' اس نے کہا، کیوں نہیں، ایک کملی (چادر) ہے جس کا کچھ حصہ ہم اوڑھ لیتے ہیں اور کچھ بچھا لیتے ہیں، اور ایک پیالہ ہے جس میں ہم پانی پیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ دونوں میرے پاس لے آؤ'' وہ دونوں لے آیا۔ آپ نے ان دونوں چیزوں کو اپنے دست مبارک میں پکڑا اور فرمایا: ''ان دونوں کو کون خریدے گا۔'' ایک شخص نے کہا کہ میں اس کو ایک درہم میں خریدتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: ''کوئی اس سے زیادہ دیتا ہے؟'' ایک اور شخص نے کہا کہ میں دو درہم دیتا ہوں۔ آپ نے دو درہم میں اس کو وہ دونوں چیزیں دے دیں، اور وہ دو درہم اس انصاری کو دے دیئے، اور فرمایا کہ ایک درہم کی کھانے کی چیزیں اپنے اہل و عیال کو دے آ اور دوسرے درہم کی کلہاڑی خرید کر لا۔ وہ کلہاڑی خرید کر آپ کی خدمت میں لایا۔ آپ ﷺ نے اس میں اپنے دست مبارک سے لکڑی کا

دستہ ڈالا اور فرمایا: جا جنگل سے جا کر لکڑیاں کاٹ کر اس کو بازار میں فروخت کر اور اب پندرہ روز تمہیں یہاں نہ دیکھوں۔ پندرہ روز کے بعد وہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس کے پاس کئی درہم تھے۔ بعض سے اس نے کپڑا خریدا ہوا تھا اور بعض سے گھر کے لیے کھانا۔ پھر آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: "یہ تیرے لیے مانگنے سے بہت بہتر ہے کیونکہ مانگنے کی وجہ سے قیامت کے روز تیرے منہ پر سیاہ دھبے ہوں گے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿ان المسئلة لا تصلح الا لذی فقر مدقع، أو لذی غرم مفظع، أو لذی دم موجع﴾

"مانگنا جائز نہیں ہے مگر اس کے لیے جس کو خاک میں ملا دینے والی محتاجی ہو، یا تکلیف دینے والی قرض داری ہو یا پھر اس شخص کے لیے جو دوسرے کی جان بچانے کے لیے دیت کا ضامن ہوا ہو (یعنی اگر دیت ادا نہ ہو تو جس کا ضامن ہوا ہے وہ قتل کیا جائے گا اور اس کا قتل ہونا اس کو دردمند کر دے گا)"

لیکن بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ آدمی روزی کمانے کے لیے اپنی پوری جدوجہد کرتا ہے لیکن اس کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں، تب اس صورت میں حکومت کے لیے واجب اور ضروری ہے کہ اس کی مالی امداد و اعانت کرے تاکہ وہ اپنی اور اپنے بال بچوں کی گزران کر سکے۔

اسی وجہ سے اسلام نے اہل مال کو اہل حاجت کو قرض حسنہ دینے کی ترغیب دی تاکہ وہ قرض کی رقم سے اپنی معیشت کے اسباب فراہم کر سکیں اور سوال کرنے اور مانگنے سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔ اور اسلام نے قرض حسنہ کے ثواب کو صدقہ کے ثواب سے اٹھارہ گنا افضل قرار دیا ہے۔ اور اسی وجہ سے اسلام نے زکوٰۃ کے مصرف میں فقراء اور مساکین کا پہلے ذکر کیا ہے۔

اجرت کا تعین:

اسلام نے اس بات کو بھی نہایت ضروری قرار دیا ہے کہ محنت کرنے والے سے

جو وعدہ کیا جائے اس کو پورا کیا جائے۔ کیونکہ قرآن کا حکم ہے:

﴿یاایها الذین آمنوا اوفوا بالعقود﴾

''اے ایمان والو! اپنے عہد پورے کرو۔''

عقود عقد کی جمع ہے، عقد کا معنی ہے کسی چیز کو پختگی اور مضبوطی کے ساتھ دوسری چیز کے ساتھ واصل کرنا، یا ایک چیز کی دوسری چیز کے ساتھ گرہ باندھنا، عہد کا باندھنا۔ یعنی جو وعدے اور عہد تم لوگوں نے دوسروں کے ساتھ کیے ہیں، ان کو پورا کرو۔

پھر یہ بھی ضروری قرار دیا کہ اجیر کو اس کی اجرت معلوم ہو، اس کو ابہام میں نہ رکھا جائے۔ چنانچہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا

﴿من استاجر اجیراً فلیسم له اجرته﴾ (رواہ البیہقی ۶: ۱۲۰)

''جو کسی اجیر کو اجرت پر رکھے اسے چاہیے کہ وہ اس کی اجرت اس کو بتادے (تاکہ کوئی ابہام نہ رہے)''

ایک اور روایت میں ہے:

﴿من استاجر اجیراً فلیعلم اجره﴾ (ایضاً)

''جو کسی شخص کو مزدوری کے لیے رکھے اس کو اس کی اجرت بتادے۔''

نہ صرف اجرت بتائے بلکہ مدت اجرت بھی بتادے کہ روزانہ کتنے گھنٹے کام کرنا ہے اور کتنی مدت تک کام کرنا ہے جیسا کہ سیدنا شعیب علیہ السلام نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو بتا دیا تھا۔ (سورۃ القصص ۲۶-۲۷)

شریعت نے اس بات کی بھی تاکید کی کہ مزدور جب اپنا کام ختم کرے اس کو فوری طور پر اس کی مزدوری ادا کردینی چاہیے۔ اس بارے میں ارشاد نبوی ہے:

﴿اعطوا الاجیر اجره، قبل ان یجف عرقه﴾ (رواہ البیہقی ۶: ۱۲۱)

''مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری ادا کردو۔''

اور ایک حدیث قدسی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں: تین لوگ ہیں جن کے بارے میں قیامت کے روز میں جھگڑا کروں گا، اور جس سے میں جھگڑا کروں گا اس پر میں غالب آؤں گا۔ ان تین میں سے ایک وہ شخص ہے جس نے کسی مزدور کو مزدوری پر

لگایا، اس سے کام تو پورا لیا لیکن اس کی مزدوری اس کو نہ دی۔ (رواہ البخاری: ۲/۲۱۴)

پھر یہ ہے کہ مزدور کی مزدوری بھی عدل وانصاف کے تقاضا کے مطابق ہو، اس میں کمی نہ کی جائے۔ مثلاً ایک معمار کی اگر روزانہ مزدوری دوسو روپیہ ہے تو اس کو ڈیڑھ سو نہ دیا جائے۔ یہ زیادتی ہے یا اس کی بے روزگاری سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے۔

﴿ولا تبخسوا الناس اشیاءھم ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا﴾ (الاعراف: ۸۵)

"اور لوگوں کو کم تول کر ان کی چیزیں نہ دو، اور زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد نہ کرو۔"

شریعت نے یہ بھی کہا کہ مزدور یا کام کرنے والے کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دو، کیونکہ اسلام دین رحمت ہے اور اس کا پیغمبر رحمۃ للعالمین ہے لہذا ایک مسلمان کو مزدور کی طاقت سے زیادہ اس سے کام نہیں لینا چاہیے۔ چنانچہ پیغمبر رحمت ﷺ نے فرمایا:

﴿لا تکلفوھم مالا یطیقون، فان کلفتموھم فاعینوھم﴾

(بخاری: ۱/۱۹)

"لوگوں کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دو، اور تم نے انہیں ایسی تکلیف دی تو پھر خود ان کی مدد کرو۔"

یعنی اول تو کسی محنت کار اور مزدور سے اس کی طاقت سے زیادہ اس سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اور اگر ایسی غلطی کر بیٹھو تو پھر اس کے کام کرنے میں ان کا ہاتھ بٹاؤ جس طرح بھی بٹا سکتے ہو تا کہ تمہاری غلطی کا ازالہ ہو سکے اور مزدور پر اس کی طاقت سے زیادہ جو بوجھ تم نے ڈالا ہے اس کا ازالہ ہو سکے۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿الراحمون یرحمھم الرحمن﴾

(رواہ الترمذی باب البر والصلۃ رقم ۱۹۲۴)

"جو لوگوں پر رحم کرتے ہیں رحمٰن ان پر رحم کرتا ہے۔"

حق علاج

اسلام نے ہر انسان کو یہ حق دیا ہے کہ بیمار ہونے کی صورت میں اپنا علاج کروائے، اور علاج نہ کروانا ''ام الامراض'' کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ جب ایک بیماری کا علاج نہ کیا گیا تو اس کے ساتھ دوسری بیماری کے لگنے کا اندیشہ ہے، نتیجہ یہ ہوگا کہ بیماریوں کا ایک ہجوم انسان کے جسم کے اندر جمع ہو جائے گا اور پھر شفا کے بجائے موت واقع ہونے کا خطرہ ہے۔ اس لیے شریعت نے علاج کو مشروع قرار دیا، اور جو شخص بیمار ہونے کی صورت میں علاج نہیں کراتا، وہ حکم الٰہی کی نافرمانی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ ویسے بھی جسم انسانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک امانت ہے اور جو شخص بیمار ہونے کی صورت میں علاج نہیں کرواتا وہ اللہ تعالیٰ کی امانت میں خیانت کا مرتکب ہو رہا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے قرآن حکیم میں فرمایا:

﴿یخرج من بطونها شراب مختلف الوانه، فيه شفا للناس﴾ (النحل ٦٩)

''ان کے پیٹوں سے رنگ برنگ کے مشروب نکلتے ہیں، اس مشروب (شہد) میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔''

اس آیت میں بیماریوں کا علاج کرنے اور دوا پینے کے جواز کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں شہد کو لوگوں کے لیے شفا فرمایا اور اس کا شفا ہونا تب ہی ثابت ہوگا جب کسی بیماری کے علاج میں اس کو استعمال کیا جائے۔ جو لوگ دوا استعمال کرنے کو تقویٰ اور توکل کے خلاف سمجھتے ہیں ان کو چاہیے کہ پھر دعا بھی نہ کیا کریں حالانکہ قرآن و

سنت میں دعا کرنے کی نہ صرف ترغیب ہے بلکہ تاکید ہے۔ اور علاج کروانے کے بارے میں بھی بہت سی احادیث کتابوں میں منقول ہیں۔

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہر بیماری کی دوا ہے، پس جب دوا صحیح ہو تو مریض اللہ جل شانہ کے حکم سے شفا پا جاتا ہے۔''

(مسلم، رقم: ۲۲۰۴، سنن کبریٰ نسائی، رقم: ۷۵۵۶)

سیدنا عمر بن قتادۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے خود پہنے ہوئے شخص کی عیادت کی، پھر فرمایا: میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک تم پچھنے نہ لگوالو، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اس میں شفا ہے۔

(مسلم، رقم: ۲۲۰۵، بخاری، رقم: ۵۶۸۳، سنن کبریٰ نسائی، رقم: ۵۶۸۳)

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے بازو کی ایک رگ میں تیر لگا تو نبی اکرم ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھ سے تیر کے پھل کے ساتھ اس کو داغا۔ ان کا ہاتھ متورم ہو گیا تو آپ نے اس کو دوبارہ داغا۔ (مسلم، رقم: ۲۲۰۸)

سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب ان کے پاس بخار میں مبتلا کوئی عورت لائی جاتی تو وہ پانی منگوا کر اس کے گریبان میں ڈالتیں اور بیان کرتیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''بخار کو پانی سے ٹھنڈا کرو'' اور فرمایا: ''یہ جہنم کے جوش سے ہے۔''

(بخاری، رقم: ۵۷۲۳، مسلم، رقم: ۲۲۱۱، سنن کبریٰ نسائی، رقم: ۷۶۰۹، سنن ترمذی، رقم: ۲۰۷۴، ابن ماجہ، رقم: ۳۴۷۴)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''کلونجی میں موت کے سوا ہر بیماری کی شفا ہے۔''

(مسلم، رقم: ۲۲۱۵، ابن ماجہ، رقم: ۳۴۴۷)

اس مضمون کی اور بہت سی احادیث کتابوں میں موجود ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے علاج کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اور علماء نے ان احادیث سے استنباط کیا ہے کہ علاج کرنا مستحب ہے۔ جمہور فقہاء اور محدثین کا یہی نظریہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے کلونجی کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس میں موت کے سوا

ہر بیماری کی شفا ہے۔ اس کا شفا بخش، دونا بلغمی مزاج کے لوگوں کے لیے ہے، کلونجی بند ریاح کو کھولتی ہے، پیٹ کے کیڑوں کو مارتی ہے، زکام میں نافع ہے، حیض کو جاری کرتی ہے، خارش میں مفید ہے، بلغمی اورام کو شفا دیتی ہے، پیشاب کو کنٹرول کرتی ہے، موٹاپا دور کرتی ہے اور خون میں شکر کو کم کرتی ہے۔

سیدنا اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور آپ کے اصحاب اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جس طرح ان کے سر پر پرندے ہوں۔ میں سلام کر کے بیٹھ گیا۔ پھر ادھر ادھر سے اعرابی آ گئے۔ انہوں نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! کیا ہم علاج کریں؟'' آپ نے فرمایا: ''دوا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری نہیں رکھی مگر اس کی دوا بھی رکھی سوا ایک بیماری کے، اور وہ بڑھاپا ہے۔''
(سنن ابوداؤد، رقم: ۳۸۵۵، سنن الترمذی، رقم: ۲۰۳۸، ابن ماجہ، رقم: ۳۴۳۶)

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے دوا اور علاج کرنے کا حکم دیا۔

سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے بیماری اور دوا دونوں کو نازل کیا ہے، اور ہر بیماری کی دوا بنائی ہے، سو تم دوا کیا کرو اور حرام کے ساتھ دوا نہ کرو۔'' (سنن ابوداؤد، رقم: ۳۸۷۴)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ناک میں دوا چڑھائی۔ (سنن ابوداؤد، رقم: ۳۸۶۷)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اثمد کا سرمہ لگایا کرو۔ کیونکہ وہ نظر کو تیز کرتا ہے اور (پلکوں کے) بال اگاتا ہے، اور ان کا گمان تھا کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس سرمہ دانی تھی اور آپ ہر آنکھ میں تین تین بار سرمہ لگاتے تھے۔'' (سنن ترمذی: ۲۰۴۸، سنن ابن ماجہ: ۳۴۹۷)

سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے غزوہ احد کے دن رسول اللہ ﷺ کے چہرہ کے زخم کے بارے میں سوال کیا گیا۔ اس روز آپ کے سامنے کا نچلا دانت بھی شہید ہو گیا تھا اور آپ کے خود کی کڑیاں آپ کے سر مبارک میں کھب گئی تھیں۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ ﷺ آپ کے چہرہ سے خون دھو رہی تھیں اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ ڈھال سے پانی

ڈال رہے تھے۔ جب سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا نے یہ دیکھا کہ پانی ڈالنے سے تو خون زیادہ بہہ رہا ہے تو انہوں نے ایک چٹائی کے ٹکڑے کو جلایا اور جب وہ راکھ ہو گیا تو اس راکھ کو زخم میں بھر دیا۔ پھر خون رک گیا۔

(مسلم، رقم: ۱۷۹۰، بخاری، رقم: ۵۲۴۸، ترمذی، رقم: ۲۰۸۵، سنن ابن ماجہ، رقم: ۳۴۶۴)

سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہ حکم دیا کہ ہم نمونیہ میں قسط (کٹھ) اور زیتون کے تیل سے علاج کریں۔

(سنن الترمذی، رقم: ۲۰۷۹، ابن ماجہ، رقم: ۳۴۶۸)

ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ایک لڑکی کے بارے میں جس کے چہرہ پر کسی چیز کا نشان پڑ گیا تھا اور وہ لڑکی سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو نظر لگ گئی ہے۔ اس پر دم کراؤ۔

(بخاری، رقم: ۵۷۳۹، مسلم، رقم: ۲۱۹۷)

مندرجہ بالا احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ علاج کرانا مشروع ہے۔ شفائے حقیقی تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، یہ دنیا چونکہ دارالاسباب ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اسباب اختیار کرنے کا حکم فرمایا۔

طبیب کے حق اجرت کی مشروعیت:

جس طرح علاج کرانا مشروع ہے اسی طرح شریعت نے طبیب اور ڈاکٹر کے لیے یہ بھی مشروع اور جائز رکھا کہ وہ مریض سے اپنی اجرت لے، لیکن اجرت جائز لے۔ آج کل تو اکثر مریض کے مرض سے فائدہ اٹھا کر اس کو لوٹا جاتا ہے۔ بڑے بڑے اطباء اور ڈاکٹر آج کل صرف پیسے بنانے کے لیے علاج کرتے ہیں۔ ان کو سوائے رقم اکٹھی کرنے کے مریض سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ اپریشن اور فصد علاج اور دوا میں شامل ہے۔ چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے بہتر علاج سونگھنے والی دوا، منہ میں ڈالنے والی دوا اور فصد ہے۔ (ترمذی)

اور نبی اکرم ﷺ نے فصد کروایا اور فصد کرنے والے کو اس کی اجرت دی۔

(بخاری: ۵۶۹۱)

علاج کی اجرت میں قرآن کی آیات پڑھ کر دم کرنا بھی آتا ہے۔یعنی اگر کوئی شخص قرآن کی آیات پڑھ کر دم کرتا ہے اور اس کی اجرت لیتا ہے تو یہ بھی جائز ہے۔ چنانچہ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعض صحابی کہیں سفر پر گئے تھے اور عرب کے ایک قبیلہ کے پاس رات گزارنے لگے۔قبیلہ والوں نے ان کی مہمانی نہ کی۔ان کے سردار یا نمبردار کو رات کچھ تکلیف ہوگئی۔(بعض روایات میں ہے کہ سانپ یا بچھو نے کاٹ لیا) وہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس آئے اور کہا کہ کیا تمہارے پاس کوئی دوا ہے؟ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے کہا ہاں ہے لیکن تم لوگوں نے چونکہ ہماری کوئی مہمان نوازی اور ضیافت نہیں کی اس لیے ہم اتنی بکریاں لیں گے پھر دوا دیں گے۔وہ راضی ہو گئے۔چنانچہ ایک صحابی نے سورہ فاتحہ پڑھ کر اس کو دم کیا جس سے اس کو شفا ہو گئی۔صحابہ کہتے ہیں کہ ہم وہ بکریاں لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ ذکر کیا۔آپ نے فرمایا: یہ تو دم تھا، اس کے بارے میں کوئی ممانعت نہیں یعنی بکریاں لینا جائز ہے۔پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿كلوا واضربوا لي معكم بسهم﴾

''کھاؤ اور ان میں سے اپنے ساتھ میرا حصہ بھی نکالو۔''

(رواہ الترمذی، رقم: ۲۰۶۳ وقال: حدیث صحیح)

خلاصہ یہ کہ ڈاکٹر اور طبیب کو علاج کی اجرت اور فیس دینا جائز ہے، علاج خواہ مادی ہو یا روحانی یعنی دم اور تعویذ سے ہو۔

حق لباس

اسلام نے ہر انسان کو لباس پہننے کا حق دیا ہے تاکہ وہ اپنے ستر کو چھپائے اور لوگوں کے درمیان اپنی زینت کا اظہار کرے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں قرآن حکیم میں ہے:

﴿یا بنی آدم قد انزلنا علیکم لباساً یواری سواٰتکم و ریشاً، ولباس التقوی، ذالک خیر، ذالک من آیات اللہ لعلهم یذکرون﴾ (الاعراف:۲۶)

''اے اولاد آدم! بے شک ہم نے تم پر ایسا لباس نازل کیا جو تمہاری شرم گاہوں کو چھپاتا ہے اور وہ تمہاری زینت (بھی) ہے، اور تقویٰ کا لباس وہی سب سے بہتر لباس ہے، یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

لباس، لبس سے مشتق ہے اور لبس کا اصلی معنی ہے کسی چیز کو چھپالینا۔ ہر وہ چیز جو انسان کی قبیح چیز کو چھپالے اس کو ''لباس'' کہتے ہیں۔ شوہر اپنی بیوی اور بیوی اپنے شوہر کو قبیح اور بری چیزوں سے چھپالیتی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی عصمت وعفت کی حفاظت کرتے ہیں اور خلاف چیزوں سے ایک دوسرے کے لیے مانع ہوتے ہیں، اس لیے انہیں ایک دوسرے کا لباس فرمایا گیا۔ لباس سے انسان کی زینت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا کہ لباس التقویٰ۔ تقویٰ کا مطلب ہے برے عقائد اور برے اعمال کو ترک کرنا اور پاکیزہ سیرت کو اپنانا۔ جس طرح کپڑوں کا لباس انسان کو سردی، گرمی اور موسموں کی شدت اور برسات وغیرہ سے بچاتا ہے اسی طرح تقویٰ کا لباس انسان کو

اخروی عذاب سے محفوظ رکھتا ہے۔ (مفردات: ۲/ ۶۱۰ مد)

لباس اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے کیونکہ اس سے انسان اپنی شرم گاہوں کو چھپاتا ہے ورنہ انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہ رہے۔ اور شیطان جب انسان پر حملہ کرتا ہے تو اس کے حملہ کا پہلا اثر انسان پر یہ ہوتا ہے کہ وہ لباس اتار دیتا ہے جیسا کہ آج کل یورپ اور امریکہ میں ہو رہا ہے کہ لوگ ننگے اور نیم برہنہ پھرنے میں کوئی عار اور شرم محسوس نہیں کرتے۔

مذکورہ بالا آیت میں لباس کے دو مقصد بیان کیے۔ ایک شرم گاہوں کا چھپانا اور دوسرا تجمل اور زینت۔ چنانچہ چند آیات بعد فرمایا:

﴿یابنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد﴾ (الاعراف: ۳۱)

''اے اولاد آدم! ہر عبادت کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو۔''

اس آیت میں زینت سے مراد لباس ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کھاؤ پیو اور لباس پہنو اور صدقہ کرو بغیر فضول خرچی اور تکبر کے، اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پہنو جب تک فضول خرچی اور تکبر نہ ہو۔'' (بخاری: ۲/ ۸۶۳، کتاب اللباس)

لباس کے اس نعمت ہونے کی وجہ سے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب کوئی نیا کپڑا پہنتے تو اس کا نام لیتے، خواہ قمیص ہو یا عمامہ ہو، پھر یہ دعا فرماتے:

''اے اللہ! تیرے لیے حمد ہے کہ تو نے مجھے یہ کپڑا پہنایا، میں تجھ سے اس کپڑے کی خیر کا سوال کرتا ہوں، اور جس کے لیے یہ بنایا گیا ہے اس کی خیر کا سوال کرتا ہوں، اور میں اس کپڑے کے شر سے جس کے لیے یہ بنایا گیا ہے، اس کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔'' (سنن ابوداود، رقم: ۴۰۲۰، سنن الترمذی، رقم: ۱۷۶۷)

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو تمام کپڑوں میں قمیص سب سے زیادہ پسند تھی۔ (سنن ابی داود، رقم: ۴۰۲۵، ترمذی، رقم: ۱۷۶۸)

سیدنا ابن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص کو تہبند میسر

نہ ہو وہ شلوار پہنے اور جس شخص کو جوتے میسر نہ ہوں وہ موزے پہنے۔" (بخاری، رقم: ۵۸۰۴)

سیدنا معتمر رضی اللہ عنہ کے والد بیان کرتے ہیں کہ میں نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ کو زرد رنگ کی اونی ٹوپی پہنے ہوئے دیکھا۔ (بخاری، رقم: ۵۸۰۲)

جعفر بن عمرو بن حریث کے والد بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے اور آپ نے سیاہ رنگ کا عمامہ باندھا ہوا تھا اور اس کی ایک طرف (شملہ) کو دونوں کندھوں کے درمیان ڈالا ہوا تھا۔

(سنن ابو داؤد، رقم: ۴۰۷۷، سنن کبریٰ بیہقی: ۳/۲۴۶، مسند حمیدی: ۱/۲۵۷، مسند احمد: ۴/۳۰۷، مسند ابی یعلیٰ: ۳/۴۴، تہذیب الکمال: ۱۳/۳۲۷)

لباس کے رنگوں میں رسول اللہ ﷺ کو سفید رنگ بہت پسند تھا۔ چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تم سفید لباس پہنو، وہ تمہارا بہترین لباس ہے اور اسی میں اپنے مردوں کو کفن دو۔"

(سنن ابوداؤد، رقم: ۴۰۶۱، ابن ماجہ، رقم: ۳۵۶۶)

سیدنا براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ متوسط قامت کے تھے۔ میں نے آپ کو سرخ حلہ (ایک قسم کی دو چادریں ایک تہبند کے طور پر باندھی جائے اور ایک اوپر بدن پر لپیٹی جائے) میں دیکھا۔ میں نے آپ سے زیادہ حسین کوئی چیز نہیں دیکھی۔

(بخاری، رقم: ۵۸۴۸)

یہی سیدنا براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے سرخ حلہ میں رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی حسین نہیں دیکھا۔

(مسلم، رقم: ۲۳۳۷، ابو داؤد، رقم: ۴۰۸۳، نسائی، رقم: ۵۲۲۸، ترمذی، رقم: ۱۷۲۴)

سیدنا ابو رمثہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے والد کے ساتھ سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ پر دو سبز رنگ کی چادریں تھیں۔

(سنن ابو داؤد، رقم: ۴۰۶۵، نسائی، رقم: ۵۳۲۱، ترمذی، رقم: ۲۸۱۲، مسند احمد، رقم: ۷۱۲۱، ابن حبان، رقم: ۵۹۹۵، سنن کبریٰ بیہقی: ۸/۲۷، معجم کبیر طبرانی: ۲۲/۲۱۱)

شریعت نے لباس صاف ستھرا اور اجلا اور عمدہ پہننے کی تلقین فرمائی تاکہ فخر و ریا

اور تکبر سے منع فرمایا۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے دل میں ایک ذرہ کے برابر بھی تکبر ہوگا، وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ ایک شخص نے عرض کی: ''یا رسول اللہ! ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اور اس کی جوتی اچھی ہو۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ جمیل ہے اور جمال سے محبت کرتا ہے۔ تکبر حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔''

(مسلم، رقم: ۹۱، سنن ابوداؤد، رقم: ۴۰۹۱، ترمذی، رقم: ۲۰۰۲، بیہقی شعب الایمان، رقم: ۶۱۹۳)

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کی: ''یا رسول اللہ! مجھے یہ اچھا لگتا ہے کہ میرے کپڑے دھلے ہوئے ہوں، اور میرے سر میں تیل لگا ہوا ہو اور میری جوتی نئی ہو، اس نے اور بھی کئی چیزیں ذکر کیں حتیٰ کہ اپنے چابک کی ڈوری کا بھی ذکر کیا، اور پوچھا: ''کیا یہ چیزیں تکبر میں سے ہیں؟'' فرمایا نہیں، یہ جمال ہے، بے شک اللہ جمیل ہے اور جمال سے محبت کرتا ہے، لیکن تکبر حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔

(مسند احمد، رقم: ۳۷۸۹، سندہ صحیح)

بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو مال کی نعمت دی ہے، اللہ تعالیٰ یہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھے۔

(نسائی، رقم: ۵۲۲۸، ۵۲۳۹، سنن ابوداؤد، رقم: ۴۰۶۳، ترمذی، رقم: ۲۸۲۸، مسند احمد، رقم: ۱۹۹۵۴، بیہقی شعب الایمان: ۵/۶۱۹۷)

سیدہ عائشہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اسلام صاف ستھرا ہے، سو تم بھی صاف ستھرے رہو کیونکہ جنت میں صرف صاف ستھرے لوگ داخل ہوں گے۔'' (المعجم الاوسط طبرانی، رقم: ۴۸۹۰، اس کی سند ضعیف ہے)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ سے ایک کپڑا پہن کر نماز پڑھنے کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم میں سے ہر شخص کے پاس دو کپڑے ہیں؟'' پھر ایک شخص نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے وسعت دی ہے تو اس وسعت کو اختیار کرو۔''

(بخاری، رقم: ۳۶۵)

امام محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ "تمیم نے ایک ہزار درہم کی چادر خریدی جس کو پہن کر وہ نماز پڑھتے تھے۔" (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم: ۴۹۶۵)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی میلے کپڑوں میں نہیں دیکھا۔ آپ کبھی کبھی تیل لگانا پسند کرتے تھے اور سر میں کنگھی کرتے تھے۔ اور رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ "اللہ تعالیٰ میلے کپڑوں اور پراگندہ بالوں کو ناپسند فرماتا ہے۔" (بیہقی شعب الایمان، رقم: ۶۲۲۶)

بعض احادیث میں معمولی کپڑے پہننے کا بھی آیا ہے۔

(ملاحظہ ہو ترمذی: ۲۳۸۹، ابوداؤد، رقم: ۴۰۳۳، مسند احمد، رقم: ۱۹۷۰۹، مستدرک: ۶۱/۱، ۱۸۳/۴، وغیرہ)

یہ احادیث عمدہ، صاف ستھرا اور اجلا لباس پہننے والی احادیث کے مقابلہ میں حسن یا ضعیف، اس لیے یہ ان احادیث کے مقابلہ میں زیادہ قابل عمل نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کا منشاء دراصل میانہ روی اور اعتدال پسندی ہے۔ وہ زیادہ فاخرانہ لباس پہننے اور زیادہ گھٹیا لباس پہننے دونوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا بلکہ ان دونوں کے درمیان معاملہ ہو۔

اسلام عمدہ لباس پہننے سے تو نہیں روکتا تکبر اور فخر اور اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرنے کے لیے جو لباس پہنا جائے اس کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿من جر ثوبه خيلاء لم ينظر الله اليه يوم القيامة﴾

"جو شخص غرور اور تکبر کی وجہ سے اپنا کپڑا لٹکائے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی طرف دیکھنے کا بھی نہیں۔"

حق سکونت

اسلام نے ہر انسان کو سکونت کا حق عطا فرمایا ہے کہ اس کا ایک مکان ہونا چاہیے جس میں وہ سکونت اختیار کرے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿واللہ جعل لکم من بیوتکم سکنا وجعل لکم من جلود الانعام بیوتا تستخفونہا یوم ظعنکم ویوم اقامتکم﴾ (النحل: ۸۰)

''اور اللہ نے تمہاری رہائش کے لیے تمہارے گھر بنائے اور تمہارے مویشیوں کی کھالوں سے خیمے بنائے جن کو تم ہلکا پھلکا دیکھ کر سفر کے دن اور اقامت کے دن کام میں لاتے ہو۔''

اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں کا ذکر فرماتے ہیں اور انسان کی دنیوی نعمتوں کا ذکر فرمایا جن سے وہ اپنی دنیوی زندگی میں فائدہ حاصل کرتا ہے، مثلاً وہ رہنے کے لیے اینٹوں، پتھروں، سیمنٹ، لوہے اور لکڑی سے مکان بناتا ہے، اور یہ تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ جنگلوں میں سفر کے لیے وہ ہلکے پھلکے خیمے لے جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں مویشیوں کی کھالوں کے خیمے بنائے جاتے تھے، اب کینوس یا اور کسی مضبوط کپڑے کے خیمے بنائے جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ایک انسان کے لیے چھت اور مسکن اس کا بنیادی حق ہے کیونکہ اس کے بغیر اس کا گزارہ مشکل ہے۔

سیدنا عثمان بن عفان امیر المومنین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ان تین چیزوں کے علاوہ بنی آدم کے لیے اور کوئی حق نہیں:

﴿بیت یسکنه، ثوب یواری عورته و جلف الخبز و الماء﴾
(سنن ترمذی، رقم: ۲۳۴۱، قال: حدیث حسن صحیح)

''ایک گھر جس میں وہ رہ سکے، ایک کپڑا جس سے وہ اپنی شرم گاہ کو چھپا سکے اور سوکھی روٹی اور پانی۔''

اسلام نے گھروں کے معاملہ میں آزادی کا نظریہ پیش کیا ہے اور گھر کی عظمت وحرمت کو لوگوں کے ذہنوں میں اتارنے کی کوشش کی ہے۔ گھر کے مالک کی اجازت کے بغیر اس میں داخل ہونے کو منع فرمایا اور گھر کے اندر جھانکنے سے بھی روکا، اور جو لوگ اس گھر میں رہتے ہیں، ان کے بارے تجسس کرنے سے بھی منع فرمایا۔ اس بارے میں مختلف احادیث موجود ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

کھانے پینے کا حق

انسان کے جو حقوق اسلام نے مقرر کیے ہیں ان میں ایک حق کھانے پینے کا بھی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿وکلوا واشربوا ولا تسرفوا، انه لایحب المسرفین﴾

(الاعراف:۳۱)

اس بارے میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کھانے اور پینے کو حلال فرمایا اور انسان کا حق بھی فرمایا جب تک کہ فضول خرچ نہ ہو اور تکبر نہ کرے۔ جتنی مقدار کھانے سے رمق حیات باقی رہ سکتی ہے اتنی مقدار کھانا پینا فرض ہے۔ رزق حلال کمانے اور بدنی عبادات انجام دینے کے لیے جتنی صحت اور توانائی کی ضرورت ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے جس قدر کھانے کی ضرورت ہے، اتنا کھانا بھی فرض ہے۔ صحت کے تحفظ کے لیے پرہیزی کھانا اور نقصان دہ چیزوں کو ترک کرنا واجب اور ضروری ہے۔ نبی ﷺ نے شعبان کے روزے رکھنے سے اس لیے منع فرمایا تاکہ رمضان کے فرض روزے رکھنے کے لیے آدمی کمزور نہ ہو جائے۔ اسی طرح عام مسلمانوں کو وصال کے روزے رکھنے سے روکا گیا تاکہ انسان لاغر اور کمزور نہ ہو جائے اور اس کی صحت برقرار رہے۔ جتنا کھانے سے انسان کی توانائی اور طاقت بحال رہتی ہے، اس سے کم کھانا کوئی نیکی نہیں اور نہ یہ کوئی زہد و تقویٰ ہے۔ لیکن بسیار خوری اور زیادہ کھانا بھی کوئی نیکی کا کام نہیں بلکہ ناجائز اور گناہ ہے اور اس کو قرآن نے فضول خرچی کہا ہے اور اس کی ممانعت کردی (ولا تسرفوا) جیسا کہ گذشتہ سطور میں بتایا گیا ہے کہ

یہ جان ہماری ملکیت نہیں بلکہ ہمارے پاس یہ اللہ کی امانت ہے اور ہر امانت کی حفاظت کے لیے ہر اس چیز سے پرہیز واجب ہے جو مضر بدن ہے۔ مرغن اور چٹ پٹی غذائیں کھانے سے انسان مختلف قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جس میں تیزابیت، تبخیر اور السر (Ulcer) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پھر مرغن غذائیں کھانے سے خون میں کلیسٹرول بڑھ جاتا ہے اور انسان ذیابیطس، امراض قلب اور ہائی بلڈ پریشر کا شکار ہو جاتا ہے۔ مسلسل سگریٹ پینے سے خون کی شریانیں سکڑ جاتی ہیں۔ لہٰذا شریعت نے ان سب چیزوں سے روک دیا تاکہ آدمی مختلف بیماریوں کا شکار نہ ہو۔ چنانچہ حدیث میں ام المنذر بنت قیس انصاریہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے پاس ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ آپ کے ساتھ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی تھے جو اس وقت کسی بیماری سے اٹھ کر کمزور ہو گئے تھے۔ ہمارے پاس کھجوروں کا خوشہ لٹکا ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو کر اس سے کھجوریں کھانے لگے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی کھجوریں کھانے کے لیے کھڑے ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو منع فرمایا کہ کھجوریں مت کھاؤ تم کمزور ہو۔ چنانچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ رک گئے۔ اور میں نے جو اور چقندر کا کھانا بنایا ہوا تھا۔ میں جب وہ لے کر آئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس سے کھاؤ، یہ تمہارے لیے فائدہ مند ہے۔''

(سنن ابو داؤد، رقم: ۳۸۵۶، سنن ترمذی، رقم: ۲۰۳۳، مسند احمد: ۶/۳۶۴، ابن ماجہ، رقم: ۳۴۴۲)

امام غزالی فرماتے ہیں کہ ''ایک حکیم نے کہا ہے: وہ دوا جس کے ساتھ کوئی بیماری نہ ہو، وہ یہ ہے کہ جب تک بھوک نہ ہو، اس وقت تک مت کھاؤ، اور ابھی بھوک باقی ہو تو کھانا چھوڑ دو۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بسیار خوری بیماری کی جڑ ہے اور پرہیز کرنا دوا کی جڑ ہے اور بدن کو اس کی عادت کے مطابق عادی بناؤ۔''

(احیاء العلوم: ۳/۲۲۱)

احیاء العلوم کی شرح میں ہے کہ:

''پرہیز کرنا دوا کا سردار ہے، اور وہب بن منبہ فرماتے ہیں کہ ''طب کا رئیس پرہیز ہے اور حکمت کا رئیس خاموشی۔'' (اتحاف السادۃ المتقین: ۷/۴۰۰)

بسیار خوری بھی بد پرہیزی میں شامل ہے اور انسانی بدن کے لیے مختلف بیماریوں کا باعث ہے اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے بسیار خوری کی بھی مذمت فرمائی ہے۔ چنانچہ سیدنا مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آدمی کے پیٹ سے بڑھ کر کسی برتن کا بھرنا برا نہیں ہے۔ ابن آدم کے لیے چند لقمے کافی ہیں جن سے اس کی کمر قائم رہ سکے۔ اور اگر اس نے زیادہ کھانا ہی ہے تو پیٹ کا تہائی حصہ کھانے کے لیے رکھے اور تہائی حصہ پانی کے لیے اور تہائی حصہ سانس لینے کے لیے۔"

(سنن ترمذی، رقم: ۲۳۸۰، سنن کبری بیہقی، رقم: ۲۹۲۷، مسند احمد، رقم: ۱۷۱۸۶)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک کافر مہمان آیا (بعض روایت میں ہے کہ وہ ثمامہ بن آثال تھا) رسول اللہ ﷺ نے اس کے لیے ایک بکری کا دودھ لانے کا حکم فرمایا۔ اس نے ایک بکری کا دوہا ہوا دودھ پی لیا۔ پھر دوسری بکری کا، پھر تیسری کا یہاں تک کہ سات بکریوں کا دودھ پی گیا۔ صبح اٹھ کر وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے پھر اس کے لیے ایک بکری کا دودھ لانے کا حکم دیا۔ پھر دوسری بکری کا دودھ لایا گیا تو وہ اس کو پورا نہ پی سکا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مومن ایک آنت میں پیتا ہے اور کافر سات آنتوں میں پیتا ہے۔ امام مسلم کی دیگر روایات میں ہے کہ "مومن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔

(مسلم، رقم: ۵۳۸۱، ۲۰۶۳، سنن کبری نسائی، رقم: ۶۸۹۳)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "یہ بھی اسراف ہے کہ تم اپنی ہر خواہش کے مطابق چیز کھالو۔" (سنن ابن ماجہ، رقم: ۳۳۵۲)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے سرکار دو عالم ﷺ کے سامنے ڈکار لی تو آپ ﷺ نے فرمایا: "ہمارے سامنے اپنی ڈکار روک کر رکھو۔ کیونکہ جو لوگ دنیا میں بہت زیادہ سیر ہو کر کھاتے ہیں وہ قیامت کے روز بہت زیادہ بھوکے ہوں گے۔" (سنن ترمذی، رقم: ۲۴۸۶، سنن ابن ماجہ، رقم: ۳۳۵۰)

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''کھاؤ پیو اور لباس پہنو لیکن اسراف اور تکبر نہ کرو۔'' (رواہ النسائی، رقم: ۲۵۱۲)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے کھانا کھلانے کی ترغیب و تحریص دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿افشوا السلام، اطعموا الطعام، وصلوا والناس نیام، تدخلوا الجنة بسلام﴾

''آپس میں سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ اور جب لوگ سو رہے ہوں تو نماز پڑھو، اگر تم یہ سب کرو گے تو سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔''

(سنن الدارمی: ۱/۳۴۰، ۲/۲۷۵، مسند احمد: ۵/۴۵۱، مستدرک حاکم: ۳/۱، ترمذی، رقم: ۲۴۸۵، سنن ابن ماجہ، رقم: ۱۳۳۴، ۳۲۵۱)

اسی وجہ سے شریعت نے قربانی کا گوشت اور حج کی قربانیوں اور کفارات کا گوشت دوسروں کو بھی کھلانے کی تلقین کی تاکہ لوگوں کی کفالت ہو سکے اور کوئی شخص بھوکا نہ رہ جائے۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لیس المومن الذی یشبع وجارہ جائع الیٰ جنبہ﴾

''وہ شخص مومن نہیں ہے جو خود تو پیٹ بھر کر کھائے اور اس کے پہلو میں اس کا ہمسایہ بھوکا سویا ہوا ہو۔'' (رواہ البخاری فی الادب المفرد: ۱۱۲)

مختصر یہ کہ کھانا پینا اسلام میں ایک شخص کا بنیادی حق ہے، لیکن کھانے میں حلال اور طیب چیزیں کھانی چاہئیں منشیات اور ناپاک اور حرام اشیاء کھانے سے اسلام نے سختی سے روکا ہے اور مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور اس قسم کی دوسری چیزیں حرام قرار دے دیں۔

حق الامن

اسلام نے ہر انسان کے امن کا حق بھی دیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ''مومن وہ ہے جس سے لوگ امن میں رہیں۔'' گویا مومن امن و سلامتی کا پیامبر ہے۔ اور اسلام خود امن و سلامتی کا دین ہے۔ اسی وجہ سے اس میں ایک دوسرے کو ملنے کے وقت سلام کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ سلام کیا ہے؟ اس سلسلہ میں علمائے لغت نے لکھا ہے کہ ''سلام'' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے نقص و عیب اور فانی ہونے سے سلامت اور بری ہے۔ اس سلسلہ میں ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ ان تمام عوارض و نقائص سے پاک اور مبرا ہے جو اس کے غیر کو لاحق ہوتے ہیں۔ وہ ایسا باقی اور دائم ہے جو مخلوق کو تو فنا کرتا ہے اور خود فنا نہیں ہوتا۔ امام بیہقیؒ کے قول کے مطابق حق تعالیٰ شانہ کا نام ''سلام'' اس لیے ہے کہ اس نے تمام مخلوق کو اختلال اور تفاوت سے محفوظ و مصئون رکھا ہے۔

دو مسلمان جب آپس میں ملتے ہیں تو وہ ''السلام علیکم'' کہہ کر ایک دوسرے کو امن و سلامتی کا سندیسہ دیتے ہیں جس سے باہمی محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایسی شے نہ بتاؤں جس پر عمل کرنے سے تمہاری باہمی محبت میں اضافہ ہو۔ وہ شے یہ ہے کہ تم آپس میں ''السلام علیکم'' کو عام کرو۔

قرآن حکیم میں ہے کہ سیدنا ابرہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے سات دعائیں کیں۔

ان میں سب سے پہلی دعا یہ تھی کہ اے میرے رب! اس شہر کو امن والا شہر بنا

دے۔ اور امن وامان کا حاصل ہونا اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ ایمان بھی اسی وقت سلامت رہ سکتا ہے جب شہر میں امن ہو، جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ ہو۔ جب ملک میں امن و سلامتی نہ ہو اور ڈاکوؤں کا راج ہو۔ کسی شہری کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ نہ ہو تو پھر مسجدوں میں نمازیں بھی کلاشنکوف والے گارڈ کھڑے کر کے پڑھی جائیں گی، دوسرے اسلامی شعائر کو بھی قائم نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی شخص اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ ایک شخص بنک سے رقم لے کر باہر نکلتا ہے تو ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے مال بھی گیا اور جان بھی گئی۔ بچے یتیم ہوئے، عورت بیوہ ہوئی اور کاروبار فنا ہوئے۔ باپ اور ماں کا عصائے پیری ٹوٹ گیا۔ غرض یہ کہ امن نہ ہونے کی وجہ سے دین و دنیا دونوں خطرے میں ہوتے ہیں۔ دین و دنیا میں کامیابی اسی وقت حاصل ہو گی جب ملک میں امن وامان قائم ہو۔

شاید اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے چاند دیکھ کر امن و سلامتی کا ذکر ایمان اور اسلام سے پہلے کیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے چاند کو دیکھ کر جو دعا کی وہ یہ ہے:

﴿اللھم اھله علینا بالامن والایمان والسلامة والاسلام ربی وربک اللہ﴾

”اے اللہ! ہمیں اس چاند میں امن و سلامتی اور ایمان و اسلام کے ساتھ رکھ۔ میرا اور تیرا رب اللہ ہے۔“

(عمل الیوم واللیلة لابن سنی، رقم: ۶۴۴، سنن الدارمی، رقم: ۱۶۸۷، سنن ترمذی، رقم: ۳۴۵۱، مسند احمد، رقم: ۱۳۹۷)

اسی طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بھی سات دعاؤں میں سب سے پہلی دعا امن کی مانگی کہ اے اللہ! اس شہر کو امن والا شہر بنا دے۔ معلوم ہوا کہ امن ایک نعمت خداوندی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم میں اس کو بطور نعمت ذکر فرمایا:

﴿فلیعبدوا رب ھذا البیت، الذی اطعمھم من جوع وآمنھم من خوف﴾ (قریش۔ ۳۔۴)

”پس چاہیے کہ عبادت کریں اس گھر کے رب کی جس نے ان کو کھانا دیا بھوک میں اور امن دیا ڈر میں۔“

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں:

"مکہ میں غلہ وغیرہ پیدا نہیں ہوتا تھا، اس لیے قریش کی عادت تھی کہ سال بھر میں تجارت کی غرض سے دو سفر کرتے تھے۔ جاڑوں میں یمن کی طرف کہ وہ ملک گرم ہے اور گرمیوں میں شام کی طرف جو سرد اور شاداب ملک ہے۔ لوگ ان کو اہل حرم اور خادم بیت اللہ سمجھ کر نہایت عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے۔ ان کی خدمت کرتے اور ان کے جان و مال سے کچھ تعرض نہ کرتے۔ اس طرح ان کو خاطر خواہ نفع ہوتا۔ پھر امن وچین سے گھر بیٹھ کر کھاتے اور کھلاتے تھے۔ حرم کے چاروں طرف لوٹ کھسوٹ اور چوری ڈکیتی کا بازار گرم رہتا تھا، لیکن کعبہ کے ادب سے کوئی چور ڈاکو قریش پر ہاتھ صاف نہ کرتا تھا۔ اسی انعام کو یہاں یاد دلایا ہے کہ اس گھر کے طفیل تم کو روزی دی اور امن وچین دیا۔ "اصحاب فیل" کی زد سے محفوظ رکھا، پھر اس گھر والے کی بندگی کیوں نہیں کرتے اور اس کے رسول ﷺ کو کیوں ستاتے ہو؟ کیا یہ انتہائی ناشکری اور احسان فراموشی نہیں۔ اگر دوسری باتیں نہیں سمجھ سکتے تو ایسی کھلی ہوئی حقیقت کا سمجھنا کیا مشکل ہے؟" (فوائد عثمانی: ص ۸۰۳)

اسی امن وامان کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جو شخص اپنے خاندان میں صبح کرتا ہے اور اپنے جسم میں عافیت پاتا ہے، اور اس کے پاس ایک روز کی خوراک ہے، گویا پوری دنیا اس کے پاس موجود ہے۔" (رواہ الترمذی، رقم: ۲۳۴۶ وقال حدیث حسن غریب)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لا یحل لمسلم ان یروع مسلما﴾ (ابوداؤد، رقم: ۵۰۰۴)

"کسی مسلمان کے لیے یہ جائز اور حلال نہیں ہے کہ دوسرے مسلمان کو خوف زدہ کرے۔"

خلاصہ یہ کہ اسلام نے انسان کے اس حق کی پوری پوری حفاظت کی ہے کہ وہ امن میں رہے اور اس کو خوف زدہ نہ کیا جائے، اور یہ کہ امن زندگی کے اہم لوازم میں سے ہے۔

خاندان کی بنیاد

حق نکاح:

خاندان اجتماعی نظام کی بنیاد کی پہلی اینٹ ہے، لہٰذا اسلام اس بنیادی اینٹ کو مضبوط دیکھنا چاہتا ہے اور اس کو مودت و رحمت اور پاکیزگی سے راسخ اور بنیان مرصوص بنانا چاہتا ہے، اس لیے وہ نکاح میں ایک پختہ میثاق کی حیثیت دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿واخذن منکم میثاقاً غلیظاً﴾ (النساء:۲۱)

"اور وہ عورتیں تم سے میثاق غلیظ (پختہ عہد) لے چکی ہیں۔"

مفسرین کے مطابق اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو نکاح کرانے والے کہتے ہیں کہ ہم نے اس عورت سے تمہارا نکاح اس عہد و پیمان پر کیا ہے کہ تم اس عورت کو دستور کے مطابق رکھو گے یا حسن سلوک کے ساتھ چھوڑ دو گے۔ بعض حضرات کے نزدیک اس میثاق غلیظ کا مطلب یہ ہے کہ تم نے ان عورتوں کو اللہ کی امانت کے طور پر عقد میں لیا ہے اور اس اللہ کی اجازت سے تم نے ان کے جسموں کو اپنے اوپر حلال کر لیا ہے۔

لغت میں نکاح کا معنی جمع کرنا اور ملانا ہے اور شریعت اسلامیہ میں نکاح اس عقد کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے کسی عورت کے جسم سے فائدہ اٹھانے کا مالک بنایا جاتا ہے۔ اگر کسی شخص میں شہوت کا مادہ حد اعتدال میں ہو تو نکاح سنت ہے، اور اگر شہوت کا غلبہ ہو تو اس پر نکاح کرنا واجب ہے۔ اور جب اس نفس پر ظلم کا خدشہ اور اندیشہ ہو تو پھر اس

کا نکاح کرنا مکروہ ہے، اگر وہ عنین (نامرد) ہو تو پھر اس کا نکاح کرنا حرام ہے
(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الدرالمختار مع ردالمحتار: ۲/۲۷۰)

اسلام میں شادی کا مقصد نفس کی تسکین، دن کی راحت، ضمیر کا سکون، مرد و عورت کے درمیان محبت، رحم اور ہمدردی، یکسانیت و ہم آہنگی، باہمی تعاون، باہمی شفقت و مہربانی ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ مرد و عورت باہم خیر خواہی کی زندگی بسر کریں تاکہ دونوں میں الفت و محبت، حلم و بردباری اور شفقت و مہربانی کی ایسی فضا قائم ہو جس میں نوخیز نسل محبت و شفقت کی فضا میں پرورش پائے، اور ایک خاندان نہایت اعلیٰ طریق سے پروان چڑھے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿ومن آیاته أن خلق لكم من انفسكم ازواجاً لتسكنوا الیها وجعل بینكم مودة ورحمةً﴾ (الروم: ۲۱)

''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔''

بتایا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم کو ان سے سکون حاصل ہو، اور جب دو مختلف جنسوں کے افراد ہوں تو ان کا ایک دوسرے کی طرف میلان نہیں ہوتا اور وہ ایک دوسرے سے سکون حاصل نہیں کر سکتے، اور جب ایک جنس کے دو افراد ہوں تو وہ ایک دوسرے سے سکون حاصل کرتے ہیں، اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی قائم کر دی۔

اسلام کی یہ خواہش ہے کہ نسل انسانی کو فروغ ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ مرد عورت کی کشت میں تخم ریزی کرے، اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے درمیان غیر معمولی محبت پیدا کر دی۔ حالانکہ یہ عمل اس قدر حیاء سوز ہے کہ عام حالات میں انسان یہ عمل نہ کرتا، لیکن انسان کی افزائش کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس عمل کو اس قدر پرکشش اور الذ الاشیاء بنا دیا ہے کہ انسان اس عمل کو ترک نہیں کر سکتا، اور مرد اور عورت میں اللہ تعالیٰ نے محبت و مودت اور ہمدردی بھی رکھ دی۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ دونوں

ضعیف اور ناتواں ہو جاتے ہیں اور اس عمل کے قابل نہیں رہتے تو وہ ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں اور ایک دوسرے کی بڑھاپے میں بھی مدد اور ہمدردی کرتے ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت میں سے ہر یک کا جسم دوسرے کے جنسی تقاضوں اور طلب کے موافق بنایا ہے۔ پھر ایک متوازن اور متناسب تعداد میں ہر ایک کی پیدائش ہو رہی ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خاندان یا کسی قوم میں صرف لڑکے پیدا ہوں اور دوسرے خاندان یا قوم میں صرف لڑکیاں پیدا ہوں۔ ہزاروں سال سے یہ سلسلہ جاری و ساری ہے اور ایک معروف اور منضبط طریقے سے انسانوں کی پیدائش ہو رہی ہے۔ پیدائش کا یہ سلسلہ کوئی بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں بلکہ قادر و قیوم اللہ رب العزت کی قدرت کا شاہکار ہے۔

مختصر یہ کہ دو نفوس کے درمیان انتہائی گہرے رشتے کا تعلق جو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان پیدا کرتا ہے تاکہ دونوں نفوس نہایت سکون و قرار اور راحت و رحمت کی نعمت سے لطف اندوز ہوں اور ایک ایسا پرسکون گھر وجود میں آئے جو خالص محبت و مودت اور رحمت و شفقت سے معمور ہو۔

نکاح اور شادی اسباب غنا میں سے ہے:

شادی اور نکاح غنا کے اسباب اور دین کے کمال میں سے ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿وانکحوا الایامی منکم والصالحین من عبادکم وامائکم، ان یکونوا فقراء یغنیھم اللہ من فضلہ﴾ (النور ۳۲)

''اور تم اپنے بے نکاح مردوں اور عورتوں کا نکاح کر دو اور اپنے باصلاحیت غلاموں اور باندیوں کا، اگر وہ فقیر ہیں تو اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔''

قرآن حکیم کی اس آیت کو پڑھ کر سیدنا ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نکاح کی رغبت دلاتا ہے، اور اس شخص کو شادی کا حکم دیتا ہے جس میں شادی کی صلاحیت

پائی جائے، اور ساتھ ہی غنا کا وعدہ فرماتا ہے۔ اس پر عمل کرو اور اللہ رب العزت کے اس امر کی اطاعت کرو۔ اس سلسلہ میں اس نے تم سے جو کچھ وعدہ فرمایا ہے، پورا کرے گا۔ (تفسیر ابن کثیر ۲۸۹/۳)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شادی کے ذریعہ غنا تلاش کرو، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

﴿التمسوا الغنیٰ فی النکاح﴾ (تفسیر ابن کثیر: ۲۸۶/۳)

''غنا نکاح میں تلاش کرو۔''

اسلام کی نگاہ میں ایک صالحہ اور نیک عورت دنیوی زندگی بلکہ آخرت کی زندگی کی بھی عمدہ ترین شے ہے اور مرد کے لیے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت۔ جب وہ زندگی کی تکالیف، رنج و محن، غم و اندوہ اور محنت و مشقت کی تھکن سے اس کے پاس جاتا ہے تو راحت، تسکین اور ایسا سامان زیست پاتا ہے جس کی مثل انسانی میں کوئی شے نہیں۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا:

﴿الدنیا متاع و خیر متاع الدنیا المرأۃ الصالحۃ﴾

(مسلم، رقم: ۱۴۶۷، ابن ماجہ، رقم: ۱۸۵۵، مسند احمد: ۱۶۸/۲، ابن حبان: ۳۴۰/۹، شرح السنۃ: ۱۰/۹، کنز العمال: ۲۷۱/۹)

''دنیا سامان زیست ہے اور اس کا بہترین سامان صالح عورت ہے۔''

گویا اسلام کی نظر میں شادی کا کتنا بلند اور تابناک مقصد ہے اور وہ عورت کی نسوانیت کو کتنا بلند اور محترم مقام دیتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے نکاح کی فضیلت بیان کر کے اس کی تاکید اور ترغیب دی۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اے نوجوانو! تم میں سے جو شخص گھر بسانے کی طاقت رکھتا ہے، وہ نکاح کر لے کیونکہ نکاح نظر کو نیچے رکھتا ہے اور شرم گاہ کی حفاظت کرتا ہے، اور جو نکاح کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، وہ روزے رکھے کیونکہ روزے شہوت کو کم کرتے ہیں۔'' (بخاری، رقم: ۵۰۶۶، مسلم، رقم: ۱۴۰۰، سنن ابو داؤد، رقم: ۲۰۴۶، سنن الترمذی، رقم: ۱۰۸۱)

اسی سلسلہ میں ایک اور حدیث سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے بعد ایک بندۂ مومن کے لیے سب سے بڑی خیر یہ ہے کہ اس کی نیک بیوی ہو، اگر وہ اس کو کوئی حکم دے تو وہ اس کی اطاعت کرے، اور اگر وہ اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کرے، اور اگر وہ اس کے اوپر کوئی قسم کھائے تو وہ اس کو پورا کرے، اور اگر وہ کہیں چلا جائے تو وہ اپنی ذات اور اس کے مال کی حفاظت کرے۔ (سنن ابن ماجہ، رقم: ۱۸۵۷؛ معجم کبیر طبرانی: ۲۴۴/۸؛ کنز العمال ۲۷۲/۱۶)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ازراہ کرم تین شخصوں کی مدد اپنے ذمہ لے لی ہے، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا، وہ مکاتب وہ اپنا بدل کتابت ادا کرنے کی نیت رکھتا ہو، اور وہ شخص جو پاک دامن رہنے کی نیت سے نکاح کرے۔

(سنن الترمذی، رقم: ۱۶۵۵، سنن ابن ماجہ، رقم: ۲۵۱۸، مسند احمد: ۲۵۱/۲، ابن حبان، رقم: ۴۰۱۹، مستدرک حاکم: ۱۶۰/۲، سنن کبریٰ بیہقی: ۷۸/۷، شرح السنہ بغوی: ۹/۷، مسند ابی یعلی: ۳۱۰/۱۱، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم، ۳۸۸/۸، اسنادہ حسن)

ایک اور حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص خوش حال ہو اور نکاح کی طاقت رکھتا ہو، پھر بھی نکاح نہ کرے، وہ میرے طریقہ پر نہیں ہے۔" (مجمع الزوائد: ۲۵۱/۴، معجم کبیر طبرانی: ۳۶۶/۲۲، معجم اوسط، رقم: ۹۹۳، بیہقی شعب الایمان، رقم: ۵۴۸۱)

ایک مرتبہ ایک صحابی نے آپ ﷺ سے پوچھا: "یا رسول اللہ! ہم کون سا مال حاصل کریں؟ فرمایا:

﴿قلباً شاكراً، ولساناً ذاكراً، وزوجة مومنة، تعين احدكم على امر الآخرة﴾

"شکر کرنے والا دل، ذکر کرنے والی زبان، اور ایسی مومن بیوی جو امور آخرت میں تمہاری معین و مددگار ہو۔"

(ابن ماجہ، رقم: ۱۸۵۶، مسند احمد: ۲۷۸/۵، معجم صغیر طبرانی: ۳۵/۲، حلیۃ الاولیاء: ۱۸۲/۱)

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''عورت کے اس کے جمال، اس کے مال، اس کے اخلاق اور اس کی دینداری کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے۔ تم اس کی دینداری اور اس کے اخلاق کے سبب کو لازم کرلو۔''

(مسند احمد: ۳/۸۰، ابن حبان، رقم: ۴۰۳۶، مسند البزار، رقم: ۱۴۰۳، مستدرک حاکم: ۲/۱۶۱، مسند ابی یعلی، رقم: ۱۰۱۲)

ایک روایت کے الفاظ یوں ہیں:

﴿تنکح المرأة لاربع: لمالها، ولحسبها، وجمالها، ولدنيها، فاظفر بذات الدين، تربت يداك﴾

''عورت سے چار چیزوں کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے: دولت کی وجہ سے، خاندانی وجاہت کی وجہ سے، خوب صورتی کی وجہ سے اور دین داری کی وجہ سے، تم دیندار عورت سے نکاح کرنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ تمہارے ہاتھ گرد آلود ہوں۔''

(بخاری، رقم: ۵۰۹۰، مسلم، رقم: ۱۴۶۶، وایضاً اخرجہ ابوداؤد والنسائی فی النکاح، مسند الدارمی: ۲/۱۳۳، سنن کبریٰ بیہقی: ۷/۷۹، ابن حبان: ۹/۳۴۴، شرح السنۃ: ۹/۷، مسند احمد: ۲/۴۲۸، ابن ماجہ، رقم: ۱۸۵۹، مسند ابی یعلی: ۱۱/۷۵، حلیۃ الاولیاء: ۸/۳۸۵)

اس سلسلہ میں امام یافعی نے ایک حکایت بھی نقل کی ہے کہ عبداللہ بن مبارکؒ کے والد مبارک ایک غلام تھے جو اپنے آقا کے باغ میں کام کرتے تھے۔ ایک روز آقا نے ان سے اپنی بیٹی کے بارے مشورہ کیا جس کے بارے میں کئی لوگوں کے پیغام آ چکے تھے۔ آقا نے کہا: مبارک! بتاؤ، میں کس سے اپنی بچی کی شادی کروں؟ مبارک نے کہا: ''یا سیدی! نکاح کے معاملہ میں لوگوں کی اغراض مختلف ہیں۔ اہل جاہلیت تو خاندانی وجاہت پر شادی کرتے تھے، اور یہود مال کے لیے اور عیسائی جمال اور خوب صورتی کے لیے، لیکن اس امت کے لوگ دین کے لیے شادی کرتے ہیں، یعنی ان میں سے جو نیک لوگ ہیں وہ عورت کی دینداری کے باعث اس سے شادی کرتے ہیں۔ جب آقا نے

مبارک کے منہ سے یہ بات سنی تو اسے اس کی عقل پر بڑی حیرانی ہوئی، لہٰذا اس نے اپنی بیوی سے کہا: ''بخدا! ہماری اس بچی کے لیے یہ سب سے بہترین شوہر ہے، اس کے سوا اس کی شادی اور کسی سے نہیں ہو سکتی۔'' چنانچہ انہوں نے مبارک سے اپنی بچی کی شادی کر دی اور اس عورت سے امام عبداللہ بن مبارکؒ پیدا ہوئے جو امام بخاری کے استاذ تھے۔

(مرآۃ الجنان للیافعی، ۱/۹۲۴ فی ترجمۃ عبداللہ بن المبارکؒ)

ایک نوجوان کو اپنی رفیقۂ حیات کے انتخاب میں رسول اللہ ﷺ کے اس قول کی روشنی میں انتخاب کرنا چاہیے جو دینداری کے زیور سے آراستہ ہوتا کہ ازدواجی زندگی آرام وچین اور سکون واستقرار سے گزر سکے۔ صرف خوبصورتی، حسن وجمال، حسب ونسب اور زیب وزینت کو معیار نہیں بنانا چاہیے کیونکہ ان سب چیزوں کو قرار اور بقا نہیں ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''عورتوں سے ان کے حسن کی وجہ سے شادی نہ کرو کیونکہ ان کا حسن ہلاکت میں ڈال دیتا ہے، اور ان کے اموال کی وجہ سے بھی ان سے شادی نہ کرو کیونکہ مال انہیں سرکشی پر آمادہ کر دیتا ہے بلکہ ان سے ان کے دین کی وجہ سے شادی کرو کیونکہ ایک کالی کلوٹی نکٹی دیندار عورت ان سے افضل ہے۔''

(ابن ماجہ، رقم: ۱۸۵۹، کنز العمال: ۱۶/۲۹۲)

اسی سلسلہ میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص کسی عورت سے اس کی عزت کی وجہ سے نکاح کرے گا اللہ تعالیٰ اس شخص کی ذلت میں اضافہ کرے گا، اور جو شخص کسی عورت سے اس کے مال کی وجہ سے نکاح کرے، اللہ تعالیٰ اس کے فقر میں اضافہ کرے گا، اور جو شخص کسی عورت سے اس کے منصب کی وجہ سے نکاح کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی پستی میں اضافہ کرے گا اور جو شخص کسی عورت سے اس وجہ سے نکاح کرے گا کہ اس کی نظر نیچی رہے یا اس کی شرم گاہ گناہ سے بچی رہے، یا رشتہ جوڑنے کے لیے نکاح کرے گا، اللہ تعالیٰ اس شخص کو اس نکاح میں

برکت دے گا اور اس عورت کو بھی اس نکاح میں برکت دے گا۔ (بارک اللہ لہ فیھا وبارک لھا فیہ)

(معجم اوسط طبرانی، رقم: ۲۵۲۷، مجمع الزوائد: ۲۵۴/۴، الترغیب و ترہیب، رقم ۲۸۷۰، وسندہ ضعیف)

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:
''ابن آدم کی سعادت (نیک بختی) میں سے تین چیزیں ہیں۔ نیک بیوی، آرام دہ مکان اور آرام دہ سواری، اور ابن آدم کی شقاوت (بدبختی) میں سے تین چیزیں ہیں، بری بیوی، بے آرام مکان اور بری سواری۔''

(مسند احمد، ۱۶۸/۱، مستدرک حاکم: ۲/۱۴۴، ابن حبان، رقم: ۴۰۲۱)

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:
﴿من تزوج فقد استکمل نصف الدین، فلیتق اللہ فی النصف الثانی﴾
''جس شخص نے نکاح کر لیا تو اس کا نصف ایمان کامل ہو گیا، اب اس کو چاہیے کہ باقی نصف کے بارے میں اللہ سے ڈرتا رہے۔''
(ذکرہ السخاوی فی المقاصد الحسنۃ، رقم: ۱۰۹۸، تحقیق شعب الایمان، رقم: ۹۴۸۹، تفسیر قرطبی زیر آیت سورۃ الرعد ۳۸)

رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے بھی نکاح کی ترغیب دی گئی۔ فرمایا
﴿تناکحوا، تکثروا فانی مباہ بکم الامم یوم القیامۃ﴾
''نکاح کرو اور کثرت سے اولاد پیدا کرو تاکہ میں قیامت کے روز دوسری امتوں پر فخر کر سکوں۔''

(معرفۃ السنن والآثار للبیہقی ۱۰/۱۷، رقم: ۱۳۳۲۹)

نکاح کا مقصد چونکہ نسل انسانی کی افزائش ہے، اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ ''بچے دو ہی اچھے'' نعرہ کے سخت خلاف ہیں۔ آپ زیادہ اولاد پیدا کرنے کو پسند فرماتے ہیں۔ اور ایسی عورت کو آپ نے پسند فرمایا جو زیادہ اولاد پیدا کرے۔ چنانچہ سیدنا معقل

بن یسار بیان فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے بارگاہِ نبوت میں حاضر ہو کر عرض کیا: ''یا رسول اللہ! مجھے ایک عزت والی، مال دار اور منصب والی عورت مل رہی ہے لیکن وہ بانجھ ہے یعنی اس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی، کیا میں اس سے نکاح کر لوں؟ آپ ﷺ نے اس کو منع فرمایا۔ وہ پھر آیا تو آپ ﷺ نے اس کو پھر منع کیا۔ پھر وہ تیسری بار آیا تو آپ نے فرمایا:

''محبت کرنے والی اور بچے دینے والی عورت سے نکاح کرو کیونکہ میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔''

(سنن ابوداود، رقم: ۲۰۵۰، سنن نسائی، رقم: ۳۲۲۷، مستدرک حاکم: ۲/۱۶۲)

حریت نکاح:

اسلام نے نکاح اور شادی کے معاملہ میں مسلمانوں کو پوری پوری آزادی دی ہے۔ مرد کو یہ آزادی دی کہ جس عورت سے چاہے وہ شادی کر سکتا ہے اور عورت کو قبولیت نکاح کی آزادی دی کہ اگر وہ کسی شخص کی نکاح کی پیشکش کو قبول نہ کرنا چاہے تو کوئی اسے مجبور نہیں کر سکتا۔

پھر اسلام نے مرد کو چار شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے بشرطیکہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ عدل و انصاف سے کام لے سکے اور امور معیشت میں ان سے ایک جیسا سلوک کر سکے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

''اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ تم یتیم لڑکیوں میں انصاف نہ کر سکو گے پس تمہیں جو عورتیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو دو دو سے تین تین سے اور چار چار سے، پس اگر تمہیں یہ خدشہ ہو کہ تم (ان میں) عدل نہ کر سکو گے تو (صرف) ایک سے نکاح کرو یا اپنی مملوکہ کنیزوں سے استمتاع کرو، اس سے زیادہ قریب (بہ صحت) ہے۔'' (النساء: ۳)

ایک اشکال اور اس کا حل:

بعض حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام میں چار بیویوں کی اجازت دی

گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلام نے چار بیویوں پر اکتفا کی اجازت دی ہے ورنہ اسلام سے پہلے تو لوگوں کی چار سے بہت زیادہ بیویاں ہوتی تھیں۔ اسلام نے ان کو کم کر کے چار کر دی ہیں اور ان کے ساتھ بھی شرط عدل عائد کر دی ہے۔ چنانچہ غیلان بن سلمہ ثقفی اسلام لائے تو ان کی زوجہ جاہلیت میں دس بیویاں تھیں۔ وہ بھی اس کے ساتھ مسلمان ہو گئیں، تو ان کو رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ وہ ان میں سے چار کو انتخاب کر لیں۔

(سنن ترمذی، رقم ۱۱۳۱، ابن ماجہ، رقم ۱۹۵۳، ابن حبان: ۴۶۳/۹، سنن کبریٰ بیہقی: ۱۸۱/۷)

اور قیس بن حارث بیان کرتے ہیں کہ جب میں مسلمان ہوا تو میری آٹھ بیویاں تھیں۔ میں نے بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر اس کو بیان کیا تو نبی ﷺ نے فرمایا، ان میں سے چار کو اختیار کر لو۔

(سنن ابن ماجہ، رقم: ۱۹۵۲، ابوداود: ۲۲۴۲، سنن کبریٰ بیہقی: ۱۸۳/۷، معجم صغیر: ۵۱/۳)

اسلام میں ایک سے زائد شادیوں کے لیے عدل کی شرط نہ صرف قرآن حکیم میں ہے بلکہ احادیث میں بھی ہے۔ اس لیے ایک سے زائد بیویاں رکھنا اور ان میں عدل نہ کرنا قابل مواخذہ ہے، گناہ کی بات ہے، اور ایک مسلمان کے لیے گناہ کی بات ہونا ہی ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ قاضی ابوبکر بن العربی نے لکھا ہے:

"ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں چند بیویوں کے حقوق نہ ادا کرنے کی اور سب کے ساتھ مساویانہ اور عدل پر مبنی برتاؤ نہ کر سکنے کا خطرہ ہو تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو۔ کیونکہ سب کے ساتھ یکساں سلوک کرنا فرض ہے، اور شرعی احکام ظاہری حالات کے اعتبار سے متعلق ہوتے ہیں کیونکہ یہی بات ہر ذی عقل کے لیے آسان ہے۔ اس اصل کا تقاضا یہ ہوا کہ جو شخص بھی بظاہر جسمانی قوت اور مالی وسعت اتنی رکھتا ہے جس سے چار بیویوں کے پورے حقوق ادا کر سکے، اسی کو اجازت ہے کہ وہ ایسا کرے، اور جو جسمانی قوت اور مالی اعتبار سے اس کا تحمل نہیں کر سکتا اسے صرف اس تعداد پر اکتفا کرنا چاہیے جس کا وہ بآسانی تحمل کر سکتا ہو۔"

(احکام القرآن ۱/۳۱۰)

اسلام نے عورت کو بھی پوری آزادی دی ہے اور ان کی مرضی کے خلاف نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کسی بیوہ عورت کی مرضی کے خلاف اس کا نکاح نہ کیا جائے اور دوشیزہ (کنواری) عورت کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح نہ کیا جائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! اس کے اذن کی کیفیت کیا ہوگی؟'' فرمایا: ''اس کا چپ رہنا ہی اس کی اجازت ہے۔''

(ترمذی: ۳/ ۲۹۷، ابن ماجہ: ۱/ ۳۴۴، مسلم، باب استیذان الثیب بالنطق)

ایک اور روایت میں فرمایا: ''وہ عورت جو شوہر دیکھ چکی ہے (ثیب) وہ بذات خود ولی سے زیادہ حق دار ہے، اور کنواری سے اس کا باپ اجازت حاصل کرے، اور اس کی اجازت اس کا چپ رہنا ہے۔''

(مسلم، باب استیذان الثیب فی النکاح بالنطق والبکر بالسکوت)

احادیث کے الفاظ کا لب ولہجہ یہ بتا رہا ہے کہ عورتوں کو شادی کے باب میں بالکل مختار اور آزاد بنایا گیا ہے نہ کہ مسلوب الاختیار۔ معلوم ہوا کہ عورت کی رضا حاصل کیے بغیر اس کی شادی کسی مرد سے نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ ولی کا فریضہ ہے کہ پہلے وہ بالغہ سے رضا حاصل کرے پھر وہ کسی مرد سے اس کی شادی کی بات چیت کرے۔ حد یہ ہے کہ لڑکی کا والد جو لڑکی کے حق میں سراپا رحیم وشفیق ہوتا ہے اس کو بھی رسول اللہ ﷺ حکم دے رہے ہیں کہ وہ لڑکی کی رائے معلوم کرے، لیکن اسلام نے جہاں لڑکی کی رضا اور اجازت کو ضروری قرار دیا ہے وہاں لڑکی کی حیا اور شرم کو بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ اور لڑکی کے سکوت اور اس کی خاموشی کو بھی اجازت کا درجہ دے دیا، اگر وہ کنواری اور دوشیزہ ہے، البتہ اگر ثیبہ ہے تو پھر اس کی صراحتاً اجازت کی ضرورت ہے۔ استیمار اور استیذان سے اسی طرف اشارہ ہے۔

حدیث میں ہے کہ سیدہ خنساء بنت خذام رضی اللہ عنہا کے باپ نے کسی شخص سے ان کی شادی کر دی۔ سیدہ خنساء کو یہ رشتہ پسند نہ آیا۔ وہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی۔ رحمت عالم ﷺ نے سیدہ خنساء کی عرض داشت قبول فرمالی اور اس کے باپ کے کیے ہوئے نکاح کو رد کر دیا۔ (بخاری، باب اذا زوج ابنتہ وھی کارہۃ)

اسی قسم کا ایک اور واقعہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے کہ ایک دوشیزہ عورت سرکار دو عالم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میرے باپ نے جس شخص سے میری شادی کر دی ہے، وہ مجھے پسند نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کو اختیار دے دیا۔ جی چاہے نکاح باقی رکھو، جی چاہے رد کر دو۔

(ابن ماجہ، باب من زوج ابنتہ وھی کارھۃ اخرجہ ایضا ابوداؤد والنسائی فی الکبریٰ فی النکاح، شرح السنۃ بغوی: ۹/۳۳، مسند احمد: ۱/۲۷۳، تاریخ بغداد: ۸/۸۹)

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ابن بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک نوجوان عورت دربار نبوی میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میرے والد نے میری شادی میرے چچا زاد سے کر دی ہے جو مجھے پسند نہیں ہے۔ اس عورت کی اس رشتے سے ناگواری سن کر آپ ﷺ نے معاملہ عورت کے ہاتھ میں دے دیا کہ تم کو اس نکاح کے رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار ہے۔ عورت نے لسان نبوت سے یہ بات سن کر اطمینان کی سانس لی اور عرض کی کہ میرے ماں باپ نے جو کچھ کیا میں اس کی اجازت دے چکی ہوں، لیکن اس وقت سوال کرنے اور آپ ﷺ سے جواب حاصل کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں عورتوں کو بتا دوں کہ باپ کے ہاتھ میں یہ نہیں ہے کہ ایک بالغ لڑکی کی رضا حاصل کیے بغیر اس کی شادی کر دے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

﴿ولکن اردت ان تعلم النساء ان لیس الی الآباء من الامر شیء﴾

"لیکن میں نے عورتوں کو یہ بتا دینا چاہا کہ باپ دادا کے ہاتھ میں نکاح کے معاملہ میں کچھ نہیں ہے۔"

(ابن ماجہ، رقم: ۱۸۷۳، قال البوصیری: ھذا اسناد صحیح، رجالہ ثقات، رواہ البخاری وغیرہ من حدیث عبدالرحمن بن یزید ومجمع بن یزید، وھو فی السنن الاربعۃ من حدیث ابن عباس، وفی سنن النسائی الصغری والحاکم، والبیھقی من حدیث عائشۃ)

عبدالرحمن بن یزید اور مجمع بن یزید ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے

جو خدام کے نام سے مشہور تھا، اپنی لڑکی کی شادی کی۔ اس کی لڑکی کو یہ رشتہ پسند نہ آیا، چنانچہ وہ بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئی اور اس نکاح کی ناپسندیدگی کا تذکرہ کیا۔ چنانچہ آپ نے اس کے باپ کے کیے ہوئے نکاح کو باطل قرار دے دیا، اور پھر اس عورت نے ابو لبابہ بن عبدالمنذر سے شادی کر لی۔

(والحدیث اخرجہ ایضاً مالک والبخاری وابوداؤد والنسائی فی المجتبیٰ وفی الکبریٰ فی النکاح وابن ماجہ، رقم الحدیث: ۱۸۷۳، سنن الدارمی ۲/۶۳، سنن کبریٰ بیہقی: ۷/۳۲، ابن ابی شیبہ: ۴/۱۲۰، شرح السنۃ: ۹/۳۳، مسند احمد: ۶/۳۲۸)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ بالغہ عورت کو شادی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ضرور فلاں مرد سے شادی کرے بلکہ اس کو شوہر کے انتخاب میں پورا حق اور اختیار دیا گیا ہے۔

پھر اسلام نے یہ بھی اجازت دی کہ مرد نکاح سے قبل اپنی ہونے والی بیوی کو ایک نظر دیکھ لے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا:

''تم میں سے جب کوئی کسی عورت کو پیام نکاح دے، اور وہ اس چیز کے دیکھنے پر قدرت رکھتا ہو جو اس عورت کے نکاح کی طرف داعی ہو، تو اس کو ایسا کرنا چاہیے۔'' (رواہ ابوداؤد، مشکوٰۃ کتاب النکاح)

معلوم ہوا کہ مہذب اور ترقی یافتہ طریقہ پر نکاح سے قبل ہونے والی بیوی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ سے اپنی شادی کا تذکرہ کیا۔ آپ نے فرمایا تو نے اسے دیکھ لیا۔ سیدنا مغیرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''نہیں، یا رسول اللہ!'' یہ سن کر پیغمبر انسانیت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿فانظر الیها فانّه احری ان یودم بینکما﴾

''اس عورت کو دیکھ لو، اس لیے کہ یہ باہمی تعلقات کی استواری کے مناسب ہے۔'' (سنن الترمذی ۳/۱۰۸۷، ابن ماجہ ۱/۳۳۳)

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ ''ان یودم بینکما'' کا مطلب ہے کہ تم میں پائیدار محبت رہ سکے۔

اسی سلسلہ میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک

شخص سے جس نے کسی عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کیا تھا، پوچھا: کیا تو نے اس کو دیکھ لیا ہے؟'' اس نے عرض کیا نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿اذهب فانظر اليها فان في اعين الانصار شيئا﴾

(مسلم: ۱/۴۵۶)

''جاؤ اس عورت کو دیکھ لو کیونکہ انصار کی آنکھوں میں کچھ (عیب) ہے۔''

امام نوویؒ نے اس حدیث کے ضمن میں لکھا ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جس عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کیا جائے اس کو دیکھنا مستحب ہو۔ یہی مذہب امام شافعیؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ اور جمہور علماء کا ہے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو نووی شرح مسلم: ۱/۴۵۶۔۴۵۷)

اور محمد بن مسلمہ ؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اذا القى الله فى قلب امرأ خطبة امرأة فلا بأس ان ينظر اليها﴾

(سنن ابن ماجہ رقم: ۱۸۶۴، سنن سعید بن منصور: ۵۱۹، معانی الآثار طحاوی: ۲/۱۳)

علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

''فقہاء نے کہا ہے کہ جس عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے اس کو دیکھنا جائز ہے تاکہ معاملہ فساد برپا نہ کرے، اور یہ بھی کہا ہے کہ دیکھتے وقت نیت میں خلوص ہو، پھر معاملہ اللہ کے سپرد کر دے۔''

پھر اسلام نے اس بات کی بھی ہدایت کی کہ نکاح کا اعلان کیا جائے اس کو مخفی نہ رکھا جائے چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اعلنوا النكاح، واضربوا عليه بالدف﴾

''نکاح کا اعلان کرو اور اس پر دف بجاؤ۔''

(ترمذی: ۲/۳۹۸، ابن ماجہ: ۱/۴۵۰)

ایک روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں:

﴿فصل بين الحلال والحرام، الدف والصوت في النكاح﴾
''حلال اور حرام کے مابین فرق یہ ہے نکاح میں دف بجانا اور اعلان کرنا ہوتا ہے۔''
(سنن ابن ماجہ، رقم:۱۸۹۶، اخرجہ ایضاً الترمذی والنسائی فی المجتبیٰ وفی الکبریٰ فی النکاح، سنن کبریٰ بیہقی: ۷/۲۸۹، شرح السنۃ: ۹/۴۷، مستدرک حاکم: ۲/۱۸۴، مسند احمد: ۳/۴۰۸)

حریت نکاح پر قیود:

اسلام نے نکاح کرنے کو بالکل آزاد نہیں چھوڑ دیا کہ جس عورت سے چاہو شادی کرلو، اور محرم اور غیر محرم کا کوئی امتیاز نہ رہے جیسا کہ جاہلیت میں ہوتا تھا کہ محرمات سے نکاح کر لیتے تھے، چنانچہ خسرو پرویز نے اپنی حقیقی بیٹی کو اپنی زوجیت میں رکھا ہوا تھا اور پھر اسے قتل کر دیا۔ (طبری: ۱/۵۰۹)

بہرام چوبین نے اپنی سگی بہن سے اپنا ازدواجی تعلق رکھا ہوا تھا۔ (طبری: ۱/۵۰۹)

مشہور چینی سیاح ہوئن سیانگ کا بیان ہے کہ ایرانی قانون معاشرت میں ازدواجی تعلقات کے لیے رشتہ کا بھی استثناء نہ تھا، گویا کہ ماں، بہن اور بیٹی ان سب سے ازدواجی تعلقات قائم کرنا ایرانی معاشرت کا ایک اصول تھا۔ (ایران بعہد ساسانیاں: ص ۴۳۰)

گویا ایرانی ذہن وفکر میں اس قدر انقلاب آچکا تھا کہ حلال وحرام کا تصور ذہنوں سے بالکل ختم ہو گیا تھا۔ پروفیسر آرتھر لکھتا ہے:

''ایران کے عیسائیوں نے بھی زردشتیوں کی دیکھا دیکھی محرمات کے ساتھ کے ساتھ شادی کرنے کے فعل بد کو اپنا لیا حالانکہ ان کی شریعت میں یہ فعل حرام تھا۔'' (ایران بعہد ساسانیاں: ص ۵۷۱)

موجودہ جاہلیت میں بھی اس معاملہ میں امریکہ اور یورپ میں مادر پدر آزادی ہے۔ ماں بیٹے سے اور باپ بیٹیوں سے ازدواجی تعلقات قائم کیے ہوئے ہیں۔ اسلام نے اس جنسی بے راہ روی پر قدغن لگائی اور ان رشتوں کا ذکر فرمایا ہے جن

سے ازدواجی تعلقات قائم رکھنا حرام ہیں۔ ان میں سے کچھ کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء میں کیا ہے فرمایا:

''تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں، اور تمہاری بہنیں، اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں، اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور تمہاری رضاعی (دودھ شریک) بہنیں، اور تمہاری بیویوں کی مائیں، اور تمہاری ان بیویوں کی بیٹیاں جن سے تم صحبت کر چکے ہو، اور اگر تم نے ان بیویوں سے صحبت نہ کی ہو تو (ان کی بیٹیوں سے نکاح کرنے میں) تم پر کوئی گناہ نہیں، اور تمہارے نسلی بیٹوں کی بیویاں، اور (تم پر حرام کیا گیا ہے) یہ کہ تم دو بہنوں کو (نکاح میں) جمع کرو، مگر جو گزر چکا، بے شک اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم کرنے والا ہے۔ اور (تم پر حرام کی گئیں) وہ عورتیں جو دوسروں کے نکاح میں ہوں مگر (کافروں کی) جن عورتوں کے تم مالک بن جاؤ، یہ حکم اللہ نے تم پر فرض کیا ہوا ہے، اور ان کے علاوہ وہ سب عورتیں تم پر حلال کی گئیں ہیں کہ تم اپنے مال (مہر) کے عوض ان کو طلب کرو، درآں حالیکہ تم ان کو قلعہ نکاح کی حفاظت میں لانے والے ہو نہ کہ محض عیاشی کرنے والے ہو، پھر جن عورتوں سے (نکاح کرکے) تم نے مہر کے عوض لذت حاصل کی ہے تو ان عورتوں کو ان کا مہر ادا کردو۔ (یہ اللہ کا کیا ہوا) فرض ہے، اور مہر مقرر کرنے کے بعد جس (کمی بیشی) پر تم باہم راضی ہو گئے اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بے شک اللہ خوب جاننے والا بہت حکمت والا ہے۔'' (النساء: ۲۳-۲۴)

پھر اسلام نے پھوپھی اور بھتیجی اور خالہ اور بھانجی کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لا یجمع بین المرأۃ و عمتہا، ولا بین المرأۃ و خالتہا﴾

(بخاری، رقم: ۵۱۰۹، مسلم، رقم: ۱۴۰۸، اخرجہ ایضاً ترمذی والنسائی فی النکاح، ابن ماجہ: ۱۹۲۹، مصنف عبدالرزاق ۹/۲۶۱، سنن کبریٰ بیہقی: ۷/۱۶۵، مسند احمد: ۲/۴۳۲، معجم صغیر طبرانی: ۱/۸۸)

''عورت اور اس کی پھوپھی، اور عورت اور اس کی خالہ ایک نکاح میں جمع نہ کی جائیں۔''

اسلام نے ایک پابندی یہ لگائی کہ مسلمان عورتیں مشرک مردوں سے اور مسلمان مرد مشرک عورتوں سے شادی نہ کریں۔ (سورۃ البقرۃ ۲۲۱)

اسی طرح مردوں کا مردوں سے نکاح بھی حرام قرار دیا گیا۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

''اور ہم نے لوط کو بھیجا جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ایسی بے حیائی کرتے ہو جو تم سے پہلے اس دنیا والوں میں سے کسی نے نہیں کی۔ بے شک تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس نفسانی خواہش کے لیے آتے ہو بلکہ تم تو (حیوانوں کی) حد سے (بھی تجاوز کرنے والے ہو۔'' (الاعراف: ۸۱)

لواطت کے اس فعل میں اخلاقی اور شرعی طور پر بہت سی قباحتیں ہیں جن کو طوالت کی وجہ سے یہاں ذکر نہیں کیا جا رہا۔ قرآن نے اس فعل کی مختلف سورتوں میں سخت مذمت کی ہے۔

حدیث میں بھی اس فعل کی سخت مذمت کی گئی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جن لوگوں کو تم قوم لوط والا عمل کرتے ہوئے پاؤ تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو۔''

(سنن ابوداؤد: ۴۴۶۲، سنن ترمذی: ۱۴۵۶، ابن ماجہ، رقم: ۲۵۶۱، سنن کبری نسائی: ۴/۳۲۲، سنن دارقطنی: ۳/۱۲۴، سنن کبری بیہقی: ۸/۲۳۱، معرفۃ السنن والآثار: ۶/۳۵۰، مستدرک حاکم: ۴/۳۵۵، شرح السنۃ بغوی: ۱۰/۳۰۸، مسند احمد ۱/۳۰۰، مسند ابی یعلی: ۴/۳۴۸، معجم کبیر طبرانی ۱۱/۲۱۲)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''مجھے اپنی امت پر جس چیز کا سب سے زیادہ خوف ہے، وہ قوم لوط کا عمل ہے۔''

(سنن ترمذی، رقم: ۱۴۶۳، سنن ابن ماجہ: ۲۵۶۳، مستدرک حاکم ۴/۳۵۷، مسند احمد: ۳/۳۸۲، مسند ابی یعلی: ۴/۹۷)

سیدنا جابر بن عبداللہ ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اور جب قوم لوط کا عمل کرنے والے بکثرت ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنا دست رحمت مخلوق سے اٹھا لے گا، پھر وہ کوئی پروا نہیں کرے گا کہ وہ کس وادی میں ہلاک ہوتے ہیں۔'' (المعجم الکبیر طبرانی، رقم: ۲۷۵۵، مجمع الزوائد: ۲۵۵/۴)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس مرد کی طرف نظر رحمت نہیں فرماتا جو کسی مرد سے جنسی خواہش پوری کرے یا عورت سے عمل معکوس کرے۔'' (سنن ترمذی، رقم: ۱۱۶۸، ابن حبان، رقم: ۴۱۹۱)

جس طرح مرد کی مرد سے جنسی خواہش پوری کرنا حرام قرار دیا گیا، اسی طرح ایک عورت کا دوسری عورت سے جنسی خواہش پوری کرنے کو بھی حرام قرار دیا گیا۔ اس کو ''سحاق'' کہتے ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اذا اتى الرجل الرجل فهما زانيان، واذا اتت المرأة المرأة فهما زانيان﴾

''جب کوئی مرد کسی دوسرے مرد کے پاس (جنسی خواہش کے لیے) جاتا ہے تو وہ دونوں زانی ہیں اور جب کوئی عورت اس غرض سے کسی دوسری عورت کے پاس جاتی ہے تو وہ بھی دونوں زانی ہیں۔''

(اخرجه البیہقی من حدیث ابی موسیٰ، وانظر نیل الاوطار للشوکانی عند شرح الحدیث، رقم: ۳۱۲۲)

اسی طرح اسلام نے عورت کی دبر میں وطی کو حرام قرار دیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لاينظر الله الى رجل ياتى امرأته فى دبرها﴾

''اللہ تعالیٰ اس آدمی کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا جو اپنی عورت کی دبر میں وطی کرتا ہے۔''

(سنن ابن ماجہ، رقم: ۱۹۲۳، معرفۃ السنن والآثار بیہقی: ۳۲۷/۵، شرح السنۃ بغوی: ۱۰۶/۹، مسند احمد: ۲۷۲/۲، اتحاف السادۃ المتقین: ۲۷۵/۵، کنز العمال: ۳۵۲/۱۶)

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص حیض والی عورت کے پاس جائے یا عورت کی دبر میں وطی کرے یا کسی کاہن کے پاس جائے اور جو وہ کہے اس کی تصدیق کرے، اس نے اس چیز کا انکار کیا جو محمد ﷺ پر نازل کیا گیا ہے۔'' (ابوداؤد، رقم: ۳۹۰۴)

اسلام نے اس بات کی بھی قید لگادی کہ کوئی عورت اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے۔ چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا:

''جو عورت اپنے ولی کی اجازت کے بغیر اپنا نکاح کرے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے۔'' (ابوداؤد ۲/۳۹۳)

یہ قید بھی شریعت نے لگائی کہ کوئی شخص اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی نہ کرے۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لا یخطب الرجل علی خطبة اخیه﴾

''کوئی شخص اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی نہ کرے۔''

(رواہ البخاری ۸/۱۵۹، رقم: ۲۲۹۴، و مسلم ۲/۱۰۵۲)

مسلمان کے لیے یہ ضروری قرار دیا کہ وہ صرف عورت کی خوبصورتی، حسن و جمال، مال و دولت اور خاندانی وجاہت ہی کو نہ دیکھے بلکہ اس کے دین اور سیرت کی طرف خصوصی توجہ دے، کیونکہ حسن سیرت اور دین ہی ہمیشہ رہنے والی چیزیں ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''عورت سے چار چیزوں کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے، دولت، خاندانی وجاہت، حسن و جمال اور دینداری، تم دین دار عورت سے نکاح کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تمہارے ہاتھ گرد آلود ہوں۔''

(بخاری، رقم: ۵۰۹۰، مسلم: ۲۲۶، سنن الدارمی: ۲/۳۳، ابن حبان: ۹/۳۴۲، شرح السنۃ: ۹/۷، مسند احمد: ۲/۴۲۸)

ایک دین دار عورت کی کچھ معنوی صفات بھی حضور ﷺ نے بیان فرمائیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ مفید، نفع بخش اور باعث خیر و برکت نیک بیوی ہے کہ جب اس سے کسی نیک کام کے لیے کہے تو وہ اس کام کو خوش دلی سے انجام دے، اور جب وہ اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے، اور جب وہ اس کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھے تو اس کی قسم پوری کر دے، اور جب وہ کہیں چلا جائے تو وہ اس کے پیچھے اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کرے اور شوہر کے مال ومتاع کی نگرانی میں شوہر کی خیر خواہ اور وفادار ہو۔''

(ابن ماجہ، رقم: ۱۸۵۷، معجم کبیر طبرانی: ۸/۲۹۳، کنز العمال: ۱۶/۲۷۲)

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم ﷺ سے پوچھا گیا: ''بہترین عورت کون سی ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿الّتي تسره اذا نظر، وتطيعه اذا امر، ولا تخالفه في نفسها ومالها بما يكره﴾

''جسے دیکھ کر شوہر کو خوشی حاصل ہو، اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کرے، اور کوئی ایسا کام نہ کرے جو اسے ناپسند ہو، اور اس کے مال کو ایسی جگہ خرچ نہ کرے جہاں اس کی مرضی نہ ہو۔'' (نسائی، رقم: ۳۲۳۳)

مندرجہ بالا ارشادات میں بتایا گیا کہ کس قسم کی عورت مرد کو سکون و قرار عطا کرتی ہے۔ اور زوجیت کی آغوش اور نوخیز نسل کی گود میں بشاشت، سکون وچین اور خوشی اور مسرت انڈیل سکتی ہے۔ مزاجوں کے اختلاف کی وجہ سے یہ رشتہ کمزور ہو جاتا ہے، اس کی قوت مزاجوں کی موافقت اور توازن میں ہے جو ایک دین دار عورت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جس کا دین اور اخلاق تمہیں پسند آجائے اس سے اپنی بچیوں کی شادی کر دو۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور فساد کبیر برپا ہوگا۔''

(رواہ الترمذی: ۳/۳۹۴، ۳۹۵، برقم: ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ابن ماجہ، رقم: ۱۹۶۷، مع اختلاف فی الالفاظ، مستدرک حاکم: ۲/۱۶۴، کنز العمال: ۱۶/۳۱۷)

حرمت مسکن:

اسلام نے نہ صرف اسلامی رشتوں کا احترام کیا ہے بلکہ اس مکان اور مسکن کی حرمت کا بھی لحاظ رکھا ہے جس میں انسان قیام کرتا ہے، خواہ اس کا قیام وہاں وقتی ہو یا دائمی، اور انسان کا مسکن وہ ہے جو اس کو سردی اور گرمی سے محفوظ رکھتا ہے، لوگوں کی نگاہوں سے اس کی حفاظت کرتا ہے، اور جہاں وہ اپنے بال بچوں اور دیگر گھر والوں کے ساتھ زندگی کے دن گزارتا ہے۔

اسلام کا ایک کلی اصول ہے۔ "لا ضرر ولا ضرار" یعنی نہ کسی کو کوئی تکلیف دی جائے اور نہ دوسرا اس کو کوئی تکلیف دے۔ لہذا آدمی جہاں رہتا ہے وہ اپنے کسی اڑوسی پڑوسی یا کسی اور متعلقہ آدمی کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ دے۔

اسلام نے یہ بھی بتایا کہ کسی کے گھر میں بغیر اس کی اجازت کے داخل نہ ہو۔ یہ اس مسکن اور مکان کی حرمت ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

> "اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوؤ، جب تک اجازت نہ لے لو، ور گھر والوں پر سلام نہ کرو، یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ اور اگر تم ان گھروں میں کسی کو نہ پاؤ تو ان میں داخل نہ ہوؤ حتیٰ کہ تمہیں اجازت دے دی جائے، اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو تم واپس چلے جاؤ (یہ واپس چلے جانا) تمہارے لیے بہت پاکیزہ ہے، اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کو خوب جاننے والا ہے۔"

(النور ۲۷۔۲۸)

حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے لوگوں کے قلوب میں گھر بنانے کا خیال ڈالا گیا، اور یہ کہ وہ اپنے گھروں کو مستور رکھیں، پھر ان کو اپنے گھروں میں سامان رہائش فراہم کرنے کی توفیق ارزانی فرمائی اور پھر ان کے گھروں کی حفاظت کے لیے ایسے احکام شرعیہ نازل فرمائے جن سے ان کے گھروں کی حرمت بھی لوگوں کے دلوں میں قائم ہو اور ان کے گھر محفوظ بھی ہو جائیں۔ چنانچہ فرمایا کہ کوئی شخص دوسرے کے گھر میں اس کی

اجازت کے بغیر داخل نہ ہوتا کہ مستورات اور اس کا قیمتی ساز وسامان اس کی پوشیدہ چیزیں (جن کو لوگوں کی نگاہوں سے مخفی رکھنا چاہتا ہے) اور مخفی خزانے دوسرے لوگوں کی نگاہوں اور دست برد سے محفوظ رہ سکیں۔

اس آیت میں "تستانسو" کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں حتی کہ تم مانوس ہو جاؤ۔ اور آیت میں یہ لفظ "تستاذنوا" کے معنی میں ہے کیونکہ جب کوئی شخص اجازت لینے کے بعد کسی کے گھر میں داخل ہوتا ہے تو وہ گھر والوں سے مانوس ہو جاتا ہے۔

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں انصار کی ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ خوف زدہ حالت میں آئے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے تین مرتبہ اجازت طلب کی، مجھے اجازت نہیں دی گئی تو میں واپس آ گیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تم کیوں چلے گئے تھے؟ میں نے کہا: میں نے تین مرتبہ اجازت طلب کی تھی۔ مجھے اجازت نہیں دی گئی تو میں واپس چلا گیا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جب تم میں سے کوئی شخص تین مرتبہ اجازت طلب کرے اور اس کو اجازت نہ دی جائے تو وہ واپس چلا جائے۔'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! تم ضرور اس حدیث پر کوئی گواہی پیش کرو گے؟ پس کیا تم میں سے کوئی شخص ہے جس نے نبی ﷺ سے یہ حدیث سنی ہو؟'' سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! مسلمانوں میں سے سب سے کم عمر شخص اس حدیث کی شہادت دے گا، سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں سب سے کم عمر تھا، میں ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو خبر دی کہ بے شک نبی ﷺ نے اس طرح فرمایا تھا۔''

(بخاری، رقم: ۶۲۴۵، مسلم، رقم: ۲۱۵۳، سنن الترمذی، رقم: ۲۶۹۰، ابوداود، رقم: ۵۱۸۰، سنن ابن ماجہ: ۳۷۰۶، مسند احمد، رقم: ۱۹۸۳۰، سنن الدارمی، رقم: ۲۶۳۴، مصنف عبدالرزاق، رقم: ۱۹۴۲۳، ابن حبان، رقم: ۵۸۱۰ وغیرہ)

قیس بن سعد بیان فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ ہم سے ملاقات کے لیے تشریف لائے اور آپ نے فرمایا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے نہایت آہستہ سے جواب دیا۔ قیس کہتے ہیں: میں نے سیدنا سعد رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا آپ رسول

اللہ ﷺ کو جازت نہیں دیتے؟ انہوں نے کہا: "رہنے دو، وہ ہم کو زیادہ دفعہ سلام کریں گے۔" رسول اللہ ﷺ نے پھر فرمایا: "السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ سیدنا سعد ؓ نے پھر بہت آہستہ سے جواب دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے پھر فرمایا: "السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔" پھر رسول اللہ ﷺ لوٹ گئے اور سعد ؓ آپ کے پیچھے گئے اور کہا: "یارسول اللہ! میں نے آپ کا سلام سن لیا تھا اور آپ کو قصداً آہستہ جواب دیا تا کہ آپ زیادہ بار سلام کریں۔ تب رسول اللہ ﷺ ان کے ساتھ چلے گئے۔ (سنن ابی داؤد، رقم: ۵۱۸۵)

گھر میں بغیر اجازت داخل ہونا تو بہت بڑی بات ہے، اسلام نے تو کسی کے گھر میں جھانکنے کی بھی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ سیدنا ابوہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اگر کوئی شخص بغیر اجازت کے تمہارے گھر میں جھانکے اور تم لاٹھی سے اس کی آنکھ پھوڑ دو تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔"

(بخاری، رقم: ۶۹۰۲، مسلم، رقم: ۲۱۵۸، مسند احمد، رقم: ۲۱۱۷، سنن نسائی، رقم: ۴۸۶۱)

اس سلسلہ میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے کہ اگر گھر کا دروازہ بند ہو تو اس کی جھریوں میں سے اندر جھانکنا ممنوع ہے، اور اگر گھر والے نے جھانکنے والی کی آنکھ تیر یا کسی لکڑی سے پھوڑ دی تو اس پر قصاص یا دیت نہیں ہے۔" (فتح الباری، ۱۴/ ۲۳۸)

علامہ عینیؒ نے فرمایا ہے کہ "جھانکنے والے کی آنکھ پھوڑنے کی اجازت اس صورت کے ساتھ مخصوص ہے جب وہ کسی کے گھر میں قصداً جھانکے، اور اگر اس کی اتفاقاً نظر پڑ جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔" (عمدۃ القاری: ۲۲/ ۲۳۹)

جب اسلام نے بغیر اجازت گھروں میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی تو مسلمانوں کو یہ مشکل پیش آئی کہ مدینہ سے مکہ کے راستہ میں مختلف جگہوں پر رفاہ عام اور مسافروں کی سہولت کے لیے کچھ مکان اور رباط بنے ہوئے تھے جن میں راہ جاتے مسافر عارضی قیام کرتے تھے۔ ان سرائوں، مکانوں اور مسافر خانوں کا کوئی مالک نہیں ہوتا تھا اور نہ وہ کسی شخص کی ملکیت ہوتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی آسانی کے لیے یہ آیت نازل فرمائی جس کے عموم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو عمارتیں کسی خاص شخص یا قوم کی ذاتی ملکیت نہ ہوں، اور وہاں عام لوگوں کو آنے جانے کی ممانعت نہ ہو، اور وہاں

ٹھہرنے اور ان مکانوں کو استعمال کرنے کی عام اجازت ہو جیسے ہوٹل، مسافر خانے، رباط، خانقاہیں اور اس طرح کی دوسری عمارتیں ان میں داخل ہونا بغیر اجازت کے جائز ہے۔ اور جس جگہ داخلہ کی پابندی ہو وہاں داخل ہونے کی جو شرائط مقرر کی گئی ہوں، ان کی پابندی کرنا ضروری ہے۔

پھر اسلام نے یہ بھی پابندی لگادی کہ اگر کسی کے گھر میں اجازت لے کر داخل ہوئے تو نہ تو گھر کی چیزوں کے بارے میں تجسس کرنا ہے اور نہ ہی گھر والوں کی کسی مخفی اور پوشیدہ بات کو سننے کی کوشش کرنا ہے۔ چنانچہ اسلام نے ایک اصولی بات بیان فرمائی ہے:

﴿ایاکم والظن، فان الظن اکذب الحدیث، ولا تحسسوا ولا تجسسوا، ولا تنافسوا، ولا تحاسدوا، ولا تباغضوا، ولا تدابروا، وکونوا عباداللہ اخوانا﴾

"بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، لوگوں کے عیوب کی جستجو نہ کرو، لوگوں کی باتوں کی ٹوہ میں نہ رہو، حرص نہ کرو، آپس میں حسد نہ کرو، آپس میں بغض وعداوت نہ رکھو، اور آپس میں قطع رحمی نہ کرو۔ اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن کر رہو (اللہ کے بندوں کی طرح بھائی بھائی بن کر رہو۔)" (مسلم رقم ۲۵۶۳، بخاری ۶۰۶۴)

کتابوں میں ایک واقعہ مرقوم ہے کہ ایک رات سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ میں گشت فرمارہے تھے۔ آپ نے ایک گھر سے ایک آدمی کے گانے کی آواز سنی۔ آپ دیوار پھاند کر اس کے گھر میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ وہ شخص شراب کا برتن سامنے رکھے گا رہا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو فرمایا: اے دشمن خدا! کیا تو گمان کرتا تھا کہ تیرا یہ گناہ چھپا رہے گا۔ اس آدمی نے کہا "امیر المومنین! جلدی نہ فرمائیں، اگر میں نے ایک گناہ کیا ہے تو آپ نے تین گناہ کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "ولا تجسسوا" کہ کسی کے عیوب کی ٹوہ نہ لگاؤ اور آپ نے ٹوہ لگائی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "واتوا البیوت من ابوابھا" کہ گھروں میں دروازوں کے راستے سے آؤ جب کہ آپ دیوار پھاند کر آئے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستانسوا" کسی کے گھر میں بغیر

اجازت نہ آؤ اور آپ میرے گھر میں بغیر اجازت آئے ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اگر میں تجھے معاف کر دوں تو کیا تو نیکی کی شاہراہ پر گامزن ہو جائے گا؟" اس شخص نے جواب دیا: "میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں پھر یہ کام کبھی نہ کروں گا۔" آپ نے فرمایا: "میں نے تجھے معاف کیا۔" (تفسیر قرطبی ۱۲/۲۱۷، زیر تفسیر: ولا تجسسوا)

حریت مسکن پر قیود:

اگرچہ اسلام حریت مسکن کا قائل ہے لیکن لوگوں کے آرام و راحت کی خاطر اس پر بھی کچھ پابندیاں اور قیود عائد کی گئی ہیں۔ جو کہ حسب ذیل ہیں:

1- مکان مسلمانوں کے گزرنے کے راستہ میں نہ ہو کہ انہیں گزرنے میں دقت ہو یا ان کا راستہ بند ہو جائے، دوسرے یہ کہ وہ قبروں پر نہ بنایا جائے، چنانچہ سیدنا ابو برزہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: "یا نبی اللہ! مجھے کوئی ایسی چیز بتائیں جو میرے لیے انتہائی مفید ہو۔ آپ نے فرمایا:

﴿اعزل الاذی عن طریق المسلمین﴾

(بخاری، رقم: ۲۶۱۹، مجمع الزوائد: ۳/۱۹۱، رقم ۳۳۱۹)

"مسلمانوں کے راستے سے اذیت دینے والی چیزوں کو ہٹا دو۔"

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قبر پر مکان یا قبر کو پکا کرنے سے منع فرمایا۔ (مجمع الزوائد: ۳/۶۱)

2- وہ مکان مشرکین کی اقامت گاہ میں نہ ہو جہاں وہ اپنے دینی شعائر ادا کرنے کی طاقت و استطاعت نہ رکھتا ہو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿انا بری من کل مسلم یقیم بین اظہر المشرکین﴾

"میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکوں کے درمیان مقیم رہے۔"

(رواہ الطبرانی فی الکبیر فی مسند جریر بن عبداللہ، تفسیر ابن کثیر آیۃ ۷۳ من سورۃ الانفال، سنن ابو داؤد، رقم: ۲۶۴۵)

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں ہر اس مسلمان سے بری الذمہ ہوں جو کسی مشرک کے ساتھ دارالحرب میں رہے، اس کے ساتھ ہی آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿لاتراءیا ناراهما﴾

(رواہ ابوداؤد رقم ۲۶۴۵ والنسائی فی القسامت، باب ۲۷)

''ان دونوں قسم کے لوگوں کی آگ میں امتیاز نہیں ہوتا۔''

''لا تراءیا ناراهما'' کے علماء نے کئی معنی لکھے ہیں، ایک یہ کہ ان دونوں کا حکم ایک ہے۔ دوسرا یہ کہ جب اللہ تعالیٰ دارالاسلام اور دارالکفر میں امتیاز پیدا کر دے تو مسلم کو دارالکفر یا دارالحرب میں رہنا جائز نہیں۔ مسلم اور غیر مسلم آبادی میں فرق ہونا چاہیے تاکہ دونوں کی آگ اور اس کا دھواں واضح طور پر نظر آئے نہ یہ کہ مسلم اس میں رہ کر ان کی آگ کا جلنا دیکھا کرے۔ نار کا معنی علامت بھی ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ مسلمان کو کافر سے مشابہت نہ رکھنی چاہیے، ان جیسی چال ڈھال، رفتار و گفتار اور نشست و برخاست اختیار نہ کرے بلکہ ممتاز رہے۔

3۔ مسلمان کا وہ مکان غصب شدہ زمین میں نہ ہو۔ چنانچہ حدیث میں سیدنا زید بن سعید رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

﴿من احیا ارضاً میتة فهی له، ولیس لعرق ظالم حق﴾

(رواہ الترمذی، رقم ۱۳۷۸)

''جو کسی بنجر زمین کو آباد کرے وہ اس کی ہے، اور ظالم رگ کا کوئی حق نہیں ہے۔''

ظالم رگ والے کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک بنجر اور غیر آباد زمین کو آباد کیا۔ اب دوسرے شخص نے زبردستی اس میں زراعت کر دی، تو اس ظالم کا اس زمین میں کوئی حق نہ ہوگا بلکہ اس کی کھیتی اکھاڑ کر پھینک دی جائے گی، اور مالک زمین پر اس کا معاوضہ بھی لازم نہ ہوگا۔ ظالم تو کھیتی کرنے والا تھا مگر مجازاً اس کھیت کو ظالم کہہ دیا جیسے قریۃ ظالمۃ ہے۔

مرد کے حقوق

مرد بشریت کی اصل ہے کیونکہ عورت اس میں سے پیدا کی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے سیدنا آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور ان میں سے ان کی زوجہ سیدہ حوا کو پیدا فرمایا۔ اس وجہ سے مرد کو عورت پر ایک گونہ فضیلت ہے۔ یہ فضیلت اللہ کے فضل اور اس کے احسان سے ہے اور مرد کی پیدائش کی اولیت کی وجہ سے بھی ہے کیونکہ عورت مرد کی فرع ہے اور مرد اس کی ضروریات زندگی کا کفیل ہونے کی وجہ سے اس پر اپنا مال بھی خرچ کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ کی وجہ سے کچھ حق آدمی کے رکھے ہیں اور کچھ عورت کے اور ان کی شایانِ شان دنیا و آخرت میں ان کی تقسیم کی ہے۔ چنانچہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ''یا رسول اللہ! عورت پر سب سے زیادہ کس کا حق ہے؟'' فرمایا: ''اس کے خاوند کا۔'' انہوں نے پھر پوچھا: ''آدمی پر سب سے زیادہ کس کا حق ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کی ماں کا۔''

اسلام نے قریباً ہر شے میں مرد اور عورت کے درمیان مساوات رکھی ہے، البتہ ان چیزوں میں مساوات نہیں ہے جن کی عورت جسمانی اور عصبی طور پر متحمل نہیں ہو سکتی۔ ان امور میں مساوات نہ ہونا اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی حکمت ہے، کیونکہ ان امور میں بھی اگر مساوات ہوتی تو یہ عورت پر ایک بہت بڑا ظلم ہوتا۔

اسلام میں بعض حقوق مردوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور بعض عورتوں کے ساتھ، اور یہ حقوق اس فطرت انسانی کے عین مناسب ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اور مردوں کے وہ مخصوص حقوق حسب ذیل ہیں:

قوام:

اصل بشر تو مرد ہے اور عورت اس میں سے پیدا ہونے کی وجہ سے اس کی فرع ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿یاایها الناس اتقوا ربكم الذی خلقكم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منهما رجالاً كثیراً ونساء﴾ (النساء:۱)

"اے لوگو! اپنے رب سے ڈرتے رہو جس نے تم کو ایک شخص (آدم) سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کی بیوی (حواء) پیدا کی، اور ان دونوں سے بہ کثرت مردوں اور عورتوں کو پھیلا دیا۔"

بتایا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک مرد کو پیدا کیا، پھر اس میں سے اس کی بیوی کو پیدا کیا۔ پھر ان دونوں سے بہت سے انسانوں کو پیدا کیا۔ کیونکہ سرخ، سفید اور سیاہ رنگ میں مختلف ہیں، قد وقامت میں مختلف ہیں، خوبصورتی اور بدصورتی میں مختلف ہیں اور نسل و نسب میں مختلف ہیں، اس کے باوجود سب انسانوں کی بنیادی شکل وصورت اور وضع قطع ایک ہے، اور یہ اس بات کی بین دلیل ہے کہ سب ایک ہی شخص سے پیدا کیے گئے ہیں اور سب اس کی اولاد ہیں۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا مرد کو عورت پر جو فوقیت اور فضیلت حاصل ہے، وہ اس کی کسی اپنی خوبی کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے احسان اور فضل کی وجہ سے ہے، کیونکہ مرد اصل ہے اور عورت فرع اور اصل کو فرع پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ اس میں ایک فضیلت یہ ہے کہ مرد کو قوام بنایا گیا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں فرمایا:

﴿الرجال قوامون علی النساء بما فضل الله بعضهم علیٰ بعض وبما انفقوا من اموالهم﴾ (النساء:۳۴)

"مرد عورتوں کے منتظم اور کفیل ہیں کیونکہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور اس لیے (بھی) کہ مردوں نے ان پر اپنے مال خرچ کیے۔"

اس آیت میں مردوں کو عورتوں پر قوام بتایا گیا اور قوام کا معنی ہے "کسی چیز کو

قائم کرنے والا اور اس کی حفاظت کرنے والا۔" (مفردات ص ۴۱۶)

بعض علماء نے لکھا ہے کہ "مرد عورت کا قوام ہے۔" اس کا مطلب یہ ہے مرد عورت کی ضروریات زندگی پوری کرتا ہے اور اس کا خرچ برداشت کرتا ہے۔

(لسان العرب۔ ۵۰۳/۱۲)

یہاں مراد یہ ہے کہ مرد عورتوں کے امور کا انتظام اور اس کے وجود کو قائم رکھنے والے ہیں۔ چنانچہ علامہ طبری نے لکھا ہے:

﴿صاروا قواماً علیهن نافذ الامر علیهن﴾ (ابن جریر ۵۷/۳)

"یعنی مردوں کو عورتوں پر قوام بنایا گیا کیونکہ وہ ان پر امور نافذ کرنے والے ہیں۔"

یہی بات امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھی ہے۔ (تفسیر کبیر ۸۸/۱۰)

اللہ تعالیٰ نے مردوں کو ایسا کیوں بنایا؟ آیت کے اگلے حصہ میں اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس کا جواب دیا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر حیاتیاتی اور فطری اوصاف میں افضلیت دی ہے۔ (بما فضل الله بعضهم علیٰ بعض) چنانچہ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے:

"اس لیے کہ مردوں کو عورتوں پر فطری فضیلت ہے، اور مرد عورت سے بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبوت مردوں کے ساتھ مختص ہے، اسی طرح سلطنت اور حکومت بھی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "وہ قوم کبھی کامیاب و کامران نہ ہوگی جس نے امور سلطنت عورت کے سپرد کر دیے ہوں۔"

مشہور شیعہ مفسر محمد حسین طباطبائی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ "اس آیت سے مراد یہ نہیں کہ شوہر اپنی بیوی پر قوام ہے بلکہ اس سے مراد عمومیت ہے یعنی جنس مرد جنس عورت پر قوام ہے جس کے اثرات اجتماعی امور پر پڑتے ہیں۔ چنانچہ حکومت اور قضا کے لحاظ سے بھی مرد عورتوں پر قوام ہیں یعنی عورت نہ مردوں پر قاضی ہو سکتی ہے اور نہ ہی حاکم کیونکہ ان عہدوں کے لیے جو صفات اور خصوصیات درکار ہیں وہ صرف مردوں میں ہیں عورتیں ان صفات سے محروم ہیں۔" (المیزان فی تفسیر القرآن: ۳۴۳/۴)

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی قدس سرہ فرماتے ہیں:

"ذاتی طور پر اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر بہت سی باتوں میں فضیلت دی ہے، اور اس فضیلت کا اقتضاء یہی ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم ہوں اور عورتیں ان کی محکوم ہوں۔ حق تعالیٰ نے بہ نسبت عورتوں کے مردوں کو عقل اور علم اور حلم و فہم اور حسن تدبیر اور قوت نظریہ اور قوت عملیہ اور قوت جسمانیہ وغیرہ کچھ زائد عطا کی ہیں، اور نبوت اور خلافت اور بادشاہت اور قضاء وشہادت اور وجوب جہاد، اور جمعہ وعیدین، اور اذان اور خطبہ اور جماعت اور میراث میں حصہ کی زیادتی اور نکاح کی مالکیت اور تعدد ازواج اور طلاق کا اختیار اور بلا نقصان کے نماز اور روزہ کا پورا کرنا اور حیض اور نفاس اور ولادت سے محفوظ رہنا۔ یہ فضائل حق تعالیٰ شانہ نے مردوں ہی کو عطا کیے۔ جسمانی قوت میں عورتیں مردوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، اور ظاہر ہے کہ کمزور اور ناتواں کو قوی اور توانا پر نہ حکومت کا حق ہے اور نہ وہ کر سکتی ہے۔

قضاء وقدر نے عورتوں کی سرشت میں برودت اور نزاکت رکھی ہے اور مردوں میں حرارت اور قوت رکھی ہے۔ اسی وجہ سے فوجی بھرتی، جنگ وجدال اور قتال اور شجاعت و بہادری اور میدان جنگ میں حکومت وسلطنت کے لیے جانثاری اور سرحدوں کی حفاظت اور حکومت کی بقاء کے لیے جس قدر اعمال شاقہ کی ضرورت پڑتی ہے، وہ سب مردوں ہی سے سرانجام پاتے ہیں۔ مرد کی ساخت اور بناوٹ ہی اس کی فضیلت اور فوقیت کا ثبوت دے رہی ہے، اور عورت کی فطری نزاکت اور اس کا حمل اور ولادت اس کی کمزوری اور لاچاری کی کھلی دلیل ہے۔" (معارف القرآن۔ ۲/۳۰۷)

مردوں کے قوام ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عورت کا نان ونفقہ شریعت نے مرد کے ذمہ لگایا ہے، اس لحاظ سے عورت کو مرد کا محتاج بنایا گیا تاکہ انسان کی خاندانی زندگی اچھی رہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کی جنت کی زندگی بیان کرتے ہوئے فرمایا:

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا۔ اس نے انکار کر دیا۔ ہم نے آدم سے کہا کہ یہ (شیطان) آپ کا اور آپ کی بیوی کا دشمن ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ آپ دونوں کو جنت سے نکلوا دے، تو آپ مشقت میں پڑ جائیں گے، بے شک آپ جنت میں نہ بھوکے رہیں گے، اور نہ آپ جنت میں پیاسے رہیں گے اور نہ دھوپ کی تپش محسوس کریں گے۔''

مشقت سے مراد ہے تلاش رزق اور روزی کی طلب میں جدوجہد اور محنت و مشقت کرنا جس کے نتیجہ میں انسان تھکاوٹ میں مبتلا ہوتا ہے۔ اور یہ محنت اور مشقت آیت میں صرف مرد کی طرف منسوب کی گئی ہے یعنی صرف آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے ''ورنہ آپ مشقت میں مبتلا ہو جائیں گے'' (فلا یخرجنکما من الجنة فتشقى) آیت میں ''فتشقى'' فرمایا ''فتشقيا'' نہیں فرمایا، حالانکہ جنت سے دونوں نکالے گئے تھے لیکن شقاوت صرف آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کی گئی، اور یہ شقاوت بدن ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ بے شک آپ کو جنت میں لباس، طعام، پانی اور سایہ (مسکن) ملتا رہے گا اگر آپ نے ہماری اس ہدایت پر عمل اور دشمن شیطان کی اطاعت نہ کی۔ اس سے پتہ چلا کہ بیوی کا نان ونفقہ مرد کے ذمہ ہے یعنی اس کا کھانا پینا، لباس، اور اس کے لیے مکان مہیا کرنا خاوند کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ مرد کے ذمہ واجب ہے، اور مرد کے قوام ہونے کی دلیل ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۲۵۳/۱۱)

اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

''اپنی عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو کیونکہ تم نے انہیں اللہ کی امان سے لیا ہے، اور اس کے کلمہ سے ان کی شرمگاہوں کو حلال قرار دیا ہے، تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ جس شخص کو تم ناپسند کرتے ہو اس کو تمہارے بستر پر نہ بیٹھنے دیں، اگر وہ ایسا کریں تو ان کو معمولی تنبیہ کرو، اور ان کا حق تم پر یہ ہے کہ تم انہیں دستور کے مطابق اشیائے خورد و نوش اور لباس دو۔'' (مسلم، رقم: ۱۲۱۸، باب فی حجۃ النبی ﷺ)

ترمذی میں ہے کہ آپ نے حجۃ الوداع کے تاریخی خطبہ میں جہاں امت کو اور باتوں کی تاکید فرمائی وہاں عورتوں کے بارے میں فرمایا:

''سنو! عورتوں کے بارے میں بھلائی کا تاکیدی حکم قبول کرو کیونکہ وہ یہاں بطور قیدی ہیں۔ اس کے سوا تم ان کی کسی چیز کے مالک نہیں مگر وہ کھلی ہوئی نافرمانی پر اتر آئیں تو ان کو بستر پر تنہا چھوڑ دو، اور معمولی تنبیہ کرو، اطاعت کر لیں تو پھر زیادتی کی ضرورت نہیں۔ سنو! تمہاری عورتوں پر تمہارے حقوق ہیں اور اسی طرح تمہاری عورتوں کے تم پر، تمہارے حقوق میں سے یہ ہے کہ وہ ان کو تمہارے بستر پر نہ بیٹھنے دیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو، اور تمہارے گھروں میں ان کو نہ بلائیں جن کا آنا تمہیں پسند نہیں، اور تم پر عورتوں کا حق یہ ہے کہ ان کو کپڑا دینے اور کھانا دینے میں احسان کرو۔''

(سنن الترمذی، باب ماجاء فی حق المرأۃ علیٰ زوجہا)

مرد کے قوام ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام نے عورت کو کوئی اہمیت نہیں دی اور نہ ہی یہ کہ اسلام میں عورت کا کوئی درجہ اور مقام نہیں۔ پاکستان کے دین ناآشنا حضرات جن کے ذہنوں میں الحاد اور بے دینی کے جراثیم مغربی جمہوریت کے ذریعہ داخل ہوئے ہیں، انہوں نے اسلام کے خلاف یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ اسلام عورت کو کم تر درجہ دیتا ہے اور انہوں نے مغرب کے غیر فطری نظریہ مساوات کو اسلام کا نظریہ مساوات ثابت کرنا شروع کر دیا۔ اسلام میں اگرچہ عورت اور مرد عزت و احترام کے لحاظ سے برابر ہیں، اخلاقی لحاظ سے بھی برابر ہیں، آخرت کے اجر و ثواب کے لحاظ سے بھی برابر ہیں، لیکن اسلام میں ان دونوں کا دائرہ عمل ایک نہیں بلکہ مختلف ہے، لہٰذا مرد و عورت کی مساوات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قدیم معاشروں میں عورت کو مرد کے مقابلہ میں کم تر درجہ حاصل تھا۔ قدیم یونان میں عورت کا درجہ اتنا گرا دیا گیا تھا کہ اس کی حیثیت صرف ایک بچہ پالنے والی لونڈی کی ہو کر رہ گئی تھی، عورتوں کو ان کے گھروں میں بند کر دیا گیا، وہ تعلیم سے یکسر محروم تھیں، ان کا کوئی حق نہ تھا اور ان کے خاندان والے ان کو بس گھر کے سامانوں میں سے ایک سامان سمجھتے تھے۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا: ۱۹/۹۰۹)

اسلام ہی دنیا میں وہ سب سے پہلا دین ہے جس نے عورت کو معاشرہ میں

اعلیٰ اور بلند ترین مقام دیا اور پہلی بار عورت کو وراثت میں حصہ دیا۔ عورت کو اسلام نے جو بلند مقام عطا فرمایا ہے وہ تو ہر صاحب علم و دانش جانتا ہے لیکن کو مرد کے ساتھ مساوات کا نعرہ لگا کر جو دھوکہ دیا گیا ہے، اس پر ڈاکٹر الیکسس کیرل نے اپنی کتاب Man The Unknon صفحہ 91 پر بڑی اچھی بحث کی ہے۔

مرد کی قوامیت ہر معاملہ میں ہے، چنانچہ امارت بھی مردوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ حدیث میں ہے:

﴿اذا خرج ثلاثة في سفر فليؤمروا احدهم﴾

(رواہ ابو داود، رقم: ۲۶۰۸)

''جب تین آدمی سفر کو نکلیں تو ایک کو امیر بنا لیں۔''

یہ حکم نظم و ضبط قائم رکھنے، فرائض شرعیہ کی ادائیگی اور اختلافات کو مٹانے کی غرض سے ہے تاکہ سفر اطمینان و سکون سے جاری رہے اور کوئی الجھن پیش نہ آئے۔

اور عورت پر جو مرد کی قوامیت کو ذکر کیا گیا، وہ مرد کو عورت پر اللہ کی عطا کردہ ہے۔ مرد اپنی عورت پر اسی طرح قوام ہے جیسے ایک بادشاہ اپنی رعیت پر قوام ہوتا ہے کہ وہ رعیت کو اوامر و نواہی کی تلقین بھی کرتا ہے اور ان کی حفاظت و صیانت بھی کرتا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے حضور اس کے بارے میں مسئول اور جواب دہ ہوگا۔ (تفسیر آیات الاحکام: ص ۳۵۵)

چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿ان الله سائل كل راع عما استرعاه، حفظ أم ضيع، حتى يسأل الرجل عن اهل بيته﴾ (رواہ ابن حبان فی صحیحہ)

''بے شک اللہ تعالیٰ ہر راعی کو سوال کرے گا اس شے کے بارے میں جس کی وہ نگرانی کر رہا ہے کہ اس نے اس کی حفاظت کی یا اس کو ضائع کر دیا حتیٰ کہ مرد کو اس کے گھر والوں کے بارے میں بھی پوچھا جائے گا۔''

یہ سوال مرد کو اس لیے ہوگا کہ وہ بیوی پر اور اپنی اولاد کی تربیت پر نگران اور راعی مقرر کیا گیا ہے۔

جب کسی شخص کی آمدنی قلیل ہو تو عورت کو غربت کے سبب سے اس کی قوامیت کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے بلکہ صبر سے کام لے اور اللہ تعالیٰ سے خوش حالی کی دعا کرے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے:

﴿افضل العبادة انتظار الفرج﴾

(رواہ الترمذی وابن ابی الدنیا، ترمذی: ۳۶۴۲/۵)

''سب سے افضل عبادت خوش حالی کا انتظار ہے۔''

جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس سے ہی گزارہ کرنے کی کوشش کرے، جیسا کہ سیدہ عائشہ سلام اللہ علیہا عروہ رضی اللہ عنہ سے فرماتی ہیں: ''اے میرے بھائی کے بیٹے! ہم ایک چاند اور پھر دوسرے چاند کا انتظار کرتے اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چولہے میں آگ نہیں جلتی تھی۔ عروہ کہتے ہیں: ''اے خالہ! پھر آپ کی گزران کیسے ہوتی؟'' فرمایا: دو کالی چیزوں یعنی کھجوروں اور پانی پر۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ کے پڑوس میں ایک انصاری رہتے تھے وہ بھی کبھی رسول اللہ ﷺ کو اپنی بکریوں کا دودھ بھیج دیتے تھے، ہم اس کو پی لیتے تھے۔ (بخاری: ۲/۳۳۸)

اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کو چکی پیستے پیستے ہاتھ کو چھالے پڑ گئے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں لیکن رسول اللہ ﷺ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ چنانچہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اپنے آنے کے مقصد کا اظہار کیا کہ میں ایک خادم حاصل کرنے کے لیے آئی تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ گھر میں تشریف لائے تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے آنے کے بارے میں آپ ﷺ سے ذکر کیا اور ان کے آنے کا مقصد بھی بیان کیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر تشریف لائے۔ ہم ابھی اپنے بستر ہی میں تھے۔ حضور ﷺ کو دیکھ کر میں نے اٹھنا چاہا لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، بیٹھے رہو۔ آپ ہم دونوں کے درمیان آ کر بیٹھ گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں ایک ایسی چیز نہ بتاؤں جو تم دونوں کے لیے ایک خادم سے بہتر ہو؟'' فرمایا: ''جب تم سونے کے لیے بستر پر جاؤ تو 44 مرتبہ اللہ اکبر،

33 دفعہ الحمدللہ اور 33 دفعہ سبحان اللہ پڑھ لیا کرو۔ یہ تمہارے لیے ایک خادم سے بہتر ہوگا۔" (بخاری کتاب الدعوات، رقم: ۶۳۱۸)

ایک سلیم الفطرت عورت اپنے خاوند کی اس قوامیت کو دل و جان سے پسند کرے گی کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ نے مرد کی فطرت میں رکھی ہے۔ مرد کو اپنی اس قوامیت کی وجہ سے خاندان اور معاشرہ کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے، اپنی اہلیہ کو دینی امور کی تعلیم دینی چاہیے، اس کی عزت و ناموس کی حفاظت کرنی چاہیے اور عفت و عصمت اور پردہ و حجاب کی تلقین کرنی چاہیے، اور اولاد کو فتنہ و فساد اور خصائل سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے، کیونکہ قرآن حکیم میں ہے:

"اے ایمان والو! بچاؤ اپنی جانوں کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے جس کا ایندھن ہیں آدمی اور پتھر۔" (تحریم ۶)

اس آیت کی رو سے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اپنے ساتھ اپنے گھر والوں کو بھی دین کی راہ پر چلائے، سمجھا کر، ڈرا کر، پیار سے، مار سے، جس طرح ہوسکے دیندار بنانے کی کوشش کرے۔ اس پر بھی اگر وہ راہ راست پر نہ آئیں تو ان کی کم بختی۔ یہ بے قصور ہے۔ (فوائد عثمانی: ص ۷۴۳)

اور اولاد کی دینی تربیت کے بارے میں قرآن حکیم میں فرمایا گیا:

"اور آپ اپنے اہل خانہ کو نماز کا حکم دیں اور خود بھی نماز پر جمے رہیں، ہم آپ سے (آپ کے) رزق کا سوال نہیں کرتے، ہم خود آپ کو رزق دیتے ہیں، اور نیک انجام صرف تقویٰ ہے۔" (طٰہٰ ۱۳۲)

اہل خانہ کو نماز کا حکم دینے سے مراد ہے کہ آپ اپنے اقارب کو نماز پڑھنے کا حکم دیں۔ اس آیت کے نزول کے بعد نبی اکرم ﷺ ہر روز سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے جاتے تھے اور ان کو نماز کے لیے اٹھاتے تھے۔ سیدہ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جب بادشاہوں کے محلات میں آرائش و زیبائش کی چیزیں دیکھتے تو یہ آیت پڑھتے:

﴿ولا تمدن عینیک ....﴾

"یعنی ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو آزمانے کے لیے دنیا کی

آرائش اور زیبائش کی جو چیزیں دے رکھی ہیں، آپ ان کی طرف ہرگز آنکھیں نہ پھیلائیں، آپ کے رب کا دیا ہوا رزق ہی بہت بہتر اور بہت باقی رہنے والا ہے۔'' (طٰہٰ:۱۳۱)

پھر ان کو نماز پڑھنے کا حکم دیتے اور کہتے نماز پڑھو اللہ تم پر رحم فرمائے، اور خود نماز پڑھتے۔ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنے گھر والوں کو تہجد کے لیے اٹھاتے اور خود بھی نماز پڑھتے اور اس آیت پر عمل کرتے۔

خاوند کی بستر پر اطاعت کرنا:

رات کو جب میاں بیوی بستر پر سونے کے لیے جائیں تو وہاں بھی عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے خاوند کی اطاعت کرے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جب کوئی مرد اپنی عورت کو اپنے بستر پر بلائے، تو اس کو آنا چاہیے اگرچہ وہ کاٹھی کی پشت پر ہو یعنی اونٹ پر سوار جا رہی ہو۔''

(رواہ ابن ماجہ، ابن ابی رقم الجامع الصغیر: ۵۳۳)

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جب کوئی شخص اپنی عورت کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ نہ آئے اور وہ مرد غضب میں اپنی رات گزارے تو صبح تک فرشتے اس عورت پر لعنت کرتے رہتے ہیں۔'' (رواہ مسلم، رقم ۳۵۴۱، باب امتناعہا من فراش زوجہا)

عمومی اطاعت:

اسلام نے نہ صرف بستر پر مرد کی اطاعت کو تاکید کی بلکہ علی العموم بھی مرد کی اطاعت کی سخت تاکید کی کیونکہ مرد کی حیثیت ایک قوام اور منتظم کی ہے، اور منتظم کی جب تک اطاعت نہ کی جائے گھر اور خاندان کا انتظام بہتر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ سیدنا حصین بن محصن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری پھوپھی نے مجھ سے بیان کیا کہ میں ایک مرتبہ سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں کسی ضرورت کے لیے حاضر ہوئی۔ آپ ﷺ نے مجھ سے

فرمایا: ''اے فلاں! کیا تیرا خاوند ہے؟'' اس نے کہا: ''جی ہاں۔'' آپ ﷺ نے پوچھا: ''تو اس کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے؟'' اس نے کہا: میں اپنی استطاعت کے مطابق اس کی اطاعت کرتی ہوں۔'' آپ نے فرمایا: ''ذرا اپنے طرز اطاعت کو دیکھ لینا، وہ تیری جنت بھی ہے اور جہنم بھی۔'' (معجم کبیر طبرانی، رقم: ۸۳)

خاوند کے ساتھ حسن معاشرت یہی ہے کہ جب وہ غصہ میں ہو تو اس کو راضی کیا جائے، اور جو وہ حکم کرے اس کی اطاعت کی جائے، اور اگر وہ ناز میں آ کر قسم کھا لے تو عورت اس کی قسم کو پورا کرے اور اس کی غیر حاضری میں اس کے مال اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا میں تمہیں تمہاری جنتی عورتوں کی خبر نہ دوں؟ ہم نے عرض کیا: ''کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول!'' فرمایا: ''ہر محبت کرنے والی اور بچے جننے والی عورت، جب اس کا خاوند اس سے غصہ ہو جائے تو کہے: یہ میرا ہاتھ تیرے ہاتھ میں ہے، میں اس وقت تک سرمہ نہیں لگاؤں گی جب تک تو راضی نہ ہو جائے۔'' (الترغیب والترہیب: ۲۸۴۴/۳)

ایک اور روایت میں سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا:

''مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے بعد سب سے زیادہ مفید اور باعث خیر و برکت نعمت نیک بیوی ہے، جب وہ اس کو کسی کام کے لیے کہے تو اس کی اطاعت کرے، اور جب وہ اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے، اور جب وہ اس کے بھروسے پر قسم کھا بیٹھے تو وہ اس کی قسم کو پوری کر دے، اور جب وہ کہیں چلا جائے تو وہ اس کی غیر حاضری میں اپنی عزت و آبرو اور شوہر کے مال و اسباب کی خیر خواہ اور وفادار رہے۔'' (ابن ماجہ، رقم: ۱۸۵۷)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ اس عورت کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا جو اپنے خاوند کا شکر ادا نہیں کرتی جب وہ اس سے مستغنی نہیں ہے۔'' (مجمع الزوائد، رقم: ۷۶۳۸)

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ

کرے۔" (رواہ الترمذی فی سننہ: ۲/ ۱۲۹ وھو حدیث حسن)

خاوند کا عورت سے راضی ہونا عورت کے جنت میں داخل ہونے کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"عورت جب پانچ نمازیں پڑھے، رمضان کے روزے رکھے، اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرے اور اپنے خاوند کی اطاعت کرے، تو وہ جنت کے جس دروازہ سے چاہے جنت میں داخل ہو جائے۔" (مسند احمد: ۱/ ۱۹۱)

اسی طرح ایک اور روایت میں سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا:

"جو عورت مر جائے اس حال میں کہ اس کا خاوند اس سے راضی تھا، وہ جنت میں داخل ہو گئی۔"

(رواہ الترمذی وابن ماجہ والحاکم فی المستدرک عن ام سلمہ رضی اللہ عنہا وصححہ السیوطی جامع الصغیر: ۳/ ۲۹۳۵)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ آپ نے انہیں وعظ فرمایا اور دوران وعظ انہیں فرمایا: "اے عورتو! صدقہ کیا کرو کیونکہ تم میں سے اکثر جہنم کا ایندھن ہوں گی، وجہ یہ ہے کہ تم شکوہ شکایت بہت کرتی ہو اور اپنے خاوندوں کی نافرمانی کرتی ہو۔"

(رواہ البخاری ومسلم: ۲/ ۸۸۵)

شوہر کی مساعدت اور تعاون کرنا اور اولاد کی تربیت کرنا:

عورت کو اپنے خاوند کے ساتھ ہر کام میں تعاون کرنا چاہیے اور اس کی اولاد کی صحیح طور پر تربیت کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ:

"سنو! تم سب راعی اور نگران ہو اور ہر راعی سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ حاکم جو لوگوں پر راعی ہے اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ آدمی اپنے گھر والوں کا راعی ہے لہٰذا اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا، اور عورت اپنے خاوند کے گھر میں اور اس اولاد کی ذمہ دار ہے لہٰذا اس سے ان کے بارے میں باز پرس ہوگی، اور غلام اپنے مالک کے مال پر راعی ہے لہٰذا اس کو بھی اس کے بارے میں باز پرس ہوگی۔

(رواہ البخاری: ۱/ ۸۵۲، مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الامام العادل)

سیدہ عائشہ صدیقہ سلام اللہ علیہا کی بڑی بہن سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں کہ جب ہم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچے تو میرے شوہر زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس صرف ایک بار بردار اونٹنی اور ایک گھوڑا تھا نہ کوئی جائداد تھی اور نہ ہی کوئی مال اور نہ ہی کوئی غلام اور لونڈی جو اونٹ اور گھوڑے کو چارہ وغیرہ ڈالتا۔ میں خود جا کر گھوڑے کے لیے گھاس لاتی تھی اور اس کی ٹہل کرتی تھی۔ اپنے سوتیلے بچوں کی تربیت اور خدمت کرتی تھی۔ خود آٹا گوندھتی اور خود روٹی پکاتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے زبیر رضی اللہ عنہ کو زمین کا ایک ٹکڑا عنایت فرمایا تھا جو میرے گھر سے تین فرسخ دور تھا۔ میں وہاں جاتی۔ کھجوروں اور گٹھلیوں کی ایک گٹھری باندھ کر اپنے سر پر رکھ کر لاتی۔ بالآخر میرے والد سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک غلام بھیج دیا جس نے گھوڑے کی خدمت اپنے ذمہ لے کر مجھے اس جفاکشی سے نجات دی۔ (رواہ البخاری: ۲/۲۹۸۲)

نفل روزے کے لیے خاوند کی اجازت:

عورت کو اپنے خاوند کی موجودگی میں نفل روزہ رکھنا ممنوع ہے جب تک کہ اس کا خاوند اس کی اجازت نہ دے، اور نہ ہی کسی ایسے شخص کو اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دینے کی مجاز ہے سوائے خاوند کی رضا اور اجازت سے، کیونکہ سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے:

﴿لایحل لا مرأۃ أن تصوم و زوجھا شاھد الا باذنہ، ولا تاذن فی بیتہ الا باذنہ﴾

"کسی عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے خاوند کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر (نفلی) روزہ رکھے اور نہ کسی کو اس کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے مگر اس کی اجازت سے۔"

(رواہ البخاری: ۳/۴۸۹۹، کتاب النکاح)

خاوند سے سفر کی اجازت:

ایک مسلمان عورت کے لیے تین روز کی مسافت (جو کہ تقریباً 48 میل بنتی ہے)

کا سفر یا تو اپنے خاوند کے ساتھ کرے یا پھر اپنے کسی محرم کے ساتھ کرے جیسا کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کسی ایسی عورت کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے، جائز نہیں کہ وہ تین روز کی مسافت یا اس سے زائد کا سفر کرے مگر اس حال میں کہ یا تو اس کا باپ، یا اس کا بھائی، یا اس کا خاوند، یا اس کا بیٹا یا دوسرا کوئی محرم اس کے ساتھ ہو۔''

(رواہ البخاری ومسلم، ۱/۳۳۴، ۱۳۴۰، باب سفر المرأۃ مع محرم الی الحج وغیرہ)

جب شریعت نے عورت کو مرد کی موجودگی اس کی اجازت کے بغیر نفلی روزہ رکھنے کی اجازت نہیں دی لہٰذا اس کا سفر بھی خواہ اس کے محرم کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، بغیر خاوند کی اجازت کے جائز نہیں۔

مرد کے مال کے خرچ کرنے میں اجازت لینا:

کسی عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ خاوند کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں کوئی تصرف کرے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ اسلام میں عورت اور مرد کے مالوں کو الگ الگ تصور کیا گیا ہے، اور جس طرح کوئی عورت اپنے خاوند کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر کوئی تصرف نہیں کر سکتی اسی طرح کوئی مرد بھی اپنی بیوی کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف نہیں کر سکتا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لا تنفق امرأۃ شیئاً من بیت زوجها الا باذنه﴾

''کوئی عورت اپنے خاوند کے گھر میں سے کوئی شے خرچ نہ کرے مگر ان کی اجازت سے۔''

خرچ نہ کرنے کا مطلب ہے کسی کو نہ دے۔ حضور ﷺ سے پوچھا گیا: ''یا رسول اللہ! کھانا بھی؟'' فرمایا: ''کھانا تو سب سے افضل مال ہے۔'' (رواہ الترمذی: ۲/۲۶۵)

لیکن اگر عورت خاوند کی رضا اور مرضی سے خرچ کرے یا صدقہ کرے تو یہ دونوں کے لیے ایک بہت بڑی نیکی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اذا تصدقت المرأۃ من بیت زوجها کان لها أجر ولزوجها اجر﴾

''جب کوئی عورت اپنے شوہر کے گھر سے (اس کی اجازت سے) صدقہ کرتی ہے تو اس عورت کے لیے وہ باعث اجر ہوتا ہے اور مرد کے لیے بھی۔''

شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید کسی کے اجر میں کوئی کمی واقع ہو، کیونکہ مال تو مرد کا تھا اور اس میں سے صدقہ عورت نے کیا، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ عورت کو ثواب ہو۔ اس شبہ کا جواب سرکار دو عالم ﷺ نے ان الفاظ میں دیا:

﴿لا ینقص کل واحد منهما من اجر صاحبه شیئاً، له ما کسب ولها بما انفقت﴾

''ان میں سے کسی کے اجر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی، مرد کو مال کمانے کا اجر ملے گا اور عورت کو مال خرچ کرنے کا ثواب ہوگا (ثواب دونوں کا مساوی اور برابر ہوگا)'' (رواہ الترمذی: ۲/ ۶۲۲)

اور جب کوئی عورت اپنے غریب ومفلس خاوند پر صدقہ کرے تو اس عورت کو دو اجر ملیں گے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

﴿لها اجران، أجر القرابة، وأجر الصدقة﴾

''اس عورت کے لیے دو اجر ہیں، ایک قرابت کا اجر اور دوسرا صدقہ کا اجر۔'' (رواہ البخاری، کتاب الزکاۃ، باب: ۴۷/ ۱۳۹۷)

خاوند کی دل جوئی کرنا:

خاوند جب مختلف قسم کے شدائد اور مصائب سے دوچار ہو تو ایک نیک بخت عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے خاوند کی دل جوئی کرے اور اس کو تسلی دے، چنانچہ جب سرکار دو عالم ﷺ پر غار حرا میں وحی ہوئی تو روایات میں ہے کہ آپ کا دل دھک دھک کرنے لگا، بدن میں کپکپی اور رعشہ کی سی کیفیت طاری ہوگئی جیسے سردی سے آدمی کانپتا ہے۔ چنانچہ آپ فوری طور پر وہاں سے اٹھ کر اپنے دولت کدہ پر تشریف لائے۔ رفیقہ حیات سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی جو یہ کیفیت دیکھی تو پریشان ہوگئیں۔

نبوت کے لبوں سے ایک آواز سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے کانوں میں پڑی "زملونی، زملونی" مجھے کچھ اوڑھاؤ، مجھے کچھ اڑھاؤ۔ سیدہ رضی اللہ عنہا نے فوری طور پر آپ کو چادر اڑھادی۔ کچھ دیر بعد گھبراہٹ اور پریشانی دور ہوئی اور آپ سو گئے۔ آپ نیند سے بیدار ہوئے اور طبیعت میں کچھ سکون پیدا ہوا تو سیدہ طاہرہ رضی اللہ عنہا نے بلائیں لیں، پوچھا: "کیا بات ہوگئی؟" آپ ﷺ نے سارا واقعہ بیان فرمایا، پھر فرمایا کہ "مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے۔" سیدہ رضی اللہ عنہا نہایت سمجھدار خاتون تھیں، وہ آپ کے حالات زندگی سے بخوبی آشنا تھیں۔ چنانچہ سیدہ رضی اللہ عنہا نے نہایت لطیف پیرایہ اور انداز میں آپ کو اطمینان دلایا اور بتایا کہ آپ ہرگز نہ ڈریں اور نہ اپنی جان کا خوف نہ کریں۔

﴿کلا، والله لا یخزیک الله ابدا، انک لتصل الرحم، وتحمل الکل، وتکسب المعدوم، وتقری الضیف وتعین علیٰ نوائب الحق﴾

"بخدا! ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ناکام اور نامراد کردے کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، تھکے ہارے اور درماندہ انسانوں کو ان کی منزل تک پہنچاتے ہیں، اور خدمات جلیلہ سرانجام دیتے ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی، ناداروں کی خبر گیری کرتے ہیں، بے ٹھکانہ مسافروں کو اپنا مہمان بناتے ہیں اور حق بجانب امور میں معین و مددگار رہتے ہیں۔"

(بخاری مع فتح الباری: ۲۲/۱)
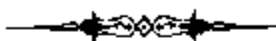
عورت کے حقوق

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل عورت دنیا کی مظلوم ترین چیز تھی۔ رشتہ ازدواج کے بنیادی مقصد کو لوگوں نے بھلا دیا تھا اور سکون و آسودگی سے لوگوں کے دل خالی ہو چکے تھے۔ عورت ہر جگہ مردوں کے ظلم وجور کا شکار بنی ہوئی تھی۔ مرد عورت کے لئے مرد نہیں بلکہ جنگل کا ایک درندہ بنا ہوا تھا۔ چوپاؤں اور گھر کے دوسرے سامانوں کی طرح عورتیں خریدی اور فروخت کی جاتی تھیں بلکہ عورتوں کو بدکاری کا پیشہ تک اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ یعنی اپنی ہوس رانیوں کا ذریعہ بنانے کے ساتھ زر کشی کا ذریعہ بھی مردوں نے ان غریب عورتوں کو بنالیا تھا۔ جاہلیت میں عورتیں انسان اور حیوانات کے درمیان ایک مخلوق سمجھی جانے لگی تھی جس کا مقصد نسل انسانی کی ترقی اور مرد کی خدمت کرنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لڑکیوں کی پیدائش باعث عار سمجھی جاتی تھی، پیدا ہونے کے ساتھ ہی ان کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ اسی کو بعضوں نے اپنی شرافت و افتخار کا اقتضاء دے رکھا تھا۔

اسلام نے آکر عورت کو ہر روپ میں عزت و افتخار سے نوازا۔ عورت ماں ہو، بیوی ہو، بہن ہو یا بیٹی ہو ہر حالت میں اسلام نے ان کو عزت و احترام سے نوازا۔ اسلام نے شادی کی صورت میں نکاح کی بنیاد کو راسخ کیا۔ جسم و روح اور عقل و جذبات کے تقاضوں میں توازن رکھا، اور ازدواجی زندگی میں اسلام کے طریقہ کے احترام کو ضروری قرار دیا۔ نبی اکرم ﷺ نے عورت کے بارہ میں خیر کی وصیت فرمائی اور اس کو اس قدر بلند مرتبہ عطا فرمایا جو کسی مذہب نے عورت کو نہیں دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کی طبعی اور فطری کمزوری کی نشان دہی فرماتے ہوئے مردوں کو ہدایت فرمائی۔

''عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے، اور پسلیوں کا سب سے زیادہ ٹیڑھا حصہ اوپر کا ہے۔ اگر اس کو سیدھا کرو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی اور اگر چھوڑے رہو گے تو ٹیڑھی ہی رہے گی۔ پس عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔'' (بخاری، رقم:۳۳۳۱)

مسلم کی ایک روایت میں اسی بات کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:

''عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ تم کسی بھی صورت میں اسے سیدھا نہیں کر سکتے۔ اگر تم اس کے ٹیڑھا رہتے ہوئے لطف اندوز ہو گے تبھی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہو، ورنہ اگر اسے سیدھا کرنے لگو گے تو ٹوٹ جائے گی، اور اس کا ٹوٹنا اس کی طلاق ہے۔'' (وکسرھا طلاقھا) (رواہ مسلم، رقم:۱۴۶۸)

رسول اللہ ﷺ کی اس بلیغ تمثیل میں عورت کی حقیقت اور اس کے فطری مزاج کا نہایت دل کش بیان کیا گیا ہے۔ عورت شوہر کی خواہش کے مطابق کسی ایک حال پر قائم نہیں رہ سکتی، لہٰذا مسلمان شوہر کو یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ اس کی جبلت، فطرت اور طبعی عادت ہے، اس لئے وہ جس چیز کو اپنے دل میں صحیح سمجھتا ہے، اسے راستے پر لانے کے لئے سختی نہ کرے۔ اس کے خاطر نسوانی مزاج کا خیال رکھے اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق کی ہے ویسے ہی اسے قبول کر لے۔ بعض ان چیزوں کے بارہ میں جنہیں شوہر چاہتا ہے، اس کے دل میں ٹیڑھ ہے۔ اگر وہ اس کو اپنے مزاج کے مطابق سیدھا کرنا چاہے گا تو اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو پسلی کی کجی کو سیدھا کرنا چاہے اور وہ ٹوٹ جائے، اور عورت کے ٹوٹ جانے سے مراد طلاق کا واقع ہو جانا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے مطابق ایک سچا مسلمان اپنی بیوی کی بہت سی لغزشوں میں حلم و بردباری سے کام لیتا ہے اور اس کی بہت سی خامیوں سے چشم پوشی برتتا ہے، یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ اس کی فطرت ہے اور اس طرح اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ چنانچہ اس طرح ازدواجی زندگی بڑے امن وسکون اور چین وراحت سے گزرتی ہے اور گھر میں کسی قسم کی چیخ و پکار اور شور وغل اور لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا اور گھر کا ماحول جنت کی مانند ہو جاتا ہے۔

اسلام کی نگاہ میں عورت ہر شی سے قبل گھر کی مالک ہے، ایک بہادر کی بیوی ہے،

ایک شہید کی ماں ہے۔ اسلام نے عورت کی شان کو بلند و بالا کیا ہے، اور اس بارہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

﴿ما اکرمهن الا کریم، ولا اهانهن الا لئیم﴾

(رواہ السیوطی فی الجامع الصغیر: ۲/۱۰۲)

''عورتوں کی عزت وتکریم نہیں کرتا مگر کریم اور ان کی اہانت نہیں کرتا مگر بدبخت۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جاہلیت میں عورتوں کو ذرہ برابر بھی وقعت اور اہمیت نہ دیتے تھے لیکن اسلام نے ان کو ایک خاص درجہ دیا اور قرآن حکیم میں ان کے بارہ آیات اتریں تو پھر ان کی قدر و قیمت اور ان کا مرتبہ ومنزلت معلوم ہوئی۔ ایک روز میری بیوی نے کسی معاملہ میں مجھ کو رائے دی۔ میں نے اسے کہا کہ تم کو رائے اور مشورہ سے کیا تعلق؟ اس نے جواب دیا: ''یا ابن الخطاب! تم کو ذرا سی بات بھی برداشت نہیں حالانکہ تمہاری بچی رسول اللہ ﷺ کو برابر کا جواب دیتی ہے یہاں تک کہ آپ دن بھر رنجیدہ رہتے ہیں۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ بات سن کر میں فوری طور پر اٹھا اور حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا۔ میں نے کہا: بیٹی! یہ میں نے کیا سنا ہے کہ تم رسول اللہ ﷺ کو برابر کا جواب دیتی ہو۔'' وہ بولی: ''ہاں ہم ایسا کرتے ہیں۔'' میں نے کہا: ''خبردار! میں تمہیں عذاب الٰہی سے ڈراتا ہوں، تم کہیں اس کے گھمنڈ یا دھوکہ میں نہ رہنا جس کے حسن نے رسول اللہ ﷺ کو فریفتہ کر لیا ہے۔ (یعنی عائشہ) (رواہ البخاری: ۳/۲۶۲۹، باب قولہ تعالیٰ تبتغی مرضاۃ ازواجک)

اسی سلسلہ میں ایک روایت سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے ہے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ سیدنا ابوبکر نے کاشانہ نبوت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ ابھی آپ باہر ہی تھے کہ آپ نے سنا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ سے اونچی آواز سے بات کر رہی ہے۔ پس جب آپ کاشانہ نبوت میں داخل ہوئے تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو پکڑ کر کہا: ''اے ام رومان کی بچی! تو سرکار دو عالم ﷺ کے سامنے اونچی آواز سے بولتی ہے۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان حائل ہو گئے، اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مارنے کا موقع نہ دیا۔ جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ باہر نکلے تو سرکار دو عالم ﷺ سیدہ رضی اللہ عنہا کو

راضی کرنے کے لئے یہ فرمانے لگے: ''دیکھو! میں نے تمہارے اور تمہارے باپ کے درمیان حائل ہو کر تمہیں کیسے بچالیا؟''

کچھ وقت کے بعد سیدنا ابوبکر ؓ پھر کاشانہ نبوت میں حاضر ہوئے۔ اب کی بار دیکھا کہ سیدہ عائشہ ؓ رسول اللہ ﷺ دونوں خوشی سے ہنس رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر سیدنا ابوبکر ؓ نے عرض کی: ''یا رسول اللہ! مجھے اپنی صلح میں اسی طرح شریک کریں جیسے اپنی لڑائی میں مجھے شریک کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہم نے کرلیا؟۔

(رواہ النسائی فی عشرۃ النساء، رقم: ۲۷۳، ابوداؤد، رقم: ۴۹۹۹، مسند احمد: ۴/۲۷۱۔۲۷۲، فضائل الصحابۃ لاحمد بن حنبل، رقم: ۲۸۰، کتاب العیال لابن ابی الدنیا، رقم: ۵۶۱)

سیدہ عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ ایک بڑھیا سرکار دوعالم ﷺ کے پاس آئی۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا: ''جثامہ المزنیہ''۔ آپ نے فرمایا: ''نہیں بلکہ تو حسانۃ المزنیہ ہے۔ پھر حضور ﷺ نے اس کی خیر و عافیت پوچھی۔ اس نے جواب دیا: ''یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میں خیریت سے ہوں۔''

سیدہ عائشہ ؓ فرماتی ہیں: ''میں نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! یہ عورت کون ہے؟''

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ''سیدہ نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں جو کچھ آپ اس بڑھیا کے لئے کر رہے تھے یہ اور کسی دوسرے کے لئے آپ ﷺ نہیں کرتے؟'' آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''اے عائشہ! یہ خدیجہ کی زندگی میں ہمارے پاس آیا کرتی تھی، اور عہد کو پورا کرنا بھی ایمان میں سے ہے۔''

ایک دوسری روایت میں ہے۔

﴿ان کرم الود من الایمان﴾

''محبت کی تکریم بھی ایمان کا جزو ہے۔''

(مستدرک حاکم ۱/۱۵۔۱۶، بیہقی، شعب الایمان: ۶/۵۱۷، معجم کبیر طبرانی: ۲۳/۱۴، اسد الغابہ ۷/۹۳، الاصابہ: ۷/۵۸۰، سیر اعلام النبلاء للذہبی: ۲/۱۲۵، المقاصد الحسنہ، رقم: ۱۱۸۹)

امام احمد بن حنبلؒ نے سند جید کے ساتھ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت نقل کی ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا جب بھی ذکر فرماتے تو ان کی بہت تعریف فرماتے۔ ایک روز مجھے رشک آ گیا۔ میں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! آپ اکثر ایک بڑھیا کو یاد کرتے ہیں جو مر چکی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے اچھی بیویاں عطا فرمائیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''عائشہ! اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے اچھی بیویاں نہیں دیں۔ جب لوگ میرا انکار کر رہے تھے تو وہ مجھ پر ایمان لائیں، جب لوگ میری تکذیب کر رہے تھے تو انہوں نے میری تصدیق کی، جب لوگ مجھے مال سے محروم کر رہے تھے تو اس نے کھل کر میری مالی مدد کی، اور اللہ تعالیٰ نے اس سے مجھے اولاد عطا فرمائی جب کہ اور عورتوں سے میں اولاد سے محروم رہا۔''

(مسند احمد: ۶/ ۱۱۷۔۱۱۸، معجم کبیر: ۲۳: ۱۳، البدایہ والنہایہ: ۳/ ۱۲۶، مجمع الزوائد: ۹/ ۲۲۴، وقال اسنادہ حسن، الاستیعاب لابن عبد البر: ۴/ ۱۸۲۳)

بخاری اور مسلم میں بھی یہ روایت ہے لیکن اس میں یہ روایت ''قد ابدلک اللّٰہ تعالیٰ خیراً منها'' تک ہے۔ روایت کے اگلے جملے صحیحین میں نہیں ہیں۔

(ملاحظہ ہو بخاری، رقم: ۳۸۲۱، مسلم، رقم: ۲۴۳۷)

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا ذکر فرمایا تو مجھے رشک آ گیا۔ میں نے عرض کیا: 'یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے اس بڑھیا کے بدلہ میں آپ کو اس سے بہتر عورتیں عطا فرمائیں (پھر بھی آپ اس کو یاد فرماتے ہیں) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ غصہ سے بھر گئے، اور آپ کی یہ حالت دیکھ کر میری جان نکل گئی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اب اگر آپ ﷺ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو میں پھر کبھی بھی خدیجہ رضی اللہ عنہا کا ذکر اس طرح نہیں کروں گی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر تھوڑی دیر بعد آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور آپ ﷺ نے فرمایا:

''عائشہ! تو نے یہ بات کیسے کہہ دی، بخدا! جب لوگ میرا انکار کر رہے تھے وہ

مجھ پر ایمان لائی، اور جب لوگ مجھے چھوڑ رہے تھے، اس نے مجھے پناہ دی، جب لوگ میری تکذیب کر رہے تھے اس نے میرے (دعویٰ رسالت کی) تصدیق کی، اور اللہ تعالیٰ نے اس سے مجھے اولاد عطا فرمائی۔

(معجم کبیر طبرانی: ۲۳/۱۳، مجمع الزوائد ۹/۲۲۴، الاربعین فی مناقب امہات المؤمنین لابن عساکر ص ۱۸، تاریخ دمشق لابن عساکر ص: ۱۲۱، الاصابہ: ۷/۶۰۵، الاستیعاب ۴/۸۲۳)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی کسی بیوی نے آپ کو پلیٹ میں ثرید بھیجی، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے خادمہ کے ہاتھ پر مارا اور وہ پلیٹ گر کر ٹوٹ گئی اور ثرید بھی نیچے گر گئی۔ نبی اکرم ﷺ اس ثرید کو اس برتن میں ڈالنے لگے اور فرماتے جاتے: اس کو کھالو، تمہاری ماں کو غیرت آ گئی ہے۔

(رواہ البخاری: ۳/۲۹۲۷، کتاب النکاح، باب الغیرۃ)

اس سے آپ اندازہ فرمائیں کہ رسول اللہ ﷺ کس قدر حلیم تھے، اور آپ نے اپنے غصہ کو کیسے پیا اور کس حکمت سے معاملہ کو سلجھایا۔

عورت بھی مردوں کی طرح مکلّف اور مسئول ہے:

عورت بھی مردوں کی طرح ایمان، عبادات، اخلاق، معاملات اور دوسرے تمام احکام شرعیہ میں مردوں کے ساتھ برابر ہے، البتہ بعض معاملات میں یہ مردوں سے مختلف ہے، کیوں عورت اور مرد کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے اختلاف رکھا ہے۔ اس بات کو ہر ایک نے تسلیم کیا ہے۔ اس بات کو لوگوں نے بگاڑ کر پیش کیا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ "اسلام میں عورت مرد سے کم تر ہے۔" حالانکہ اسلام یہ نہیں کہتا اور نہ ہی اسلام میں ایسا ہے بلکہ اسلام یہ کہتا ہے کہ عورت مرد سے مختلف ہے۔ یہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں فرق کا معاملہ ہے نہ کہ ایک کے مقابلہ میں دوسرے کے بہتر ہونے کا۔ مرد اور عورت کے بارہ میں اسلام کے سارے قوانین اسی اصول پر مبنی ہیں کہ عورت اور مرد دو الگ الگ صنفیں ہیں، لہذا خاندانی اور سماجی زندگی میں ان کا دائرہ عمل بھی ایک نہیں بلکہ مختلف ہے، اور ایک ہو بھی نہیں سکتا کیوں کہ جب دونوں صنفوں کے مابین حیاتیاتی بناوٹ کے لحاظ

سے فرق ہے تو ان کے درمیان عمل کے اعتبار سے بھی لازمی طور پر فرق ہونا چاہئے۔

مرد اور عورت کے درمیان جو فرق اسلام نے بتایا ہے اس کو موجودہ دور میں علم انسانی کے ماہرین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ امریکہ کے ایک پروفیسر اسٹیون گولڈ برگ نے لکھا ہے:

''اس فرق کی زیادہ حقیقت پسندانہ توجیہ یہ ہے کہ اس کو مردانہ ہارمون (Male Harmone) کا نتیجہ قرار دیا جائے جو کہ ابتدائی جرثومہ حیات پر اس وقت غالب آجاتے ہیں جب کہ ابھی وہ رحم مادر میں ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ چھوٹے بچے چھوٹی بچیوں سے جارح ہوتے ہیں۔''

آگے چل کر پروفیسر گولڈ برگ لکھتے ہیں کہ:

''اس کا مطلب یہ نہیں کہ مرد عورتوں سے بہتر (Better) ہوتے ہیں بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ مرد عورتوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ مرد کا دماغ اس سے مختلف کام کرتا ہے جس طرح عورت کا دماغ کام کرتا ہے۔ یہ فرق چوہوں وغیرہ کے نر اور مادہ میں بہت واضح طور پر تجربہ کیا جاسکتا ہے۔''

(ڈیلی ایکسپریس ۴ جولائی ۱۹۷۷ء)

یورپ کے مشہور مفکر اور نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر الیکسس کیرل نے بھی اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے اسلام کے نظریہ مرد و زن کی تائید کی ہے۔ ڈاکٹر موصوف اس معاملہ کی حیاتیاتی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مرد اور عورت کے درمیان جو فرق پائے جاتے ہیں وہ محض جنسی اعضاء کی خاص شکل، رحم کی موجودگی، حمل یا طریقہ تعلیم کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ وہ اس سے زیادہ بنیادی نوعیت کے ہیں، جو خود نسیجوں کی بناوٹ سے پیدا ہوتے ہیں اور پورے نظام میں خصوصی کیمیائی مادے کے سرایت کرنے سے ہوتے ہیں جو کہ خصیۃ الرحم سے نکلتے ہیں۔ ان بنیادی حقیقتوں سے بے خبری نے ترقی نسواں کے حامیوں کو اس عقیدے پر پہنچا دیا ہے کہ دونوں صنفوں کے لئے ایک قسم کی تعلیم، ایک طرح کے اختیارات اور ایک طرح کی ذمہ داریاں ہونی چاہئیں۔''

ڈاکٹر کیرل اس بارہ میں مزید لکھتے ہیں۔

"حقیقت کے اعتبار سے عورت نہایت گہرے طور پر مرد سے مختلف ہے۔ عورت کے جسم کے ہر خلیے میں زنانہ پن کا اثر موجود ہوتا ہے۔ یہی بات اس کے اعضاء کے بارہ میں بھی صحیح اور درست ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اس کے اعصابی نظام کے بارہ میں عضویاتی قانون بھی اتنے ہی اٹل ہیں جتنے کہ فلکیاتی قوانین قطعی اٹل ہیں۔ ان قوانین کو انسانی خواہشوں سے بدلا نہیں جا سکتا۔ ہم مجبور ہیں کہ ان کو اس طرح مانیں جیسے کہ وہ ہیں۔ عورتوں کو چاہئے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو خود اپنی فطرت کے مطابق ترقی دیں۔ وہ مردوں کی نقل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ تہذیب کی ترقی میں ان کا حصہ اس سے زیادہ ہے جتنا کہ مردوں کا ہے۔ انہیں اپنے مخصوص عمل کو ہرگز چھوڑنا نہیں چاہئے۔

(Man, the unknown, New York 1949, P.91)

یہ تھا عورت کے بارہ میں اسلام کا نظریہ جو کہ تقسیم کار کے اصول پر قائم کیا گیا ہے یعنی عورت گھر کے اندر کے کام کو سنبھالے اور مرد گھر سے باہر کے کام کو کرے، کیوں کہ فطرت نے گھر کے کام کی وہ تمام صلاحیتیں عورت میں رکھی ہیں جو اس کو درکار ہیں، اور مرد میں وہ تمام صلاحیتیں رکھی ہیں جو گھر کے باہر کے امور کو چلانے کے لئے اس کو درکار ہیں۔

اسی تقسیم پر ہزاروں سال سے زندگی کا نظام چل رہا تھا کہ آج سے دو اڑھائی سو سال قبل صنعتی انقلاب کے باعث زندگی کا یہ نظام ٹوٹنا شروع ہوا۔ اس صنعتی انقلاب کی وجہ سے عورتیں گھر کی چار دیواری سے نکل کر کارخانوں کی چار دیواری میں داخل ہوئیں۔ پہلے گھر کی کمائی کا انحصار صرف مردوں پر تھا، اب عورتیں بھی اس میں شریک ہو گئیں۔ جب وہ خود کفیل ہوئیں تو ان کے اندر یہ ذہن بھی پیدا ہوا کہ وہ مردوں کی پابندی سے آزاد ہو کر زندگی گزاریں۔

علم سیکھنے میں عورت کا حق:

علم سیکھنے میں بھی عورت کا اتنا ہی حق ہے جتنا مرد کا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔

﴿طلب العلم فريضة على كل مسلم﴾
(رواہ البیہقی فی الشعب، والطبرانی فی الاوسط، الفتح الکبیر: ۲/۲۱۳)
''علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔''
مسلم کا لفظ مرد اور عورت دونوں کو شامل ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص کے پاس کوئی لونڈی ہو وہ اسے اچھی تعلیم دے اور اچھا ادب سکھائے، پھر اسے آزاد کر کے اس کا نکاح کرے تو اس کے لیے دو اجر ہیں۔ (اخرجہ البخاری فی صحیح: ۵/۳۳۸)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں یا دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں، وہ ان کو ادب سکھائے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور ان کے نکاح کرے تو وہ اور میں قیامت کے روز دونوں اس طرح ہوں گے۔ آپ ﷺ نے اپنی سبابہ اور درمیانی انگلی کو ملا کر بتایا۔

(اخرجہ ابو داؤد ۴: ۳۳۸، رقم: ۵۱۴۷)

سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انصار کی عورتیں بہترین عورتیں ہیں۔ دین کی سمجھ اور تفقہ حاصل کرنے میں انہیں حیا مانع نہیں ہوتی۔
(اخرجہ البخاری: ۱/۶۰ و مسلم: ۱/۲۶۱، رقم: ۳۳۲)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو اہل بیت نبوی میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ چنانچہ کتاب اللہ کا ترجمان، سنت رسول ﷺ کا معبر اور احکام خداوندی کا معلم ان سے بہتر اور کوئی نہ تھا۔ عام لوگ رسول اللہ ﷺ کو صرف جلوت میں دیکھتے لیکن یہ جلوت وخلوت دونوں میں دیکھتی تھیں۔ اس وجہ سے علمی حیثیت سے آپ کا پایہ بہت بلند تھا۔ آپ کو نہ صرف دوسری امہات المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنھن پر، نہ صرف خاص خاص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر بلکہ چند بزرگ صحابہ رضوان اللہ عنہم کو چھوڑ کر تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر علمی فوقیت حاصل تھی۔ چنانچہ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:
''ہم صحابہ رضی اللہ عنہم کو کوئی ایسی مشکل بات کبھی پیش نہیں آئی کہ جس کے بارہ میں ہم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا اور ان کے پاس اس کے متعلق کچھ معلومات

ہم کون فی ہوں۔'' (اخرجہ الترمذی: ۵/۵،۷، رقم: ۳۸۸۳)

اور ہشام بن عروہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں حلال وحرام کے مسائل اور علم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے زیادہ عالم نہیں دیکھا۔
(مستدرک حاکم ۴:۱۲، رقم: ۶۷۳۳)

امام زہریؒ فرماتے ہیں:

''اگر تمام مردوں کا امہات المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن کا علم ایک جگہ جمع کیا جاتا تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا علم ان سب سے زیادہ گیرائی اور گہرائی والا ہوگا۔''

(مستدرک حاکم)

آپ کے بھانجے عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن، فرائض، حلال و حرام، فقہ، شاعری، طب، تاریخ عرب اور علم الانساب کا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر اور کسی کو عالم نہیں دیکھا۔'' (زرقانی: ۳/۲۲۷)

امام بلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ شفا عدویہ جن کا تعلق سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے قبیلے بنی عدی سے تھا، یہ زمانہ جاہلیت میں فن کتابت کی ماہر تھیں اور وہ لڑکیوں کو اس کی تعلیم بھی دیتی تھیں، اور حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے شادی سے قبل اس سے قرأت اور کتابت سیکھی تھی۔ جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے شادی کی تو رسول اللہ ﷺ نے شفا عدویہ کو طلب فرمایا کہ وہ عورتوں کو کتابت اور علم سکھائے۔

امہات المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن، صحابیات اور ان کے بعد تاریخ اسلام میں ایسی بے شمار عورتیں ہیں جنہوں نے مختلف ادوار میں علم سے بہرہ وافر حاصل کیا اور اپنی اولاد کو بھی علم کی دولت سے مزین کیا۔ تاریخ نے ان کے ناموں کو اپنے صفحات میں محفوظ رکھا ہوا ہے۔

عمل میں عورت کا حق:

اسلام نے عورت کو عمل اور کام کاج میں بھی پورا پورا حق دیا ہے اور اس کی اہلیت کو ایک آدمی کے برابر تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ وہ خرید وفروخت اور معاہدات اور عقود بھی

کر سکتی ہیں۔" کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿انما النساء شقائق الرجال﴾

"عورتیں مردوں کی جنس میں سے ہیں۔"

یعنی وہ بھی مردوں کی طرح خصلتیں اور عادتیں رکھتی ہیں کیوں کہ مردوں میں سے نکلی ہیں۔ اس لئے کہ حواء آدم علیہ السلام سے نکلی تھی۔

(رواہ ابوداؤد: ۲۳۶، والترمذی: ۱/۳۲۸، والدارمی: ۱/۲۰۷، واحمد فی مسندہ: ۶/۲۵۶، ۲۷۷ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کشف الخفا: ۲/۳۵۴)

لیکن اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے درمیان حیاتیاتی فرق رکھا ہے، اس وجہ سے عورت کا حلقۂ عمل گھر ہے اور مرد کا گھر سے باہر۔ عورت گھر کی مملکت میں کلی اختیارات رکھتی ہے، اگرچہ یہ تجارت وغیرہ بھی کر سکتی ہے لیکن جب اس کا نان ونفقہ مرد کے ذمہ ہے تو اس کو تجارت کرنے سے احتراز ہی کرنا چاہئے اور پوری توجہ اور دل جمعی کے ساتھ اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت کرنا چاہئے۔ آج کل تحریک آزادیٔ نسواں میں عورت پر بڑا ظلم کیا گیا ہے۔ فطرت نے جو ذمہ داریاں عورت پر ڈالی ہیں ان کے علاوہ مردوں نے اپنی الگ ذمہ داریاں ان پر ڈال دی ہیں جن کو عورتیں اپنی حماقت کی وجہ سے اپنی آزادی سمجھ بیٹھی ہیں۔

تحریک آزادیٔ نسواں کو پورے دو سو سال ہو گئے، اور ان ملکوں میں یہ تحریک پوری طرح کامیاب ہو چکی ہے جو صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ہیں۔ ان ملکوں میں عورت اور مرد کی برابری کے قوانین بھی بنائے جا چکے ہیں اور قانون یا رواج اور سماج کے لحاظ سے آج کی عورت کے راستہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود عورت اب بھی مرد سے بہت پیچھے اور کم تر ہے اور وہ زندگی کے کسی شعبہ میں مرد کی برابری نہیں کر سکی۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے لکھا ہے:

"اقتصادی میدان میں گھر سے باہر کام کرنے والی عورتیں بہت زیادہ تعداد میں کم تنخواہ پانے والے کاموں میں ہیں، اور ان کا درجہ (Status) سب سے کم اور نیچا ہے حتیٰ کہ عورتیں ہر اس کام میں جو عورتیں اور مرد دونوں کرتے

ہیں، کم تنخواہ پاتی ہیں۔ 1982ء میں امریکہ میں خاتون کارکنوں کی اوسط تنخواہ مردوں کے مقابلہ میں ۶۰ فیصد تھی۔ جاپان میں یہ اوسط ۵۵ فیصد ہے۔ سیاسی طور پر عورتیں قومی اور مقامی حکومتوں نیز سیاسی پارٹیوں میں بڑے پیمانے پر نمائندگی سے محروم ہیں۔" (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا: ۳۲/۱۰ ے)

قانونی اور سماجی لحاظ سے جب عورت کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہ رہی تو وہ پھر بھی مرد سے کم تر رہی۔ اس کی وجہ وہ نہیں جو حکیمان آزادی نسواں نے تشخیص کی۔ ان کی تشخیص یہ تھی کہ ان دونوں صنفوں میں یہ فرق سماجی حالات کی بنا پر ہے حالانکہ یہ فرق اسلام کی نشان دہی کے مطابق پیدائشی بناوٹ کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ یورپ کے مفکرین نے اس مسئلہ پر بڑی تحقیق کی اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جب تک یہ فرق رہے گا دونوں کی سماجی حیثیت میں بھی فرق رہے گا۔

مرد و زن کے بارہ میں اسلام کے نظریہ کے برعکس آزادی نسواں کے علم برداروں نے عورت کی وہ مٹی پلید کی کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئی۔

I wish I had stayed home.

کاش کہ میں اپنے گھر ہی میں رہتی۔ (ٹائمز آف انڈیا ۸ نومبر ۱۹۸۱ء)

مختصر یہ کہ عورت کو تجارت اور سیاسی امور میں حصہ لینے کی اجازت ہے لیکن اس سے گھر کی سیاست تباہ و برباد ہو جاتی ہے اور خاندانی نظام غارت ہو جاتا ہے۔ دوسرا رسول اللہ ﷺ نے بعثت سے قبل اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح سے پہلے سیدہ رضی اللہ عنہا کے خادم میسرہ کے ساتھ سیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مال سے تجارتی سفر کیا، لیکن نکاح کے بعد سیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے تجارت کا شغل یک قلم ترک کر دیا اور اپنی ساری دولت حضور ﷺ کے قدموں میں ڈال دی۔ لیکن اگر عورت کو تجارت کرنے کی ضرورت ہو تو اسلام اس سے منع بھی نہیں کرتا۔ اگر عورت کو کوئی ایسا وسیلہ یا کوئی ایسا آدمی مل جائے جو اس کے کام کر سکے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے، جیسا کہ سیدنا شعیب علیہ السلام کی صاحبزادیاں اپنے بوڑھے باپ کی بجائے بکریوں کو پانی پلانے لے جاتی تھیں، پھر سیدنا موسیٰ علیہ السلام اس خدمت کے لئے مل گئے، لہٰذا انہوں نے یہ کام چھوڑ دیا، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿قالت احداھما یا ابت استاجرہ ان خیر من استاجرت القوی الامین﴾ (قصص:۲۶)

''ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک نے کہا: اے اباجان! آپ ان کو اجرت پر رکھ لیجئے، بے شک آپ جس کو اجرت پر رکھیں گے ان میں بہترین وہی ہے جو طاقت ور اور ایمان دار ہو۔''

بعض روایات میں آتا ہے کہ سیدنا شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی سے پوچھا کہ تو نے یہ جو کہا ہے کہ یہ (موسیٰ علیہ السلام) قوی اور امین ہیں، تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟ کہ یہ طاقت ور اور ایمان دار ہیں؟ اس پر ان کی بیٹی نے کہا کہ جس کنویں سے انہوں نے پانی پلایا تھا اس پر اتنا بھاری پتھر رکھا ہوتا ہے کہ دس آدمی مل کر اس پتھر کو اٹھاتے ہیں، لیکن انہوں نے اکیلے ہی اس پتھر کو اٹھالیا تھا۔ یہ ان کے طاقت ور ہونے کی دلیل ہے۔ اور ان کے ایمان دار اور متقی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ راستہ بتانے کے لئے میں ان کے آگے آگے چل رہی تھی۔ ہوا سے بار بار میری چادر اڑ جاتی تھی تو انہوں نے کہا: تم پیچھے پیچھے چلو، میں آگے آگے چلتا ہوں تاکہ میری نظر تمہارے جسم کے کسی حصہ پر نہ پڑے، اور راستہ کی نشاندہی کے لئے پیچھے سے کوئی پتھر یا کنکری ماردیا کرو۔

(تفسیر ابن ابی حاتم، رقم: ۱۶۸۴۴، ۱۶۸۵۳)

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ملازم رکھنے کے لئے یہ دو صفات کا ہونا ضروری ہے۔ ایک تو جو کام اس نے کرنا ہے اس کی اہلیت ہو اور دوسری صفت یہ ہے کہ ایمان دار ہو۔ یہ ایمان داری کی صفت آج کل ملازمین میں مفقود ہے کہ ملازم رکھتے وقت اس کا التزام نہیں کیا جاتا۔

عورت کو اسلام میں باہر کا کام اس صورت میں کرنے کی اجازت ہے اگر یہ کام خاوند کی خدمت اولاد کی تعلیم و تربیت میں مخل نہ ہو اور پردہ، حیا اور غیر مردوں سے عدم خلوت بھی اس کے لئے ضروری ہے۔ اس کی قلبی رقت جو فطری طور پر اس میں موجود ہے، اس کے تاجر اور سیاسی بننے کے بجائے اس کے بیوی اور ماں بننے کے لئے ہے۔ اس وجہ سے اس کو کام بھی ایسا کرنا چاہئے جو اس کی گھر کی اندرونی زندگی کے لئے مفید

ہو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿علموا ابناء کم السباحة والرمی، والمرأة الغزل﴾

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان، الفتح الکبیر: ۲/۲۳۱)

''اپنے بچوں کو تیراکی اور تیر اندازی سکھاؤ اور عورتوں کو چرخہ کاتنا۔''

چرخہ کاتنے سے مراد ہر وہ کام جو عورت کی گھریلو زندگی کے لئے مفید ہو اور سیدہ عائشہ ؓ فرماتی ہیں:

﴿المغزل بید المرأة احسن من الرمح بید المجاهد فی سبیل الله﴾ (حقوق الانسان فی الاسلام للدکتور محمد الزحیلی ص: ۲۸۷)

''عورت کے ہاتھ میں چرخہ ایک مجاہد فی سبیل اللہ کے ہاتھ میں نیزہ سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔''

عورتیں کبھی کبھی وہ کام اور عبادات بھی کرسکتی ہیں جو مردوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ جیسے جمعہ، جماعت اور جہاد وغیرہ اور جہاد میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا جیسے سیدہ ام عمارہ ؓ جنگ احد میں ابن قمیئہ۔ اقماہ اللہ۔ نے زخمی کر دیا تھا اور اس کے زخموں سے خون جاری تھا۔ ان کو میدان جنگ میں بڑی چوٹیں آئی تھیں۔ (ابن ہشام: ۳/۶۶)

اسی طرح سیدنا انس ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عائشہ بنت ابی بکر ؓ اور سیدہ ام سلیم ؓ (یہ سیدنا ابوطلحہ انصاری کی بیوی تھیں جن کے ہاتھوں سے کئی کمانیں ٹوٹیں) کو دیکھا کہ پنڈلی کی پازیب تک کپڑے چڑھائے پیٹھ پر پانی کے مشکیزے لا رہی تھیں اور زخمیوں کو پلا رہی تھیں۔ (بخاری: ۱/۴۰۳، ۲/۵۸۱)

اسی طرح سیدنا ابوسعید خدری ؓ کی والدہ ام سلیط ؓ بھی مشک میں پانی بھر بھر کر زخمیوں کے لئے لاتی تھیں۔ سیدہ فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ نے بھی سرکار دو عالم اللہ ﷺ کے زخم دھوئے اور چٹائی کا ٹکڑا لے کر اس کو جلایا اور زخموں پر چپکا دیا۔

(بخاری: ۳/۵۸۴)

ایسے ہی صفیہ بنت عبدالمطلب ؓ نے جنگ خندق میں قلعہ سے باہر نکل کر

ایک یہودی کو مار دیا تھا۔ (سیرۃ ابن ہشام: ۳/۱۸۲،۱۸۱)

ایک مرتبہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی اور عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! یہ جہاد مسلمان مردوں پر فرض کیا گیا ہے، اگر وہ کامیاب ہوتے ہیں تو ان کے لئے اجر عظیم ہے اور اگر وہ شہید ہو جاتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں زندہ ہیں اور رزق دیئے جاتے ہیں لیکن ہم عورتوں کا گروہ اس سے محروم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو عورت تمہیں ملتی ہے اس کو میری طرف سے پیغام پہنچا دو۔

﴿أن طاعة المرأة زوجها و اعترافها بحقه يعدل ذالك،
و قليل منكن من يفعله﴾

(الترغیب والترہیب: ۳/۳۰۲۸۴ص ۱۲۰، وذکرنحوہ ابن عبدالبر فی الاستیعاب، برقم: ۳۳۲۳)

اسی سلسلہ میں ایک اور روایت ہے کہ جس میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: "یا رسول اللہ ﷺ! ہم سمجھ رہی ہیں کہ جہاد سب سے افضل عمل ہے۔ کیا ہم جہاد نہ کریں؟" حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

﴿لكن افضل الجهاد حج مبرور﴾

(بخاری مع الفتح: ۶/۸۰، ۲۸۰۸)

"لیکن سب سے افضل جہاد (عورتوں کے لئے) حج مبرور ہے۔"

اس لئے اگرچہ عورت کو باہر کام کرنے کی اجازت ہے لیکن گھر میں اس کا کام کرنا افضل ہے۔ اگرچہ وہ جہاد کر سکتی ہے لیکن حج اس کے لئے افضل الجہاد ہے۔ اگرچہ وہ مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھ سکتی ہے، لیکن اس کا گھر میں نماز پڑھنا بہتر ہے۔ لہٰذا ایک دانشور اور عقل مند عورت افضل شے اپنے لئے اختیار کرتی ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے مذکورہ بالا حدیث میں متنبہ فرما دیا کہ عورت کا اپنے خاوند کی اطاعت و فرمان برداری جہاد کے برابر ہے۔ لیکن بہت کم عورتیں اس بات کو سمجھتی ہیں۔ اگر کوئی عورت باہر کام کرنے پر مجبور ہو اور اس کے معاشی حالات اس کو باہر کام کرنے پر مجبور کر دیں تو اس کے لئے شرط یہ ہے کہ بغیر میک اپ اور بناؤ سنگھار اور مردوں سے عدم خلوت ہو، وگرنہ وہ اللہ تعالیٰ کے

ہاں گنہ گار ہوگی۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿المرأة عورة، فاذا اخرجت استشرفها الشیطان﴾

(ترمذی رقم ۱۱۷۳، جامع الاصول: ۲/ ۶۶۵)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''میں نے اپنے بعد عورتوں کے فتنہ سے زیادہ ضرر رساں اور کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔'' (بخاری، رقم: ۵۰۹۶، مسلم: ۲۷۴۰، عن اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ)

اور قرآن حکیم میں ہے:

﴿ولیضربن بخمرهن علیٰ جیوبهن﴾ (النور: ۳۱)

''اور عورتیں اپنے دوپٹوں کو اپنے گریبانوں پر ڈالے رکھیں۔''

اس آیت میں بتایا یہ گیا کہ عورتیں اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں۔ زینت دو قسم کی ہے۔ ایک ظاہرہ زینت ہے۔ وہ عورتوں کا لباس ہے اور ایک مخفی زینت ہے۔ وہ عورتوں کے زیورات ہیں۔ (جامع البیان، رقم: ۱۹۹۴۳)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا! اللہ تعالیٰ ہجرت کرنے والی خواتین پر رحم فرمائے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی ''ولیضربن بخمرهن علیٰ جیوبهن'' تو انہوں نے اپنی چادروں کو پھاڑ کر دو ٹکڑے کئے اور ان سے اپنے سینوں کو ڈھانپ لیا۔

(جامع البیان، رقم: ۱۹۹۶۵، ابوداؤد، رقم: ۴۱۰۰، تفسیر ابن کثیر سورۃ النور: ۳/ ۳۷۹_۳۸۰، بخاری: ۸/ ۴۵۹، تفسیر ابن ابی حاتم: ۸/ ۲۵۷۵)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اور اپنی زیبائش صرف اپنے شوہروں پر ظاہر کریں'' اس زیبائش سے مراد زیورات وغیرہ ہیں، اور رہے عورتوں کے بال تو ان کو ان کے شوہروں کے سوا اور کسی کے سامنے ظاہر کرنا جائز نہیں ہے۔'' (جامع البیان: ۱۹۹۹۳)

علی بن طلحہ بن ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مومن عورتوں کو حکم دیا کہ جب وہ کسی ضرورت سے باہر نکلیں تو اپنے چہروں کو اپنے سروں کے اوپر سے

چادروں سے چھپائیں۔ صرف ایک آنکھ ظاہر ہو۔ (الحجاب والسفور ص:۵۲)

ایک حدیث میں ہے کہ اگر عورتیں کسی ضرورت کے تحت باہر نکلیں تو خوشبو لگا کر نہ نکلیں۔ چنانچہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس عورت نے خوشبو کا استعمال کیا ہو وہ ہمارے ساتھ رات کی پچھلی (عشاء کی) نماز میں نہ آئے۔'' (رواہ ابوداؤد، رقم: ۴۱۷۵، نسائی: ۱۵۴/۸)

رات کو آنے میں فتنے کا بیشتر احتمال ہوتا ہے۔ اس سے دوسری نمازوں کا بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ دن کو عورتوں کی طرف توجہ زیادہ ہوگی۔

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا: ''جس عورت نے اس مسجد میں آنے کے لئے خوشبو لگائی اس کی نماز قبول نہیں ہوتی جب تک واپس جا کر اس طرح کا غسل نہ کرے جیسا کہ جنابت کا غسل ہوتا ہے۔'' جنابت کے غسل سے یہ مراد ہے کہ خوب اچھی طرح جسم کو صاف کرے تاکہ خوشبو کا اثر زائل ہو جائے اور آئندہ کو عبرت ہو کہ مسجد میں جانے کے لئے ایسا نہ کرنا چاہیے۔ (ابوداؤد: ۴۱۷۴)

سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے اس بارہ میں ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب کوئی عورت خوشبو لگا کر لوگوں پر گزرے تاکہ وہ اس کی خوشبو پائیں تو وہ ایسی اور ویسی ہے۔ آپ نے شدید بات فرمائی۔ ترمذی اور نسائی کی روایت میں ہے کہ وہ زانیہ ہے۔

(رواہ النسائی: ۱۳۵/۸، ابوداؤد، رقم: ۴۱۷۳، ترمذی، رقم: ۲۷۸۶ وقال: حسن صحیح)

ان احادیث سے واضح ہوا کہ عورت کسی خاص ضرورت کے تحت باہر نکلے اور پھر اس کے باہر نکلنے پر شریعت نے مختلف قیود لگائیں جیسے شرم، حیاء اور اللہ کا خوف اس کے دل میں ہو۔

مختصر یہ کہ عورت کا اگرچہ باہر نکل کر کام کرنا اگرچہ شریعت نے ضرورت کے تحت اس کی اجازت دی ہے، لیکن اس پر کچھ پابندیاں لگا دیں۔ پھر عورت کو غیر مردوں سے خلوت میں ملنے سے منع کیا۔ کیونکہ شیطان مرد اور عورت دونوں کے دلوں میں مختلف وساوس ڈال سکتا ہے۔ پھر جب کہ اس زمانہ عورتیں تبرج جاہلیت کے ساتھ اور پورا میک

اپ کر کے باہر نکلتی ہیں اور میک اپ کرنے سے ان کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ غیر مرد انہیں دیکھیں۔ یہ بات شریعت کو بالکل پسند نہیں ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کوئی مرد کسی عورت سے خلوت میں بات نہ کرے مگر یہ کہ ان میں کوئی تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے شریعت نے عورت کے سربراہ مملکت ہونے سے منع فرمایا۔ چنانچہ جب نبی اکرم ﷺ کو پتہ چلا کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنی مملکت کا سربراہ بنالیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأة﴾

"وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پاسکتی جس نے اپنے امور میں ایک عورت کو حاکم بنالیا۔"

(بخاری: ۲/ ۱۲۷، ۱۰۵۲، ترمذی: ۲/ ۵۱، نسائی ۲/ ۴۳، مستدرک حاکم: ۴/ ۵۲۵، مسند احمد: ۵/ ۴۳، برقم: ۱۰۴۷، مسند ابی داؤد طیالسی، رقم: ۸۷۸، ابن حبان: ۱۰/ ۴۵۱۶، مصنف ابن ابی شیبہ: ۵/ ۲۲۶، سنن کبریٰ بیہقی: ۱۰/ ۱۱۷، شرح السنۃ، رقم: ۶/ ۲۴۸۶)

قاضی شوکانیؒ نے لکھا ہے کہ:

"یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورت حکومت وولایت کی اہل نہیں ہے اور کسی قوم کے لئے عورت کو اپنا سرپرست مقرر کرنا جائز نہیں ہے کیوں کہ ایسے فعل سے بچنا ضروری ہے جو عدم فلاح اور خسران کا موجب ہو۔"

(نیل الاوطار: ۹/ ۱۶۸)

ایسا ہی امام قرطبی اور علامہ عزیزی نے لکھا ہے۔

(تفسیر قرطبی: ۱۳/ ۱۸۳، السراج المنیر ص: ۲۱۰)

مشہور محدث اور فقیہ علامہ علی القاریؒ نے لکھا ہے کہ:

﴿لاتصلح المرأة ان تکون اماماً ولاقاضیاً﴾

(مرقات: ۷/ ۲۱۵)

"عورت امامت اور قضا کے منصب کی صلاحیت نہیں رکھتی۔"

کیوں صلاحیت نہیں رکھتی؟ اس کی وجہ ملا علی القاریؒ نے یہ بیان فرمائی ہے:
''کیوں کہ ان دونوں باتوں میں مسلمانوں کے معاملات نپٹانے کے لئے باہر نکلنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور عورت سراپا ستر ہے، اور یہ باہر نہیں جا سکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ عورت ناقص ہے اور عہدہ قضا کا تعلق کمال ولایت سے ہے، لہٰذا امامت اور قضا کے لئے کامل آدمی کا ہونا ضروری ہے۔''

(مرقات: ۷/۲۱۵)

قاضی ابوبکر ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:۔
''عورت سربراہی کی اس لئے اہل نہیں ہے کہ حکومت اور سربراہی سے یہ غرض ہوتی ہے کہ سرحدوں کی حفاظت کی جائے، قومی امور کو سلجھایا جائے، ملت کی حفاظت و نگہداشت کی جائے اور مالی محاصل حاصل کر کے ان کو مستحقین میں تقسیم کیا جائے اور یہ تمام امور ایک مرد ہی انجام دے سکتا ہے۔ عورت ان تمام معاملات کی ادائیگی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی کیوں کہ عورت کے لئے مردوں کی مجلس میں جانا اور ان سے اختلاط کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اگر عورت جوان ہے تو اس کی طرف دیکھنا اور اس سے کلام کرنا حرام ہے اور اگر وہ سن رسیدہ اور معمر ہے تب بھی اس کا بھیڑ بھاڑ میں جانا خطرہ سے خالی نہیں۔''

(احکام القرآن: ۳/۱۴۵ ملخصاً)

اسی وجہ سے اسلام نے عورتوں اور مردوں کو نظریں نیچی رکھنے کی ہدایت کی۔

(النور: ۳۱)

اور رسول اللہ ﷺ نے اجنبی عورتوں کی طرف نظر کرنے کو ''شیطان کا مسموم تیر'' کہا ہے۔ (اخرجہ الطبرانی عن ابن مسعود مرفوعاً تفسیر ابن کثیر: ۲/۵۹۸)

اور رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے بارہ میں خوش خبری سنائی جو اجنبی عورتوں سے اجتناب کرتا ہے۔ چنانچہ وہ سات اشخاص جو روز قیامت اللہ کے عرش کے سایہ کے نیچے ہوں گے، جس روز سوائے اللہ کے عرش کے سایہ کے اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿رجل دعته امرأة ذات منصب و جمال، فقال: انی اخاف اللہ﴾

''وہ (بھی اللہ کے عرش کے سایہ میں ہوگا) جس کو ایک حسین و جمیل اور صاحب حسب ونسل عورت بلائے اور وہ کہے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں (میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا)''

(فیض القدیر مناوی: ۴/۸۸، رقم: ۴۶۴۵)

ان سب آیات قرانیہ اور احادیث نبویہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے عورت اور مرد میں نیک اعمال میں مساوات رکھی ہے۔ (سورۃ النساء: ۱۱۴)

یعنی عمل صالح پر جیسا مردوں کو اجر ملتا ہے ایسا ہی عورتوں کو اجر ملے گا، اور برے اعمال پر جیسا مردوں کو گناہ ہوتا ہے ویسا ہی گناہ عورتوں کو ہوگا۔

﴿من یعمل سوءً یجزبہ﴾ (سورۃ النساء: ۱۲۳)

اور اسلام میں نان ونفقہ اور اپنے بچوں کی ضروریات زندگی پوری کرنے کا مکلف مرد کو بنایا گیا ہے نہ کہ عورتوں کو۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿کفی بالمرء اثماً أن یضیع من یعول﴾

(ابوداؤد، رقم: ۱۶۹۲، مستدرک حاکم: ۱/۴۱۵، مسند احمد: ۲/۱۹۰)

''آدمی کے گناہ گار ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ جن کی روزی کا ذمہ دار ہے ان کے حقوق کو ضائع کر دے۔''

موجودہ زمانہ میں جو عورت اور مرد کی مساوات کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے وہ غیر فطری مساوات ہے۔ مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی فیکٹریوں اور دفتروں میں کام کرنے پر زور دیا جا رہا ہے اور اس کو مرد وزن کی مساوات کا نام دیا جا رہا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ عورت گھر سے نکلی تھی مردوں کے شانہ بشانہ ہر شعبہ زندگی میں کام کرنے اور ان کے ساتھ برابری کرنے کے لئے لیکن وہ نہ گھر کی رہی اور نہ باہر کی۔ گھر سے نکلی تو گھر بگڑا۔ گھر بگڑنے سے پورا معاشرہ بگڑا اور معاشرہ بگڑنے سے پوری قوم بگڑی، اور قوم میں زنا،

چوری، ڈاکے اور دوسری اخلاقی اور سماجی بیماریوں نے جنم لیا۔

عورت کے بارہ میں تہذیب جدید کا نظریہ مساوات بظاہر عورت کا درجہ بلند کرنے کے ہم معنی ہے لیکن عملی طور پر وہ عورت کا درجہ گرانے کے معنوں میں ہے۔ امریکہ اس وقت تمام دنیا میں تہذیب جدید کا مرکز سمجھا جاتا ہے وہاں کے معاشرہ میں بھی عورت کو ابھی تک وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا جس کا آج پاکستان میں تہذیب جدید کے گہوارہ میں پرورش پانے والی خواتین مطالبہ کر رہی ہیں، بلکہ امریکی عورت آج پہلے سے زیادہ مشقتوں میں جتا ہے۔

شادی کے بارہ میں عورت کا حق آزادی:

شادی کے بارہ میں اسلام نے عورت کو حق آزادی دیا ہے اور اس کو پورا پورا اختیار دیا ہے کہ وہ جس سے چاہے شادی کرے اور جس شخص کو چاہے اپنا جیون ساتھی بنائے۔ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ ولی کو عورت کی رائے ضرور لینی چاہئے اگر وہ اس شخص کو قبول کرلے تو نکاح پڑھوا دینا چاہئے اور اگر وہ اس کو پسند نہ کرے تو اس کو مجبور نہیں کیا جا سکتا، اور دوشیزہ عورت کے لئے اس کا سکوت ہی اس کی اجازت ہے، البتہ شوہر دیدہ عورت زبان سے اجازت دے۔ (بخاری: ۹/۵، رقم: ۵۸۴۳، مسلم: ۱۰۳۶/۲، رقم: ۱۴۲۱، ۹)

بیٹی کی رائے لینے میں ماں سب سے زیادہ اقرب اور مناسب ہے، چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا:

"عورتوں سے ان کی بیٹیوں کے بارہ میں مشورہ لو (کیونکہ باپ سے زیادہ ماں اس کے حال کو جانتی ہے)"

وجہ اس کی یہ ہے کہ بیٹیاں ماؤں کے ساتھ زیادہ مانوس ہوتی ہیں اور ان کی بات زیادہ مانتی ہیں، مائیں اپنی بیٹیوں کے بارہ میں جو کچھ جانتی ہیں مثلاً ان کی دلی رغبت ورضا اور میلان و رجحان، اس کا علم باپ کو نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں بیٹیوں کی بعض خفیہ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو وہ ماں کو بتا دیتی ہیں یا ماں کو اس کا علم ہو سکتا ہے باپ کو نہیں۔

یتیم بچی کا وصی بھی اس کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح نہیں کر سکتا۔ کیوں

کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''یتیم لڑکی سے بھی اجازت لی جائے، اگر وہ خاموش رہے تو یہ اس کی اجازت ہے اگر وہ انکار کر دے تو زبردستی اس کا نکاح نہیں پڑھایا جاسکتا۔ (ترمذی، رقم: ۱۱۰۹، ابن حبان ۹/۳۹۹)

شریعت نے عورت کو یہ حق دیا ہے کہ وہ نکاح کو فسخ کر سکتی ہے جو اس کے ولی نے اس کی پسند کے خلاف کیا ہو کیوں کہ خنساء بنت خدام ﷞ کی اس کے باپ نے شادی کی وہ اسے ناپسند کرتی تھی اور وہ ایک شوہر دیدہ عورت تھی۔ (یعنی ثیبہ تھی) چنانچہ وہ سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ آپ ﷺ نے اس کے نکاح کو فسخ فرما دیا۔ (بخاری، رقم: ۴۸۴۵)

اسی طرح سیدنا ابن عباس ﷜ فرماتے ہیں کہ ایک کنواری عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ اس کے باپ نے اس کی شادی کردی ہے لیکن وہ اسے ناپسند کرتی ہے۔ آپ ﷺ نے اس کو نکاح قائم رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار دے دیا۔ (اخرجہ ابوداؤد، رقم: ۲۰۹۶، ابن ماجہ، رقم: ۱۸۷۵، مسند احمد: ۱/۲۷۳، رقم: ۲۴۷۵)

زمانہ نبوی میں ایک شخص نے اپنی بیٹی کا نکاح اس کے مشورہ کے بغیر اس کے چچا زاد سے کر دیا۔ اس نے اس بارہ میں رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی کہ میرے والد نے میری شادی میرے چچا زاد سے کر دی ہے اور وہ مجھے پسند نہیں ہے، اس عورت کی رشتہ سے ناگواری سن کر آپ ﷺ نے معاملہ عورت کے ہاتھ میں دے دیا کہ تم کو اس نکاح کے رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار ہے۔ اس نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! میں اس نکاح کی اجازت اپنے باپ کو دے چکی ہوں (لہٰذا اس نکاح کو رکھتی ہوں)

﴿ولکن اردت ان اعلم الناس انه ليس للآباء من الامر شیء﴾

''لیکن میں نے لوگوں کو یہ بتا دینا چاہا کہ باپ دادا کے ہاتھ نکاح کے معاملہ میں کچھ نہیں ہے۔''

(اخرجہ ابن ماجہ، رقم: ۱۸۸۴، مسند احمد، رقم: ۲۵۰۴۱، رقم: ۲۵۰۴۱)

اپنے نسب کے بارے میں عورت کا حق:

موجودہ تہذیب میں جس کو اپنانے کے لئے مرد و زن دیوانہ وار جدوجہد میں معروف ہیں اس تہذیب نے عورت کی شخصیت کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ جب وہ کنواری ہوتی ہے تو وہ مس فلاں کہلاتی ہے اور جب اس کی شادی ہو چکتی ہے تو اب مسز فلاں ہے۔ عورت کی اپنی شخصیت درمیان سے ختم ہو جاتی ہے بلکہ شادی کے بعد اس کی باپ کی شخصیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اسلام نے عورت کے نام اس کے قبیلے اور اس کے باپ کی بھی حفاظت کی اور اس طرح سے حفاظت کی کہ اس کی شخصیت کو قائم و دائم رکھا۔ آپ سرکار دو عالم ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن ہی کو دیکھ لیں، آپ ﷺ سے شادی کے بعد بھی ان کا انتساب حضور ﷺ کی طرف نہیں ہوتا تھا حالانکہ آپ کی طرف منسوب کرنا ان کے لئے ایک نہایت باعث شرف چیز تھی۔ لیکن نکاح کے بعد بھی ان کے نام، ان کے باپوں کے نام اور ان کے قبائل کے نام اسلام میں ان کی شخصیت کے مقام کے پیش نظر محفوظ اور قائم رہے۔ چنانچہ ان کو اس طرح پکارا جاتا تھا عائشہ بنت الصدیق رضی اللہ عنہ، سودہ بنت زمعہ، حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہ، سیدہ فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ کے نام سے پکاری جاتی تھی حالانکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ان کی شادی ہو چکی تھی۔ اس سے پتہ چلا کہ اسلام نے ایک عورت کو ایک کامل شخصیت عطا فرمائی ہے۔ کسی کا ضمیمہ اور تتمہ نہیں بنایا۔ ان کا اپنا نام بھی باقی رکھا، ان کے باپوں اور قبیلوں کا نام بھی قائم رکھا یہاں تک کہ ان کی شادیاں ہو چکی تھیں۔

عورت کا حق مہر:

اسلام نے حق مہر کو عورت کی تکریم و تشریف کے لئے واجب اور ضروری قرار دیا، اور اس کو اس کی ملکیت قرار دیا اور یہ بتایا کہ حق مہر اس کو خوش دلی سے ادا کیا جائے، ڈنڈ سمجھ کر ادا نہ کیا جائے۔ اس میں زوجین میں الفت و محبت اور رحمت و مودت کے جذبات کی توثیق پائی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿وءاتوا النساء صدقاتهن نحلة، فان طبن لكم عن شئ

منه نفسًا فكلوه هنيئًا مريئًا﴾ (نساء:۴)

''اور عورتوں کو ان کے مہر نحلہ (خوشی سے) ادا کرو اور پھر اگر وہ خوشی سے اس (مہر) میں سے تم کو کچھ دیں تو اس کو مزے سے کھاؤ۔''

مہر کی ادائیگی میں شریعت نے اس قدر تاکید کی کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جس شخص نے کسی عورت کا مہر مقرر کیا اور اللہ کو علم ہے کہ اس کا ارادہ مہر ادا کرنے کا نہ تھا۔ اس شخص نے اس عورت کو دھوکا دے کر اس کی فرج کو حلال کر لیا۔ قیامت کے روز وہ اللہ سے زانی ہونے کی حالت میں ملاقات کرے گا اور جس شخص نے کسی شخص سے قرض لیا اور اللہ کو علم ہے کہ اس کا ارادہ اس قرض کو واپس کرنے کا نہ تھا، بخدا اس نے اس شخص کو دھوکا دیا اور باطل کے عوض اس کے مال کو حلال کر لیا، وہ قیامت کے دن اللہ سے چور ہونے کی حالت میں ملاقات کرے گا۔'' (مسند احمد: ۳/۳۳۲، معجم کبیر طبرانی، رقم: ۷۳۰۱)

اسی مضمون کی حدیث مجمع الزوائد: ۴/۱۳۲، معجم اوسط، رقم: ۱۸۷۲، معجم صغیر رقم ۱۱۱ میں بھی ہے

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے انصار کی ایک عورت سے نکاح کیا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس سے (پہلا) سوال یہ کیا کہ تم نے اس کا کتنا مہر مقرر کیا۔ انہوں نے کہا کہ ایک گٹھلی کے برابر سونا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ولیمہ کرو خواہ ایک بکری ہی سے کرو۔''

(بخاری، رقم: ۵۱۶۷، ۵۱۵۵، مسلم، رقم: ۱۴۲۷، سنن ابی داؤد، رقم: ۲۱۰۹، نسائی، رقم: ۳۳۷۳، سنن الترمذی، رقم: ۱۰۹۴، سنن ابن ماجہ: ۱۹۰۷، موطا امام مالک، رقم: ۱۱۵۷، مسند احمد، رقم: ۱۳۳۷۹، سنن کبریٰ بیہقی: ۷/۲۳۲، معرفۃ السنن والآثار بیہقی: ۵/۳۷۰، ابن حبان: ۹/۳۶۶، شرح السنۃ بغوی: ۹/۱۳۲، مصنف عبدالرزاق: ۶/۱۷۷، مسند ابی یعلیٰ: ۵/۳۷۳، مسند ابی داؤد طیالسی: ۲۶۶، مسند حمیدی: ۲/۵۱۱ من طرق کثیرۃ عن انس رضی اللہ عنہ بعضہم مفصلاً وبعضہم مختصراً)

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک

عورت آئی اور اس نے کہا: "یا رسول اللہ ﷺ! میں آپ ﷺ کے پاس آئی ہوں اور میں نے اپنا نفس آپ ﷺ کو ہبہ کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف دیکھا، نظر اوپر اٹھائی پھر نظر نیچی کر لی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنا سر جھکا لیا۔ جب اس عورت نے یہ دیکھا کہ آپ ﷺ نے اس کے بارہ میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تو وہ بیٹھ گئی۔ آپ ﷺ کے اصحاب میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا: "یا رسول اللہ ﷺ! اگر آپ ﷺ کو اس کی حاجت نہیں ہے تو پھر اس سے میرا نکاح کر دیجئے۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: "تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟" اس نے کہا: "نہیں" آپ ﷺ نے فرمایا: "اپنے گھر جاؤ شاید تمہیں کوئی چیز مل جائے۔" وہ گیا پھر واپس آ گیا۔ اس نے کہا: "بخدا! مجھے کوئی چیز نہیں ملی" آپ ﷺ نے فرمایا: "دیکھو خواہ لوہے کی ایک انگوٹھی ہو، وہ گیا اور واپس آ گیا اور اس نے کہا: "بخدا! لوہے کی ایک انگوٹھی بھی نہیں ملی، لیکن میرے پاس صرف یہ تہبند ہے۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "وہ تمہارے تہبند کا کیا کرے گی؟" اگر تم اس کو پہنو گے تو اس کے پاس کچھ نہیں ہوگا، اور اگر وہ اس کو پہنے گی تو تمہارے پاس کچھ نہیں ہوگا، وہ شخص بیٹھ گیا۔ جب کافی دیر ہو گئی اور رسول اللہ ﷺ نے واپس جاتے ہوئے دیکھا تو آپ نے اس کو واپس بلانے کا حکم فرمایا۔ جب وہ آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "تمہیں کچھ قرآن یاد ہے؟" اس نے گن کر بتایا کہ اس کو فلاں فلاں سورت یاد ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "تم ان سورتوں کو زبانی پڑھتے ہو۔ اس نے کہا ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "جاؤ تمہیں جو قرآن یاد ہے اس کے سبب میں نے یہ عورت تمہاری ملک میں دے دی۔"

(بخاری، رقم: ۵۰۸۷، مسلم، رقم: ۱۴۲۵، سنن ترمذی، رقم: ۱۱۰۶، سنن ابوداؤد، رقم: ۲۱۱۱، سنن نسائی، رقم: ۳۲۰۰، سنن ابن ماجہ، رقم: ۱۸۸۹، موطا امام مالک: ۱۱۱۸، سنن الدارمی، رقم: ۲۲۰۱، مسند احمد: ۳۳۰/۵، ۳۳۶، سنن دارقطنی: ۲۴۷/۱، سنن کبری بیہقی: ۱۳۴/۷، معرفۃ السنن الآثار بیہقی: ۲۷۱/۵، ابن حبان: ۳۰۲/۹، شرح السنۃ بغوی: ۱۱۷/۹، معجم کبیر طبرانی: ۲۱۳/۶، مشکل الآثار: ۱۸۱/۳، شرح معانی الآثار: ۱۶/۳)

پھر اسلام نے مرد کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ بیوی کے دیئے گئے مال میں سے کچھ بھی واپس لے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿ولا یحل لکم أن تاخذوا مما آتیتموھن شیئا﴾

(بقرہ:۲۲۹)

''اور تمہارے لئے اس (مہر یا ہبہ) سے کچھ بھی لینا جائز نہیں ہے جو تم ان کو دے چکے ہو۔''

ان روایات سے معلوم ہوا کہ عورت کا حق مہر مرد کے ذمہ ضروری ہے اور اس کا ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ان تمام شرائط کا پورا کرنا تم پر ضروری ہے جن پر تم لوگوں نے اپنی بیویوں کی شرم گاہوں کو حلال قرار دیا ہے۔'' (بخاری:۲/۷۷۶)

عورت کا حق نان ونفقہ:

عورت کی شادی سے قبل اس کا باپ یا اس کا ولی اس کے نان ونفقہ کا کفیل ہوتا ہے اور شادی کے بعد اس کا خاوند اس کے نان ونفقہ کا ذمہ دار ہے۔ اور یہ نان ونفقہ اس کے ذمہ واجب ہے خواہ عورت امیر ہو یا غریب اور خواہ شوہر امیر ہو یا عسرت زدہ۔ کیونکہ شادی کے بعد عورت خاوند کے لئے محبوس ہو کر رہ جاتی ہے، اور اب اس کا سب دارومدار اس کے خاوند پر ہے۔ اس کے لئے خاوند کی اطاعت واجب ہے، اور گھر میں رہ کر گھر کی دیکھ بھال کرنا (تدبیر منزل) اور اولاد کی پرورش اور اس کی تربیت کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔ وجوب نفقہ کا ذکر قرآن حکیم میں سورۃ الطلاق:۶ میں ہے۔ نفقہ مرد کی وسعت اور حیثیت کے مطابق ہوگا۔ جیسا کہ سورۃ الطلاق آیت نمبر ۷ میں ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس بارہ میں ارشاد فرمایا:

''اپنی عورتوں کے بارہ میں اللہ سے ڈرو، کیونکہ تم انہیں اللہ تعالیٰ کی امانت پر لائے ہو اور اللہ کے کلمہ سے ان کی شرم گاہوں کو تم نے حلال کیا ہے۔ ان کا تمہارے ذمہ نان ونفقہ اور ان کا لباس دستور کے مطابق ہے۔''

(مسلم:۳/۳۳۳)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ایک وہ دینار ہے

جس کو تو نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا، اور ایک وہ دینار ہے جو تو نے کسی مسکین پر صدقہ کیا اور ایک وہ دینار ہے جو تو اپنے اہل پر خرچ کرتا ہے۔ ان سب میں اجر کے لحاظ سے وہ دینار ہے جو تو نے اپنے اہل پر خرچ کیا۔ (مسلم:۲/۹۹۵)

بخاری کی ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو کچھ تم اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرتے ہو اس پر تمہیں اجر ملتا ہے یہاں تک کہ اس لقمے پر بھی جو تو اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتا ہے۔ (بخاری:۱/۱۲۳۳)

ایک اور روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا: جب کوئی شخص اپنی اہلیہ پر اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرتا ہے وہ اس کے صدقہ میں شمار ہوتا ہے۔ (بخاری:۳/۵۰۳۶)

اہلیہ کے نفقہ میں کھانا پینا، لباس، مکان (رہائش) اور جو کچھ زندگی کے لئے عرف اور عادت میں ضروری ہے ہر شہر اور ہر زمانہ میں وہاں کے دستور کے مطابق، یہ سب کچھ نفقہ میں شامل ہیں۔

معاشرت میں بیوی کا حق:

اسلام میں خانگی زندگی میں میاں بیوی کے تعلقات آپس میں باہمی مشورے اور شرکت سے ہونے چاہئیں اور عورت کو معاشرت میں ایک باعزت مقام دینا چاہئے جس سے وہ نہایت اعتماد کے ساتھ اپنے بچوں کی پرورش اور تربیت کر سکے۔ یہ معاشرتی زندگی نرمی اور مودت ورحمت پر مبنی ہونی چاہئے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں بھی بیوی کو یہ حق معاشرت دیا گیا ہے اور تاکید کی گئی ہے کہ اس کو کوئی نقصان اور مضرت نہ پہنچائی جائے۔

(سورۃ البقرۃ:۲۳۱)

حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ایمان کے لحاظ سے کامل ترین مومن وہ ہیں جو اخلاق کے لحاظ سے اچھے ہوں اور اپنے اہل وعیال پر نہایت مہربان۔

(رواہ الترمذی، رقم:۲۶۱۲ وقال: حدیث صحیح)

نعمان بن بشیر ؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابوبکر صدیق ؓ نے کاشانہ نبوت میں داخل ہونے کی اجازت مانگی تو سیدہ عائشہ ؓ کی آواز بلند سنی، جب اندر گئے

تو انہیں پکڑ لیا تا کہ چانٹا رسید کریں اور کہا: کیا میں یہ دیکھ نہیں رہا کہ تو رسول اللہ ﷺ پر اپنی آواز بلند کرتی ہے؟ اور رسول اللہ ﷺ انہیں روکنے لگے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ غصے کی حالت میں باہر چلے گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے باہر جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عائشہ! دیکھا میں نے تمہیں اس شخص سے کیسا بچایا (اس شخص کا لفظ بطور مزاح فرمایا) نعمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ کئی روز نہ آئے۔ پھر ایک روز رسول اللہ ﷺ سے آنے کی اجازت طلب کی اندر آکر دیکھا کہ دونوں کی صلح ہو چکی ہے۔ پس ان دونوں سے کہا ''مجھے اپنی صلح میں بھی شریک کیجئے جیسے کہ اپنی لڑائی میں کیا تھا۔ پس نبی ﷺ نے فرمایا: ''ہم نے ایسا کیا۔ ہم نے ایسا کیا۔'' (رواہ ابوداود، رقم ۴۹۸۷)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جس طرح میری بیوی میرے لئے زیب و زینت کرتی ہے مجھے یہ بات زیادہ پسند ہے کہ میں بھی اس کے لئے زیب و زینت کروں۔''
(اخرجہ البیہقی: ۲۹۴/۷)

معلوم ہوا کہ اپنی اہلیہ کے لئے زیب و زینت کرنا بھی اس کا ایک حق ہے۔

بیوی سے اچھی گفتگو کرنا جس سے اس کا دل خوش ہو، اور اس سے محبت کا اظہار کرنا بھی اس کا ایک معاشرتی حق ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی بعض بیویوں کو بوسہ دیتے اور پھر جا کر نماز پڑھتے اور وضو نہیں فرماتے تھے۔ (الجامع الصغیر ۴۸۷۲)

مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ عورت کے حقوق میں سے کسی قسم کی کوئی کمی نہ کرے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''کوئی مسلمان مرد عورت سے بغض نہ رکھے (مطلب یہ کہ اپنی بیوی سے محبت رکھے اور اس کے ساتھ حسن معاشرت کرے) اگر اس کی ایک عادت اچھی نہیں تو دوسری پسند آجائے گی۔'' (مسلم بشرح النووی: ۵۷/۱۰)

سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا بنت عقبہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو تین باتوں کے سوا کسی چیز میں جھوٹ کی اجازت دیتے ہوئے نہیں سنا۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''میں اسے جھوٹا شمار نہیں کرتا یعنی وہ آدمی جو دو آدمیوں میں صلح کرائے (کوئی خلاف واقعہ) بات کہے مگر اس سے اس کا ارادہ فقط اصلاح ہو، اور جو آدمی جنگ

میں دشمن کو کوئی بات کہے، اور آدمی اپنی بیوی سے بات چیت کرے اور عورت اپنے خاوند سے بات چیت کرے۔ (رواہ البخاری، مسلم، الترمذی والنسائی، ابوداؤد، رقم: ۴۹۱۰)

اگر عورت کی طرف سے کوئی ایذا اور تکلیف بھی پہنچے تو اس پر صبر کرنا چاہئے اور اس کے ساتھ حسن سلوک میں کمی نہیں آنی چاہئے۔ آپ ﷺ نے بیوی کے ساتھ حسن سلوک کرنے والے شوہر کو اس امت کا بہترین اور ممتاز لوگوں میں سے قرار دیا ہے۔ فرمایا: ''کامل ایمان والے مومن وہ ہیں جو اپنے اخلاق میں سب سے اچھے ہوں۔''

﴿وخیارکم خیارکم لنسائھم﴾

(ترمذی باب ماجاء فی حق المراۃ عن زوجھا: ۱۱۶۲)

''اور تم میں سب سے اچھے وہ لوگ ہیں جو اپنی بیویوں کے حق میں سب سے اچھے ہیں۔''

کچھ عورتیں آپ ﷺ کے گھر والوں کے پاس آئیں اور اپنے شوہروں کی شکایت کرنے لگیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مردوں میں اعلان کر دیا:

''محمد (ﷺ) کے گھر والوں کو بہت سی عورتوں نے گھیر لیا ہے جو اپنے شوہروں کی شاکی ہیں، ان کے شوہر اچھے لوگ نہیں ہیں۔ (لیس اولئک بخیارکم)

(ابوداؤد، رقم: ۲۱۴۶، باب ضرب النساء)

اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے شوہروں کو تاکید کی کہ وہ نہایت اچھے طریقے سے بیویوں کے ساتھ معاملہ کریں، چنانچہ فرمایا:

''عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے، اور پسلیوں میں سب سے ٹیڑھا حصہ اوپر کا ہے۔ اگر اس کو سیدھا کرو گے تو ٹوٹ جائیگی اور اگر چھوڑے رہو گے تو ٹیڑھی ہی رہے گی۔ پس عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو (فاستوصوا بالنساء)

(بخاری، باب خلق آدم وذریتہ رقم ۳۳۳۱، مسلم: ۳/۱۲۵۹، الفتح الربانی: ۱۶/۲۳۵)

پیغمبر اسلام ﷺ کی یہ خواہش تھی کہ ہر عورت کی اس کا شوہر تکریم کرے، اس سے حسن سلوک کرے اور شیریں الفاظ میں اس سے گفتگو کرے۔ چنانچہ ایک مرتبہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی شادی کے بارہ میں مشورہ کیا، کیوں

کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابو جہم رضی اللہ عنہ نے اس کو نکاح کی دعوت دی ہوئی تھی۔
آپ ﷺ نے ابو جہم رضی اللہ عنہ کے بارہ میں فرمایا:

﴿لا یضع العصا عن عاتقہ و فی روایۃ و اما ابو جھم فرجل ضراب النساء﴾

''ابو جہم رضی اللہ عنہ تو عصا اپنے کندھے سے نیچے رکھتا ہی نہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ابو جہم رضی اللہ عنہ ایک ایسا آدمی ہے جو عورتوں کو بہت مارتا ہے۔ (مسلم: ۲/۱۱۱۴، رقم: ۱۴۸۰)

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿لاتضربوا اماء اللّٰہ﴾

(ابو داؤد: ۲/۲۴۵، مستدرک حاکم: ۲/۲۰۵، برقم: ۲۷۶۵)

''اللہ کی بندیوں کو نہ مارو۔''

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ رسول اللہ ﷺ گھر میں کیسے ہوتے تھے؟ سیدہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ گھر میں سب لوگوں سے زیادہ نرم مزاج، متبسم رو، چہرے پر مسکراہٹ بکھری ہوئی اور اپنی اہل کی تمام ضرورتوں میں ان کا ہاتھ بٹانے والے تھے۔ (رواہ السیوطی فی جامع الصغیر: ۶۶۱/۵)

شریعت اسلامیہ میں بیوی کے اسرار کو لوگوں کے سامنے بیان کرنے سے شریعت نے سختی سے منع فرمایا۔ اگر بیوی اسے کوئی چیز بتاتی ہے تو اس کے راز کو افشا نہیں کرنا کیوں کہ ان امور میں ذرا سے تساہل سے مرد و زن میں شدید اختلافات پیدا ہو سکتے ہیں اور محبت و مودت کا شعلہ سرد پڑ سکتا ہے چنانچہ جو شخص بیوی کے راز فاش کرتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کو ''اشر الناس'' کے نام سے یاد کیا ہے۔
(مسلم، رقم: ۱۴۳۷)

خاوند سے استمتاع کا حق:

اسلام نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ کوئی شخص اپنی اہلیہ سے چھ ماہ سے

زیادہ غائب رہے کیوں کہ عورت کو اپنے خاوند سے استمتاع کا پورا حق ہے، لہذا مرد کو عورت سے چھ ماہ سے زیادہ غائب نہیں رہنا چاہئے۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں یہ حکم تمام مملکت اسلامیہ میں جاری کر دیا کہ کوئی شخص چھ ماہ سے زیادہ محاذ پر نہ رہے۔

(کشاف القناع رقم ۵۱۹۳)

اس پر شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ میں بڑی عمدہ بحث کی ہے۔ اہل علم وہاں ملاحظہ فرمالیں۔ (مجموع الفتاوی: ۳۴/۸۹)

بیویوں کے درمیان عدل:

قرآن حکیم میں ایک سے زائد بیویاں کرنے کی اجازت ہے لیکن اس کو عدل سے مشروط کیا۔

﴿فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ﴾ (النساء:۳)

”یعنی اگر تمہیں یہ خطرہ ہو کہ تم (ان میں) عدل نہیں کر سکو گے تو صرف ایک سے نکاح کرو۔“

اس آیت میں پہلے کہا کہ تم بیک وقت چار تک بیویاں رکھ سکتے ہو۔ چنانچہ جو شخص مالی اور جسمانی طور پر متعدد بیویاں رکھ سکتا ہے وہ بشرط عدل چار بیویوں کو اپنے نکاح میں رکھ سکتا ہے، اور اگر وہ عدل وانصاف کے تقاضے پورے نہ کر سکتا ہو تو وہ ایک بیوی پر اکتفا کرے۔

اسلام میں بیویوں کے درمیان عدل کو شوہر پر واجب قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ عدل امور ظاہری میں ہے جیسے نان ونفقہ، لباس اور رہائش وغیرہ میں، لیکن دل پر چونکہ کسی کو اختیار نہیں لہٰذا دلی محبت کی کمی بیشی پر نہ کوئی مواخذہ ہے اور نہ ہی عدل کے خلاف ہے۔ کیوں کہ اس پر انسان کو کوئی قصد واختیار نہیں۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی ازواج مطہرات کے درمیان تقسیم میں عدل ومساوات سے کام لیتے تھے اور فرماتے تھے:

”اے اللہ! جس میں مجھ کو قابو حاصل ہے اس میں میری یہ تقسیم ہے، اس چیز

میں ملامت نہ فرما جس کا تو مالک ہے لیکن میں مالک نہیں!"

(ترمذی، ۳/ ۴۴۶، رقم: ۱۱۴۰، سنن ابن ماجہ، رقم: ۱۹۷۹، نسائی فی باب عشرۃ النساء، ابن حبان: ۱۰/ ۵، مستدرک حاکم: ۲/ ۱۸۷، سنن کبریٰ بیہقی: ۷/ ۲۹۸، معرفۃ السنن والآثار بیہقی ۵: ۳۲۳، مصنف ابن ابی شیبہ: ۳/ ۳۸۶، مسند احمد بن حنبل: ۶/ ۱۴۴)

رسول اللہ ﷺ اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان ہر شی میں عدل فرماتے تھے حتیٰ کہ سفر میں بھی قرعہ ڈالتے اور ایک یا دو ازدواج کو اپنے ساتھ لے کر جاتے۔ پھر مرض الوفات میں بھی آپ نے ایک بیوی کے ہاں اپنے آخری ایام گزارنے کے لئے دوسری بیویوں سے اجازت لی۔

(کمافی البخاری: ۱۹۳/۸۵، برقم: ۲۵۹۳، سنن ابی داؤد ۲/ ۳۰۰)

نبی اکرم ﷺ نے ان لوگوں کو آخرت کے عذاب سے ڈرایا جو اپنی بیویوں کے درمیان عدل سے کام نہیں لیتے، چنانچہ آپ نے فرمایا:

"جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان دونوں میں عدل نہ کرے تو وہ قیامت میں اس طرح آئے گا کہ اس کا ایک پہلو ساقط ہوگا۔"

(سنن کبریٰ نسائی: ۵/ ۲۰۸، رقم: ۱۸۹، ابن ماجہ، رقم: ۲۳۰۷)

عورت کا حق خلع:

اسلام نے عورت کو یہ حق دیا ہے کہ جب اس کی زندگی اپنے خاوند کے ساتھ کشمکش میں گزر رہی ہو اور خانگی زندگی کے درست ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آ رہی ہو تو وہ اپنے مرد سے خلع لے کر جان چھڑا لے، لیکن بغیر کسی عذر کے یا معمولی بات پر شوہر سے طلاق لینے والی عورت پر اللہ کے رسول نے بتایا ہے کہ اس پر جنت حرام ہے، اور ایک روایت میں ان کو منافق کہا گیا ہے۔ اس کا منشاء یہی ہے کہ عورتیں اپنے خاوندوں سے الگ ہونے کی خواہش نہ کریں اور ان کی خانگی زندگی برباد نہ ہو۔ لیکن اگر عورت واقعی دیانت داری سے یہ محسوس کرتی ہے کہ اگر خلع کی صورت اختیار نہ کی گئی تو حدود اللہ قائم نہیں رہ سکیں گی تو ایسی مجبوری میں عورت خلع کے قانون سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

خلع کی مثال عہد نبوی میں بھی موجود ہے کہ حبیبہ بنت سہل انصاری رضی اللہ عنہا حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ سے بیاہی گئی تھیں۔ ایک صبح رسول اللہ ﷺ نماز فجر کے لیے کاشانہ نبوی سے نکلے تو دیکھا کہ ایک عورت کپڑوں میں لپٹی ہوئی دروازے پر کھڑی ہے۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: ''کیا بات ہے؟'' سیدہ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: نہ تو میں ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوں اور نہ ثابت میرے ساتھ ہیں۔ یعنی ہم دونوں میاں بیوی میں نباہ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ آپ اس کی یہ بات سن کر نماز کے لئے تشریف لے گئے۔ سیدنا ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ جب خدمت نبوی میں حاضر ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ثابت! حبیبہ سے مہر کا عطیہ واپس لے لو۔'' یہ سن کر سیدنا ثابت رضی اللہ عنہ نے بیوی سے اپنا عطیہ واپس لے لیا اور اس طرح ان دونوں میں جدائی ہوگئی۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ عطیہ باغ تھا جو ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے انہیں واپس کر دیا۔ حافظ ابن قیم نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

﴿اقبل الحديقة وطلقها واحدة﴾ (زاد المعاد ۴/۳۴)

''باغ لے لے اور اس کو ایک طلاق دے دے۔''

(بخاری، رقم: ۵۲۷۳)

حقوق الوالدین

ایک مسلمان کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نرمی، بردباری اور حسن سلوک سے پیش آئے۔ اسلام نے والدین کے حسن سلوک پر بہت زور دیا ہے۔ اسلام کے علاوہ اور کسی مذہب میں والدین کے مقام کو اتنا بلند نہیں کیا گیا جتنا اسلام نے کیا ہے۔ اسلام نے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ اور حسن سلوک کو اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی بندگی کے درجہ کے متصل رکھا ہے۔ قرآن و حدیث کی مختلف نصوص میں اللہ کی خوشنودی اور رضا کے بعد والدین کی خوشنودی اور رضا کا درجہ قرار دیا گیا ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو اللہ تعالیٰ پر ایمان کی فضیلت کے بعد سب سے بڑی انسانی فضیلت قرار دی گئی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿واعبدوا اللّٰہ ولا تشرکوا بہ شیئاً وبالوالدین احساناً﴾

(النساء ۳۶)

''اور تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔''

سورہ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے والدین کے مقام کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ فرمایا:

''تمہارے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ سوائے اس کے کسی اور کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان کے ساتھ احترام کے ساتھ بات کرو، اور نرمی اور

رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو" اے رب! تو ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت وشفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔"

(بنی اسرائیل: ۲۳-۲۴)

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں والدین کے مقام کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ اولاد کے دلوں میں ہمدردی، رحم اور حسن سلوک کے جذبات موجزن ہو جاتے ہیں۔ یعنی اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں، تو وہ تمہاری دیکھ بھال میں رہتے ہیں اس لئے کہ بوڑھے اور کمزور ہیں، اس لئے احتیاط کرو کہ کہیں تمہارے منہ سے ناراضی، اکتاہٹ اور ملامت کا کوئی کلمہ نہ نکل جائے، تم انہیں اف تک نہ کہو اور نہ جھڑک کر جواب دو۔ بلکہ ان سے بات کرنے سے پہلے سوچ لو اور ان سے ایسی بات کرو جو انہیں اچھی لگے اور ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔ ان سے نہایت احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو کیوں کہ انہوں نے تمہارے ساتھ ناقابل فراموش احسان کیا ہے، اور تمہاری اس وقت پرورش کی ہے جب تم چھوٹے، کمزور اور ناتواں تھے، اور ان کیلئے دعا کیا کرو کہ اے ہمارے رب! ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت اور شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔

قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ووصينا الانسان بوالديه حسنا﴾ (عنکبوت: ۸)

''اور ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے۔''

قرآن حکیم میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کے بارہ میں اور بھی بہت سی آیات ہیں۔ قرآنی آیات کے علاوہ بہت سی احادیث کے اندر بھی رسول اللہ ﷺ نے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی تاکید کی ہے اور جو لوگ ان کے ساتھ نافرمانی اور بدسلوکی کرتے ہیں ان کو وعید سنائی ہے خواہ اس کے اسباب کچھ بھی ہوں۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ''کون سا عمل اللہ کو زیادہ محبوب ہے؟'' فرمایا: وقت پر نماز ادا کرنا (الصلاة على وقتها)

میں نے پوچھا: "پھر کون سا؟" فرمایا: "والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔" میں نے پوچھا! "پھر کون سا؟ فرمایا: "اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔" (مسلم: ۱/۹۰، رقم: ۲۵۴۹، بخاری: ۱۰/۳۷۳، ۳۳۴)

اس حدیث میں والدین کے ساتھ حسن سلوک دو عظیم اعمال کے درمیان رکھا گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ والدین کو کتنا عظیم اور معزز مقام عطا فرمایا گیا ہے۔

ایک مرتبہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: کہ میں آپ ﷺ سے ہجرت اور جہاد پر بیعت کرنا چاہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے اس کے اجر و ثواب کی امید رکھتا ہوں۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے؟ کیا تم اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب چاہتے ہو؟ اس نے جواب دیا! "جی ہاں"۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"اپنے والدین کے پاس واپس جاؤ اور ان کے ساتھ نیک سلوک کرو۔"

(مسلم، باب بر الوالدین، رقم۔ ۲۵۴۹، بخاری، رقم: ۳۰۰۵)

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے جہاد کی اجازت چاہی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہارے والدین زندہ ہیں (أحي والداك) اس نے عرض کی: ہاں۔ فرمایا: پھر انہی کی خدمت جہاد سمجھ کر کر۔ (رواہ البخاری: ۲/۳۴۲، ۲۸، مسلم، رقم: ۲۵۴۹)

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "یا رسول اللہ! میں آپ کی معیت میں جہاد کرنے کے ارادہ سے آیا ہوں، لیکن جب میں آ رہا تھا تو میرے والدین رو رہے تھے؟" آپ نے اسے فرمایا:

﴿فارجع اليهما، واضحكهما كما ابكيتهما﴾

"ان کے پاس واپس چلا جا اور جس طرح انہیں روتا چھوڑ کر آیا ہے اسی طرح اب جا کر ہنسا۔"

(رواہ ابوداؤد، رقم: ۲۵۲۸، ابن ماجہ، رقم: ۲۷۸۰، الادب المفرد: ۱۳، سنن کبریٰ بیہقی: ۹/۲۵، معرفۃ السنن والآثار: ۶/۵۰۳، ابن حبان: ۲/۱۴۳، شرح السنۃ: ۱۰/۲۷۸، مسند احمد: ۲/۲۰۴، مصنف عبدالرزاق: ۵/۱۷۵، حلیۃ الاولیاء: ۵/۲۳)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ شریعت نے والدین کی خدمت اور ان کے ساتھ سلوک کو جہاد پر مقدم ٹھہرایا ہے۔

ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "یا رسول اللہ! ﷺ میں صاحب اولاد ہوں۔ میرے پاس کچھ مال ہے، میرا والد اسے ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

"تم بھی اپنے باپ کے ہو اور تمہارا مال بھی۔ تمہاری اولاد تمہاری بہترین کمائی ہے اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھاؤ۔" (سنن ابی داؤد: ۳۵۲۸)

مسند امام احمد کی روایت میں ہے:

﴿فکلوہ ھنیئا﴾

"یعنی ان کی کمائی سے مزے لے کر کھاؤ۔" (مسند احمد: ۲/۱۷۹)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو تا کہ تمہاری اولاد بھی تم سے نیک سلوک کرے۔" (مجمع الزوائد: ۸/۱۳۸ وقال رواہ الطبرانی فی الاوسط، ورجالہ رجال الصحیح)

اگرچہ اسلام نے ماں اور باپ دونوں کے ساتھ حسن سلوک پر زور دیا ہے، لیکن ماں کے بارہ میں بہت زیادہ زور دیا۔ چنانچہ جب ایک مرتبہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! ﷺ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ تیری ماں، عرض کیا گیا: پھر کون؟ فرمایا: "تیری ماں" پوچھا گیا پھر کون؟ فرمایا "تیری ماں" پھر پوچھا گیا: پھر کون؟ فرمایا: تیرا باپ۔ (بخاری: ۱۰/۵۹۷، مسلم، رقم: ۲۵۴۸)

والدین سے نیک سلوک کرنا بڑے بڑے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: "یا رسول اللہ! ﷺ مجھ سے ایک بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے، کیا میرے لئے کوئی توبہ کی شکل ہے؟ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: "کیا تیری ماں ہے؟" اس نے کہا: نہیں۔ فرمایا "تمہاری خالہ ہے؟" اس نے کہا: ہاں۔ فرمایا: "جا اس کے ساتھ جا کر حسن سلوک کر۔" (سنن الترمذی ۱۹۰۴، مستدرک حاکم ۴/۱۵۵)

پھر والدہ کے بارہ میں حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا۔

﴿الجنة تحت اقدام الامہات﴾

(اخرجہ احمد ونسائی وابن ماجہ، کشف الخفاء: ۱/۴۰۱)

''جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔''

والدین کی نافرمانی سے ڈرایا گیا۔ کیوں کہ والدین کی نافرمانی بہت بڑے کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا میں تمہیں بڑے کبیرہ گناہوں کے بارہ میں نہ بتاؤں؟ فرمایا وہ یہ ہیں:

﴿الاشراک باللہ و عقوق الوالدین﴾

(رواہ البخاری: ۲/۹۳۹، ۲/۲۵۱۹، مسلم: ۲/۸۱)

''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔''

گویا شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ والدین کی نافرمانی ہے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک صرف ان کی زندگی تک ہی نہیں بلکہ ان کی وفات کے بعد ان کے لئے دعا کرنا اور ان کی طرف سے صدقہ کرنا اور ان کے عزیزوں سے صلہ رحمی کرنا اور ان کے دوستوں سے محبت اور حسن سلوک کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ''انسان جب مرجاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے لیکن تین عمل ایسے ہیں جن کا ثواب اس کے مرنے کے بعد بھی اسے ملتا رہتا ہے: ایک صدقہ جاریہ، دوسرے ایسا علم جس سے نفع حاصل کیا جائے اور تیسرا نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرے۔

(مسلم، رقم ۱۶۳۱، مسند احمد: ۲/۳۷۲، ابوداؤد، رقم: ۲۸۸۰، ترمذی: ۱۳۷۶، نسائی: ۶/۲۵۱)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ایک شخص کے جنت میں درجات بلند ہوں گے، وہ پوچھے گا: ''یہ کیسے ہو گیا؟'' اس سے کہا جائے گا۔

﴿باستغفار ولدک لک﴾ (ابن ماجہ، رقم: ۳۶۶۰)

''تیری اولاد کے تیرے لئے استغفار کی وجہ سے۔''

ایک مرتبہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: "یا رسول اللہ! ﷺ کیا کوئی ایسی نیکی باقی ہے جو میں اپنے والدین کے مرنے کے بعد کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں

﴿الصلاة عليهما (اى الدعالهما) والاستغفار لهما، وانفاد عهدهما من بعدهما، وصلة الرحم لاتوصل الا بهما واكرام صديقهما﴾

(رواہ ابن ماجہ: ۲/ ۱۲۰۸، مسند احمد: ۳/ ۴۹۸، الادب المفرد: ۳۵)

"والدین کے لئے دعا کرنا، ان کے لئے استغفار کرنا، ان کے عہد کو پورا کرنا، ان کے رشتوں کو جوڑنا جو ان کے بغیر نہیں جوڑے جاسکتے اور ان کے دوستوں کی عزت وتکریم کرنا۔"

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ نیک سلوک کرو، اور رشتوں کو نہ توڑو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہیں بے نور کر دے گا۔"

(طبرانی فی الاوسط: ۸/ ۲۳۹، مجمع الزوائد: ۸/ ۱۴۷، کنز العمال: ۴۵۴۶۰)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿رضا الرب في رضا الوالد، وسخط الرب في سخط الوالد﴾

"رب کی رضا والد کی رضا میں ہے، اور رب کی ناراضی والد کی ناراضی میں ہے۔" (رواہ الترمذی، رقم: ۱۸۹۹، مستدرک حاکم: ۴/ ۱۵۱)

اسلام نے نہ صرف حقیقی ماؤں سے نیک سلوک کی تاکید کی بلکہ رضاعی ماؤں سے اچھا سلوک اور نیکی کرنے کی تلقین بھی کی۔ سیدنا ابوالطفیل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ جعرانہ میں گوشت تقسیم کر رہے تھے، میں اس وقت نوجوان تھا۔ ایک عورت آپ کے پاس آئی۔ آپ ﷺ نے جب اس کو دیکھا تو اس کے لئے اپنی چادر بچھا دی۔ چنانچہ وہ اس پر بیٹھ گئی۔ میں نے پوچھا: "یہ کون ہے؟"

لوگوں نے بتایا: ''یہ آپ ﷺ کی رضاعی ماں ہے۔''

(اخرجہ ابوداؤد رقم: ۵۱۴۴، مستدرک حاکم: ۱۶۴/۳، الاصابہ: ۲۷۴/۴)

اسلام نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی ہر حال میں تاکید کی خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''میری والدہ میرے گھر آئیں (وہ حضور ﷺ کے زمانہ میں ایمان نہیں لائی تھیں) میں نے ان کے بارے میں آپ ﷺ سے پوچھا کہ میری ماں آئی ہے اور وہ مجھ سے کسی چیز کی خواہش مند ہے، کیا میں اس کے ساتھ صلہ رحمی کرسکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، تم اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرسکتی ہو۔'' (بخاری، باب الھدیۃ للمشرکین: ۲۶۲۰، تفسیر قرطبی ۵/۲)

حق امومت:

حق امومت کا مطلب ہے ماں ہونے کا حق۔ اگرچہ باپ اور ماں دونوں سے خاندان کی بنیاد پڑتی ہے اور دونوں ایک خاندان کے اہم رکن ہوتے ہیں، اور دونوں ہی اولاد کی۔ پرورش اور تربیت میں شریک ہوتے ہیں، اس لئے دونوں ہی احترام و تکریم اور اطاعت و خدمت کے مستحق ہیں۔

لیکن اسلام نے ماں کے حقوق والد سے تین گناہ زیادہ رکھے کیوں کہ جو تکالیف اولاد کیلئے ماں اٹھاتی ہے وہ باپ نہیں اٹھاتا۔ اسی وجہ سے گزشتہ صفحات میں حدیث گزر چکی ہے کہ آپ نے سوال پوچھنے والے کو جس نے پوچھا کہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ تو حضور ﷺ نے تین دفعہ ماں کا نام لیا اور چوتھی دفعہ باپ کا۔ (بخاری مع الفتح: ۵۹۷۱/۱۰، مسلم: ۲۵۴۸)

اور پھر حضور ﷺ نے فرمایا:

﴿الجنة تحت اقدام الامهات﴾ (اخرجہ احمد والنسائی وابن ماجہ و حاکم)

''جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔''

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿ان الله حرم عليكم عقوق الامهات و واد البنات﴾

(بخاری: ۸۴۸/۲، مسلم: ۴/۱۲)

''بے شک اللہ نے تم پر حرام قرار دی ہے، ماؤں کی نافرمانی اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کو۔''

رسول اللہ ﷺ نے بچے اور ماں کی نفسیات کو نماز میں بھی ملحوظ رکھا۔ چنانچہ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں نماز میں داخل ہوتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ قراءت کو طویل اور لمبا کروں، پس میں بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں، اور اس خیال سے نماز میں تخفیف کر دیتا ہوں کہ ماں کو بچے کے رونے سے تکلیف ہوگی۔'' (رواہ البخاری:۷۰۸، مسلم:۴۷۰)

حقوق والدین کی تفصیل ہم نے الگ ایک کتاب میں دی ہے جس کا نام ''اطاعت والدین'' ہے۔ تفصیل وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

بچے کے حقوق:

بچے ہمارے مستقبل کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اگر وہ اس وقت گود کا کھلونا ہیں تو آگے چل کر وہ مستقبل کے معمار ہوں گے۔ شریعت اسلامی نے بچوں کی پرورش کا بڑا اہتمام کیا ہے اور ان کے بھی کچھ حقوق مقرر کیے ہیں جن کے تحت ان کی پرورش کرنے کی تلقین کی ہے۔ بلکہ شریعت نے تو بچے کے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس کا اہتمام کیا ہے۔ سب سے پہلی چیز یہ کہ ماں اچھی ہونی چاہئے۔

بچے کی ماں اچھی ہونی چاہیے:

سب سے پہلی چیز جو بچے کا حق ہے وہ یہ ہے کہ بچے کی پیدائش کے لئے اچھی ماں کا انتخاب کرنا چاہئے جیسا کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا ہے:

''اپنے نطفوں کے لئے اچھی عورت تلاش کرو، اور کفو میں نکاح کرو اور اپنی بیٹیوں کے نکاح بھی انہی میں کرو۔''

(رواہ ابن ماجہ رقم:۱۹۶۸، کامل ابن عدی ۱/۹۴۳، الخطیب ۱/۲۶۴)

اسلام میں ایک مسئلہ کفاءت بھی ہے جو باہمی محبت و مودت اور خوش گوار زندگی گزارنے کے لئے بعض دفعہ ضروری ہوتا ہے، جیسا کہ ایک نیکوکار عورت کی شادی ایک

بدکار مرد سے کر دی جائے یا نیک مرد کی شادی ایک بدکار عورت سے کر دی جائے تو دونوں کی زندگی ویران ہو کر رہ جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بدکار مرد اور بدکار عورت نیک عورت اور نیک مرد کا کفوء اور برابر نہیں، اور ان دونوں کے نکاح کے نتیجہ میں زندگی کے خوش گوار لمحے تلخ ہو جاتے ہیں۔

آج کل لوگوں نے کفوء کا اعتبار صرف نسب میں کیا ہے کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ خاندانوں کے معاشرتی اختلافات کی وجہ سے عملی زندگی میں مختلف پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں، لیکن شریعت میں کفو نسبی کا کوئی اعتبار نہیں۔ بعض دفعہ بڑے بڑے خاندانوں کے چشم و چراغ اتنی کمینی اور ذلیل حرکتیں کرتے ہیں کہ چھوٹے خاندانوں کے لوگ انہیں دیکھ کر تعجب کرتے ہیں۔ اس لئے عہد نبوی اور عہد صحابہ ؓ میں نسبی کفو کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں "باب الاکفاء فی الدین" میں دو ایسے واقعات نقل کیے ہیں جن میں میاں بیوی کے مابین کوئی نسبی کفوء اور برابری نہیں تھی۔ اس پر حافظ ابن قیمؒ نے بڑی بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ نسب میں کفو معتبر نہیں بلکہ کفو فی النسب میں شدت اختیار کرنا اسلامی تعلیمات کے منافی ہے، کیوں کہ شعوب وقبائل کو دنیا میں باہمی تعارف کا ذریعہ بنایا گیا ہے، اور نکاح کے لئے دین اور اخلاق کو معیار بنایا گیا ہے، بلکہ یہاں تک فرمایا کہ اگر ان دونوں چیزوں کے علاوہ کسی اور چیز یعنی مال و دولت اور حسب ونسب کو معیار بناؤ گے تو روئے زمین میں فتنہ وفساد کے چشمے ابل پڑیں گے۔

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

"بنی فلاں کی اولاد میرے اولیاء نہیں ہیں۔ میرے اولیاء متقی لوگ ہیں جہاں ہوں اور جس طرح کے ہوں۔" (زاد المعاد:۴/۲۲)

اسی وجہ سے شریعت نے دین دار عورت سے شادی کرنے کا حکم دیا، جیسا کہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"عورت سے چار وجوہ کی بنا پر نکاح کیا جاتا ہے، اس کے مال کی وجہ سے، اس کے خاندانی حسب ونسب کی وجہ سے، اس کے حسن و جمال کی وجہ سے اور اس کے دین کی بنا پر، پس تو دین دار عورت سے نکاح کرنے میں کامیابی

حاصل کر۔ تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔"

(رواہ البخاری: ۹/۱۵۵۔۱۲۶۔ مسلم، رقم: ۱۴۶۶۔ ریاض الصالحین، رقم: ۳۶۴)

ایک ماں اپنے خاندان کی روح رواں ہوتی ہے۔ اس کے وجود سے گھر کا تمام نظام قائم رہتا ہے۔ اگر ماں نے اپنے بچوں کی اچھی تربیت کی تو خواہ سب افراد خاندان مل کر رہیں یا الگ الگ رہیں، اس خاندان کی ساکھ اور بھرم اور نظم وضبط قائم ودائم رہتا ہے، اور یہ سب کچھ ایک دین دار عورت ہی صحیح معنوں میں کر سکتی ہے۔ دین دار عورت ہی نیک چلن، اطاعت گزار اور شوہر کی وفادار ہوتی ہے۔ جس سے مرد کی زندگی بھی خوش گوار گزرتی ہے اور آئندہ نسل کی اصلاح وتربیت کے لئے بھی وہ مفید اور موثر ثابت ہوتی ہے، جب کہ اس خوبی سے محروم دوسری تین قسم کی خواتین (مال دار، حسب ونسب والی اور حسین وجمیل) انسان کے لئے بالعموم زحمت اور اولاد کیلئے بگاڑ کا باعث ہوتی ہیں، اس لئے عورت کے انتخاب میں دین کو مقدم رکھنا چاہئے اگر ہم زندگی کی حقیقی خوشی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اس بچے کا حق جو ابھی ماں کے پیٹ میں ہے:

اسلام نے اس بچے کی بھی حفاظت کی ہے جو ابھی اپنی ماں کے پیٹ میں ہے۔ چنانچہ کہا گیا کہ مرد کو اپنا نطفہ حلال رحم میں ڈالنا چاہئے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

﴿لا تقربوا الزنا، انه کان فاحشة وساء سبيلا﴾

(بنی اسرائیل: ۳۲)

"اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک وہ بے حیائی اور برا راستہ ہے۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ زنا بہت برا کام ہے۔ اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ زنا نہ کرو، بلکہ یہ فرمایا کہ زنا کے قریب بھی نہ جاؤ یعنی ایسا کوئی کام نہ کرو جو زنا کا محرک ہو اور زنا کا باعث اور سبب بنے۔ مثلاً اجنبی عورتوں سے تعلق قائم کرنا، ان سے خلوت میں ملاقات کرنا، ان سے ہنسی اور دل لگی کی باتیں کرنا اور ان سے ہاتھ ملانا اور ان سے بوس وکنار کرنا وغیرہ۔ اسی وجہ سے اسلام نے عورتوں کو پردہ میں رہنے کا حکم دیا اور عورتوں اور مردوں کے آزادانہ میل جول کو سختی سے روکا۔ جب یہ سب چیزیں نہ ہوں گی تو آدمی زنا

سے بچا رہے گا کیوں کہ زنا سے نسب مخلوط اور مشتبہ ہو جاتا ہے اور انسان کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ زانیہ سے جو بچہ پیدا ہوا ہے وہ اس کے نطفہ سے ہے، یا کسی اور کے نطفہ سے۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ اپنا پانی غیر کی کھیتی کو پلائے یعنی حاملہ لونڈیوں سے جماع نہ کیا جائے۔ (رواہ ابوداؤد ۲۱۵۸:۱)

ایک عورت جب حاملہ ہو تو وہ حلال غذا کھائے اور حرام غذا سے پرہیز کرے تا کہ جنین کو حلال غذا میسر ہو، کیوں کہ قرآن حکیم میں ہے کہ ''اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو۔'' (بقرہ:۱۷۲)

جنین کی حفاظت کے لئے شریعت نے رمضان میں روزے نہ رکھنے کی اجازت دے دی، اور ہر پیٹ کے بچے کی حفاظت کے لئے ہر اس چیز کو حرام قرار دیا جو بچے کے نقصان یا اس کی موت کا سبب ہو۔ چنانچہ قرآن حکیم میں فرمایا کہ مفلسی اور غریبی کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، ہم ہی ان کو اور تم کو روزی دیتے ہیں۔ (بنی اسرائیل:۳۱)

اولاد کو قتل کرنا اگر اس لئے ہو کہ ان کو کھلانے کے لئے رزق میسر نہیں ہوگا تو یہ اللہ کی صفت رزاقیت سے بدگمانی ہے۔

اسلام چاہتا ہے کہ ماں کے پیٹ میں جو بچہ ہے اس کی ہر ممکن حفاظت کی جائے کیوں کہ اس کو دنیا میں آنے کا پورا پورا حق ہے۔ اسی مقصد کے لئے علماء نے حمل کے پہلے مہینے میں عورت کو مختلف ہدایات دیں جن کی وجہ سے جنین صحت مند، ہوشیار ہو اور کمزور اور لاغر نہ ہو۔ چنانچہ کہا گیا کہ کھانے میں تازہ سبزیاں دھو کر استعمال کی جائیں جیسے سلاد، ککڑی اور کھیرا وغیرہ کا کثرت سے استعمال کیا جائے۔

دودھ اور دہی کا استعمال بھی کثرت سے رکھا جائے۔ جس قدر دودھ ہضم ہو سکتا ہو وہ پیتی رہے کیوں کہ دودھ ایک ایسی غذا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر چیز کے کھانے کے بعد یہ دعا مانگی۔

﴿اللّٰھم اطعمنا خیراً منه﴾

''اے اللہ! اس کھانے سے بہتر عطا فرما۔''

لیکن دودھ ایسی مبارک غذا ہے کہ اس سے بہتر کوئی اور غذا نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس کے پینے کے بعد فرمایا:

﴿اللّٰھم بارک لنا فیه و زدنا فیه﴾

''اے اللہ! ہمارے اس میں برکت فرما اور اس میں زیادتی عطا فرما۔''

بچے کا اپنے باپ کی طرف منسوب ہونے کا حق:

شریعت نے بچے کے نسب کو ضائع ہونے سے محفوظ رکھا ہے کیوں کہ رضاعت، نان ونفقہ اور وراثت اور نکاح کے بے شمار مسائل کا تعلق ثبوت نسب پر ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

﴿ادعوھم لآبائھم ھو اقسط عند اللّٰہ، فان لم تعلموا آباء ھم فاخوانکم فی الدین وموالیکم﴾ (احزاب ۵)

''(منہ بولے بیٹوں کو) ان کے حقیقی باپوں کی طرف منسوب کر کے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک بہت انصاف کی بات ہے، پس اگر تم کو ان کے حقیقی باپوں کا علم نہ ہو تو وہ دین میں تمہارے بھائی اور دوست ہیں۔''

زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ جب کسی شخص کو کوئی لڑکا پسند آتا وہ اس کو اپنا بیٹا بنا لیتا اور اس کو اپنے مال کا وارث قرار دیتا، اور لوگ اس لڑکے کو اس شخص کا بیٹا کہا کرتے تھے۔ اسلام نے ان کے اس دستور کو ختم کر دیا اور یہ ہدایت کر دی کہ ہر شخص کی نسبت اس کے اصل باپ کی طرف کی جائے اور ایسا نہ کرنے پر رسول اللہ ﷺ نے سخت عذاب کی وعید فرمائی۔

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے غیر کی طرف منسوب کیا

حالانکہ اس کو علم تھا کہ وہ اس کا باپ نہیں ہے، تو اس پر جنت حرام ہے۔

(بخاری، رقم: ۶۷۶۶، سنن ابوداؤد، رقم: ۵۱۱۳، مسند احمد: ۱/۱۸۱، ۱۷۴، ۳۲۸، ۴/۱۸۷، ۲۲۸، ۲۳۹، ۵/۲۶۷، سنن الدارمی، رقم: ۲۵۳۳، مسلم، رقم: ۶۳، سنن ابن ماجہ، رقم: ۲۶۱۰، ابن حبان: ۲/۱۵۸، سنن کبریٰ بیہقی: ۷/۴۰۳، شرح السنہ بغوی: ۹/۲۷۴، ابن ابی شیبہ: ۸/۲۵، مصنف عبدالرزاق: ۹/۴۹، مسند ابی عوانہ: ۱/۲۸، مسند ابی یعلی موصلی: ۲/۵۹)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے غیر کی طرف منسوب کیا یا جس غلام نے اپنے آپ کو اپنے مولیٰ کے غیر کی طرف منسوب کیا، اس پر اللہ کی، اللہ کے فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہو، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ نہ اس کا کوئی فرض قبول کرے گا اور نہ کوئی نفل۔

(مسلم، رقم ۱۳۷۰، سنن ترمذی: ۲۱۲۰، سنن ابن ماجہ، رقم: ۲۶۰۹، مسند احمد: ۱/۳۱۳، سنن الدارقطنی ۳/۴۱، مصنف ابن ابی شیبہ: ۸/۵۳۷، کنز العمال، رقم: ۱۲۹۱۴، مجمع الزوائد: ۱/۹۸، ابن حبان ۲:۱۶۱، مسند ابی یعلی: ۳/۴۱۵، معجم کبیر طبرانی: ۲/۱۲)

ولادت کے روز بچے کا کان میں اذان سننے کا حق:

پیدائش کے بعد بچے کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ وہ اپنے کان میں اذان کی آواز سنے تاکہ ایک نومولود کے کانوں سے سب سے پہلی آواز جو ٹکرائے وہ توحید کی آواز ہو کیوں کہ شیطان اذان سے بھاگتا ہے۔ (زاد المعاد: ۲/۴)

چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے کان میں ان کے گھر تشریف لا کر اذان کہی۔ (سیر اعلام النبلاء، ذہبی: ۳/۱۶۶)

اسی طرح سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی پیدائش پر بھی رسول اللہ ﷺ نے ان کے کان میں اذان کہی۔ (اسد الغابہ ۲/۱۸)

بچے کا اچھا نام رکھنے کا حق:

اسلام نے بچے کا ایک حق یہ بھی رکھا ہے کہ اس کا والد اس کا کوئی اچھا سا نام رکھے جس کے معنی بھی اچھے ہوں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔

﴿حق الولد على الوالد ان يحسن اسمه، يعلمه الكتابة ويزوجه اذا بلغ﴾

(رواہ ابونعیم فی الحلیۃ عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ، فیض القدیر:۳/۳۹۴)

''ایک بیٹے کا اپنے والد پر یہ حق ہے کہ وہ اس کا اچھا سا نام رکھے، اور اس کو کتابت سکھائے اور جب وہ بالغ ہو تو اس کی شادی کرے۔''

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿انكم تدعون يوم القيامة باسمائكم و باسماء آبائكم، فاحسنوا اسماء كم﴾

(رواہ ابوداود، رقم:۴۹۴۸، المغنی لابن قدامہ:۳/۴۸۹)

''قیامت کے روز تم اپنے ناموں اور اپنے باپوں کے ناموں کے ساتھ بلائے جاؤ گے، پس تم اچھے نام رکھو۔''

اور ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿تسموا باسماء الانبياء واحب الاسماء الى الله عبدالله و عبدالرحمن﴾

(سنن ابی داود، رقم:۴۹۴۹، نسائی:۳۵۶۵، مسند احمد:۴/۳۴۵)

''انبیاء کے ناموں پر اپنے نام رکھو اور اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں۔''

بچے کا نام یا تو ولادت کے دن ہی رکھ دیا جائے یا پھر ساتویں روز رکھا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿كل غلام رهينة بعقيقة، تذبح عنه يوم سابعه و يسمى فيه و يحلق راسه﴾ (سنن الترمذی:۱۵۲۲)

''ہر بچہ اپنے عقیقہ کے بدلہ میں گروی ہے، ولادت کے ساتویں روز اس کی طرف سے ذبح کیا جائے، اس کا نام رکھا جائے اور اس کے بال مونڈے جائیں۔''

یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اس کی ولادت کے روز نام رکھنا بھی جائز ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿ولدلی اللیلۃ غلام فسمیتہ باسم ابی ابراھیم﴾

"رات میرا بچہ پیدا ہوا میں نے اس کا نام اپنے باپ کے نام پر ابراہیم رکھا۔"

پیدائش کے روز بچے کو گھٹی دینے کا حق:

بچے کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اس کی پیدائش کے روز خود یا کسی بزرگ سے اس کو گھٹی دلائی جائے۔ سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتی ہیں کہ قباء میں میرے ہاں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ میں اس بچے کو لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس کو آپ ﷺ کی گود میں ڈال دیا۔ آپ ﷺ نے ایک کھجور منگوائی، اس کو چبایا اور پھر آپ ﷺ نے بچے کے منہ میں اپنا لعاب ڈال دیا۔ چنانچہ پہلی شئی جو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پیٹ میں گئی وہ آپ ﷺ کا لعاب مبارک تھا۔ پھر آپ نے وہ چبائی ہوئی کھجور تحنیک (گھٹی) کے طور پر اس کے منہ میں ڈالی۔ پھر اس کے لئے برکت کی دعا کی۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہجرت کے بعد مہاجرین کے ہاں پہلے بچے ہیں جو پیدا ہوئے۔ مہاجرین ان کی پیدائش پر بہت شاداں و فرحاں ہوئے کیوں کہ ان سے کہا گیا تھا کہ "یہودیوں نے تم پر جادو کر دیا ہوا ہے اور تمہارے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوگا۔" (بخاری، رقم، ۵۳۶۹)

سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میرے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ میں اس کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے اس کا نام ابراہیم رکھا، اور اس کو کھجور کی گھٹی کھلائی اور اس کے لئے برکت کی دعا کی۔ یہ سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ (بخاری: ۲/۸۲۱)

اسی طرح سیدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اپنا بچہ آپ ﷺ کی خدمت میں لے گئے۔ آپ ﷺ نے کھجور کی رس کو چبا کر اس بچے کے منہ میں رکھا اور اس کو گھٹی دی اور اس کا

نام عبداللہ رکھا۔ (بخاری: ۸۲۲/۲)

بچے کا حق رضاعت:

بچے کی والدہ پر شریعت نے بچے کی رضاعت کا حق مقرر کیا ہے جیسا کہ شریعت نے بچے کے والد پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ جو اس کے بچے کو دودھ پلائے اس پر مال خرچ کرے۔ چنانچہ فرمایا:

''اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔ یہ (حکم) اس کے لئے ہے جو دودھ پلانے کی مدت کو پورا کرنا چاہے اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ دستور کے مطابق ان (ماؤں) کا کھانا اور پہننا ہے۔ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں کیا جائے گا، یہ ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے ضرر دیا جائے اور نہ باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے ضرر دیا جائے اور وارث پر بھی اسی طرح لازم ہے۔ پھر اگر ماں اور باپ باہمی مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اگر تم دائیوں سے اپنے بچوں کو دودھ پلوانا چاہو تو تم پر کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ تم (ان کو) دستور کے مطابق اجرت ادا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ تمہارے کاموں کو دیکھنے والا ہے۔''

(بقرہ: ۲۳۳)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ دودھ پلانے کی مکمل مدت دو سال ہے کیوں کہ اس مدت میں بچہ کو اپنی نشوونما کے لئے دودھ کی حاجت ہوتی ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ کم از کم دودھ پلانے کی کوئی حد نہیں۔ ماں باپ باہمی مشورہ سے جتنے عرصہ تک چاہیں دودھ پلائیں اور اس کے بعد دودھ چھڑا دیں۔

بچے کو دودھ پلانے میں تسلسل کے لئے شریعت نے دودھ پلانے والی ماں کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت بھی دے دی کہ ان روزوں کی قضا بعد میں کرے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اللہ عزوجل نے مسافر سے روزہ اور آدھی نماز اٹھالی ہے اور حاملہ اور دودھ

پلانے والی سے روزے کو۔"

(رواہ ابوداؤد: ۲/ ۲۴۰۸، والترمذی: ۳/ ۲۱۵، نیل اوطار: ۴/ ۱۲۹۴)

عقیقہ میں بچے کا حق:

عقیقہ اس ذبیحہ کو کہتے ہیں جو بچے کے پیدا ہونے کے بعد ساتویں روز کیا جائے۔ چنانچہ اس بارہ میں بہت سی احادیث کتابوں میں مروی ہیں۔ جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں۔

سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ہر بچہ اپنے عقیقہ کے بدلہ میں گروی ہے۔ ولادت کے ساتویں روز اس کی طرف سے ذبح کیا جائے اس کا نام رکھا جائے اور اس کے بال مونڈے جائیں۔ (جامع ترمذی، رقم ۱۵۲۲)

عقیقہ کی وجہ سے بچہ شیطان کے چنگل سے آزاد ہو جاتا ہے۔

(تحفۃ المودود فی احکام المولود: ص ۲۱)

امام عبدالرزاق روایت کرتے ہیں: "نافع بیان کرتے ہیں کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے جو بھی عقیقہ کے بارہ میں سوال کرتا وہ اس کو عقیقہ کرنے کا حکم دیتے۔

(المصنف عبدالرزاق: ۸/ ۳۳۱)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اعلان نبوت کے بعد خود اپنا عقیقہ کیا۔" (المصنف: ۴/ ۳۲۹، مجمع الزوائد: ۴/ ۵۹، سنن کبری بیہقی: ۹/ ۳۰۰)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جاہلیت میں لوگ عقیقہ کے جانور کے خون میں روئی بھگو کر بچے کے سر پر لگاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ خون کے بجائے زعفرانی خوشبو میں روئی بھگو کر بچے کے سر پر لگائی جائے۔ (سنن کبری بیہقی: ۹/ ۳۰۲)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حکم فرمایا کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے بالوں کے برابر چاندی وزن کر کے صدقہ کر دی جائے اور بکرے کی ران دائی کو دی جائے۔ (سنن کبری بیہقی ۹/ ۳۰۴، مصنف ابن ابی شیبہ ۸/ ۵۳)

اور ایک روایت میں ہے کہ سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ، سیدنا

حسین رضی اللہ عنہ، سیدہ زینب رضی اللہ عنہا اور سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے بالوں کے برابر چاندی صدقہ کی۔

(رواہ مالک فی الموطا: ۲/ ۵۰۱)

ام کرز رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عقیقہ کے بارے میں سوال کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''لڑکے کی طرف سے دو بکریاں (یا بکرے) اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کرو۔ اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ نر ہو یا مادہ۔ امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

(سنن الترمذی: ص ۲۲۷۔ سنن الدارمی: ۲/ ۸، مسند احمد: ۲/ ۳۸۱، ۴۲۲، ۴۵۶)

سیدنا سلیمان بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لڑکے کے لیے عقیقہ ہے اس کی طرف سے خون بہاؤ اور اس سے گندگی کو دور کرو۔''

(بخاری: ۲/ ۸۲۲)

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی طرف سے دو دو مینڈھے ذبح کیے۔ (المصنف عبدالرزاق: ۴/ ۳۳۰)

سیدہ عائشہ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری کا عقیقہ کرنے کا حکم فرمایا۔ نیز سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ لڑکے کی طرف سے دو بکریاں سنت ہیں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری سنت ہے۔ (المصنف لابن ابی شیبہ: ۸/ ۵۱)

ابو جعفر بیان کرتے ہیں کہ سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیھا نے ساتویں روز اپنے بیٹے کا عقیقہ کیا، اس کا نام رکھا، اس کا سر مونڈا، اس کا ختنہ کیا اور اس کے بالوں کے برابر چاندی صدقہ کی۔ (المصنف لابن ابی شیبہ: ۸/ ۵۵)

امام بیہقی روایت کرتے ہیں کہ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''عقیقہ ساتویں روز کیا جائے اور چودھویں روز اور اکیسویں روز۔''

(سنن کبریٰ بیہقی: ۹/ ۳۰۳)

جو دن بھی سات سے تقسیم ہو جائے اس میں عقیقہ کرنا سنت ہے یعنی اگرچہ بچہ بدھ کو پیدا ہوا ہے تو جس منگل کو بھی عقیقہ کیا جائے وہ سات روز سے تقسیم ہوگا۔

ختنہ کرنے میں بچے کا حق:

بچے کا ایک حق یہ ہے کہ اس کا ساتویں روز ختنہ کیا جائے۔ ختنہ کرنا ضروری ہے اور سنت ابراہیم ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿من اسلم فلیختتن و ان کان کبیرا﴾

(تحفۃ المودود فی احکام المولود لابن قیم: ص ۹۵)

''جو شخص اسلام لائے اسے ختنہ کروانا چاہیے اگر چہ وہ بڑا ہی کیوں نہ ہو۔''

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''پانچ باتیں فطرت ہیں: ختنہ کروانا، زیر ناف بال لینا، مونچھیں کتروانا، ناخن کاٹنا اور بغلیں منڈوانا۔''

(رواہ البخاری عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ، رقم: ۵۸۹۱)

بچے کا حق نظافت:

بچے کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اسے صاف ستھرا رکھا جائے۔ اسلام تو ویسے بھی دین نظافت ہے۔ اس لئے یہ نظافت کو پسند کرتا ہے اور حدیث میں بھی ہے:

﴿ان اللہ جمیل یحب الجمال﴾

(بخاری، رقم: ۹۲۴، مسلم، رقم: ۸۸۴)

''بے شک اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔''

ایک مرتبہ سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو چہرے پر زخم آ گیا۔ آپ ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اسے صاف کرو، لیکن ان سے یہ اچھی طرح صاف نہ ہوا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ان سے بچے لے لیا۔ آپ ﷺ نے خود اسے (سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ کے زخم کو) اپنے ہاتھ سے صاف کیا اور پھر آپ کو چوما۔

(اسد الغابہ: ۱/ ۱۸۰، احیاء علوم الدین، غزالی ۲/ ۳۱۸)

بچے کا حق محبت و تقبیل:

بچے کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اس سے محبت کی جائے اور اس کو چوما جائے۔ چنانچہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہ کو چوما، اس وقت سیدنا اقرع بن حابس تمیمی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کہنے لگے: ''میرے دس بچے ہیں میں نے کبھی ان کو نہیں چوما۔ آپ ﷺ نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا:

﴿من لا یرحم لا یرحم﴾ (بخاری، رقم: ۵۹۹۷)

''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ آپ لوگ تو بچوں کو چومتے ہیں لیکن ہم انہیں نہیں چومتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر اللہ نے تیرے دل سے رحم کے جذبات کو نکال دیا ہو تو میں کیا کروں۔'' (بخاری، رقم: ۵۹۹۸)

کبھی کبھی آپ ﷺ اپنی نواسی سیدہ امامہ بنت ابی العاص رضی اللہ عنہا جو آپ ﷺ کی بڑی صاحبزادی سیدہ زینب سلام اللہ علیہا کی صاحبزادی تھیں اپنی گردن پر بٹھا لیتے۔ (سنن ابی داؤد، رقم: ۹۲۰)

سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مجھے اپنی ران پر بٹھا لیتے اور سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہ کو دوسری ران پر بٹھاتے۔ پھر دونوں کو اپنے جسم کے ساتھ دباتے اور چومتے اور فرماتے: ''اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما۔'' (بخاری ۵/۳۰)

رسول اللہ ﷺ کبھی کبھی بچوں سے مزاح بھی فرماتے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی ابو عمیر رضی اللہ عنہ نے ایک ممولہ (چڑیا جیسا پرندہ) پال رکھا تھا۔ وہ مر گیا۔ ابو عمیر رضی اللہ عنہ اس سے کھیلتے تھے۔ آپ ﷺ اس بچے کا غم و حزن کم کرنے کے لئے اس مزاح سے فرماتے۔

﴿یا ابا عمیر ما فعل النغیر﴾ (رواہ الترمذی، رقم: ۱۹۸۹)

''اے ابوعمیر! ممولے نے کیا کیا۔''

(یہ روایت بخاری: ۶۱۲۹، ۶۲۰۳، مسلم: ۲۱۵۰، مسند احمد: ۳/۱۱۰، سنن کبریٰ بیہقی: ۵/۲۰۳، ابن ماجہ، رقم: ۳۷۲۰ اور مصنف ابن ابی شیبہ: ۹/۱۲ میں بھی ہے۔)

بچے کا حق پرورش:

بچے کی پرورش، تربیت اور شریعت اسلامیہ کا شعور پیدا کرنے کے لئے اسلام نے اس کا حق حضانت بھی رکھا۔ وہ یہ ہے کہ جب تک والدین زندہ ہیں یا ان میں مفارقت اور جدائی کی کوئی دیوار کھڑی نہیں ہوئی تو بچے کی پرورش کے سب سے زیادہ حق دار وہی ہیں لیکن اگر ان کے درمیان طلاق کی وجہ سے مفارقت ہوگئی ہے تو سات سال کی عمر تک ماں بچے کی پرورش اور حضانت کی حق دار ہے اور سات سال کے بعد میاں بیوی کے درمیان جو فیصلہ ہو اس کے مطابق بچے کی پرورش اور تربیت ہوگی کیوں کہ شریعت نے حضانت اور پرورش کے لئے ایک بہترین نظام قائم کیا ہوا ہے جس کا ذکر کچھ تو قرآن حکیم سورۃ البقرہ: ۲۳۳ میں ہے اور کچھ احادیث نبویہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

چنانچہ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سید الشہداء سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سیدہ امامہ رضی اللہ عنہا کے بارہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا جعفر طیار رضی اللہ عنہ اور سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے درمیان یہ تنازع ہوگیا کہ اس یتیم بچی کی کفالت کرنے کا میں زیادہ حق دار ہوں۔ سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی دلیل یہ تھی کہ یہ میری چچازاد بہن ہے اور اس کی خالہ میری اہلیہ ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور سیدنا زید بن حارثہ کا دعویٰ رضی اللہ عنہ تھا کہ یہ میرے بھائی کی بیٹی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ یہ کیا کہ جعفر کے ہاں چونکہ اس کی خالہ ہے اور ''الخالة بمنزلة الام'' اور خالہ ماں جیسی ہے لہٰذا آپ نے کفالت کے لئے وہ بچی سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ کو دے دی۔

(رواہ ابوداؤد فی سنتہ: ۱/۵۲۹، الفتح الربانی: ۱۵/۷)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ والدین کی عدم موجودگی میں خالہ حضانت اور

پرورش کی سب سے زیادہ مستحق ہے۔

ایک مرتبہ ایک عورت آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ!

﴿ان ابنی ھذا کان بطنی لہ وعاء . ثدیی لہ سقاء و حجری لہ حواء﴾

اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے اور وہ میرے اس بچے کو مجھ سے چھیننا چاہتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿انت احق بہ مالم تنکحی﴾

''جب تک تو دوسرا نکاح نہیں کرتی تو ان کی زیادہ حق دار ہے۔''

(منتقی الاخبار بشرح نیل الاوطار: ۶/ ۳۳۹، زاد المعاد ابن قیم: ۴/ ۲۳۰، الفتح الربانی: ۱۷/ ۹۴، ابوداؤد: ۱/ ۵۲۹، رقم: ۲۲۷۶)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک بچے کا جھگڑا آیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''یہ ماں کے ساتھ ہے جب تک بولنے نہ لگے۔ اس کے بعد اس کی نانی کا اختیار ہے۔''

(مصنف عبدالرزاق: ۷/ ۱۵۶، المحلی ابن حزم: ۱۰/ ۳۲۸)

اور نانی بچے کے باپ سے زیادہ اس کی حضانت کی حق دار ہونے کی دلیل یہ ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں ایک انصاری عورت جمیلہ تھی جس سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا ایک بیٹا عاصم پیدا ہوا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت کو طلاق دے دی۔ بعد ازاں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا ایک روز ادھر سے گزر ہوا، دیکھا کہ ان کا بیٹا عاصم مسجد کے صحن میں کھیل رہا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بازو سے پکڑا اور اپنے آگے سواری پر بٹھا لیا۔ بچے کی نانی آئی اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے جھگڑنے لگی یہاں تک کہ دونوں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ میرا بیٹا ہے۔'' اس عورت نے کہا: ''یہ میرا بیٹا ہے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بچہ اس کی نانی کے پاس رہنے دو۔'' چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ خاموشی سے قبول کر لیا۔

(موطا امام مالک ۲/ ۷۶۷، سنن کبریٰ بیہقی: ۸/ ۵، مصنف عبدالرزاق ۷/ ۱۵۴، زاد المعاد: ۴/ ۲۳۹)

حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے شریعت میں حضانت بچہ کے لئے حق واجب ہے۔ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عاصم بن عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ کیا تو آپ نے یہ فرمایا کہ "ماں زیادہ مہربان، شفیق، زیادہ رحیم اور زیادہ خفف وکرم والی ہوتی ہے، اور وہ دوسرا نکاح کرنے سے قبل بچے کی زیادہ حق دار ہوتی ہے۔" پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی اپنے عہد خلافت میں اسی فیصلہ کی روشنی میں فیصلہ کرتے رہے اور فتویٰ دیتے رہے اور یہ حکم اجماعی ہو گیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی اس کا مخالف نہیں ہے۔ (زاد المعاد ابن قیم: ۴/۲۴۰)

جب بچے کی ماں اور نانی بچہ کی حضانت کی باپ سے زیادہ حق دار ہے تو یقیناً یہ دونوں چچا سے بھی زیادہ حق دار ہیں۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک بچہ کی ماں اور بچے کا چچا مقدمہ لے کر آئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "تیری ماں کی تنگ دستی تیرے چچا کی خوش حالی سے بہتر ہے۔" (مصنف عبدالرزاق: ۷/۱۵۶، المحلی ابن حزم: ۱۰/۳۲۸)

البتہ اگر میاں بیوی غیر مسلم ہوں اور دونوں میں سے کوئی ایک اسلام قبول کر لے تو بچہ کی حضانت کا حق مسلمان کو ہوگا۔ خواہ باپ مسلمان ہو یا ماں۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مقدمہ میں یہی فیصلہ کیا تھا۔ (المصنف عبدالرزاق ۶/۲۷)

بچے کے بالغ ہو جانے کی صورت میں حضانت کرنے والے کا حق ختم ہو جاتا ہے اور بچہ کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ چاہے تو ماں کے ساتھ رہے اور چاہے تو باپ کے ساتھ رہے۔ چنانچہ ایک مقدمہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بچہ کو یہ اختیار دیا۔ بچے نے ماں کا انتخاب کیا تو ماں اسے لے کر چلی گئی۔

(المحلی: ۱۰/۳۲۸، مصنف ابن ابی شیبہ: ۱/۱۵۵، المغنی: ۸/۱۹۱، ۹/۱۳۲)

اسی طرح ایک عراقی شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ وہ حاملہ تھی۔ اس شخص نے اپنی بیوی سے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس نے بچے سے کوئی اچھا سلوک کیا تھا، یہاں تک کہ لوگ حج کو روانہ ہو گئے۔ اس قافلہ میں اس بچے کا باپ بھی تھا کسی شخص نے اس سے کہا کہ تمہارا بچہ بھی اس قافلہ میں ہے۔ اگر تم اسے دیکھو تو کیا پہچان لو گے؟ اس نے کہا بخدا نہیں۔ اس شخص نے کہا یہ تمہارا بیٹا ہے۔ اس نے اس کے اونٹ کی مہار پکڑ کر کھینچ لی اور اسے لے کر روانہ ہو گیا۔ معاملہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچا۔ دونوں بار

گاہ خلافت میں حاضر ہوئے۔ اس بچے کی ماں نے دامن پھیلا کر ایک شعر پڑھا کہ

''اے اللہ کے بندو! راستہ دو، میں ہی تو ہوں جس نے ایک سال
اس کو پیٹ میں رکھا اور دو سال دودھ پلایا۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر فرمایا: ''اسے راستہ دے دو'' چنانچہ اس نے آگے جا کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو سارا واقعہ سنایا۔ اس پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس بچے کو جواب نوجوان تھا۔ اختیار دیا۔ اس نے اپنی ماں کو اختیار کیا اور وہ اسے لے کر چلی گئی۔ (مصنف عبدالرزاق: ۷/۱۵۵)

کس عمر میں بچہ کو انتخاب کا اختیار ملتا ہے؟ اس بارہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بچہ اپنی ماں کے پاس رہے گا۔ جب اپنی بات پوری طرح کہنے کے قابل ہو جائے تو اسے انتخاب کا اختیار دیا جائے گا۔ (مصنف عبدالرزاق: ۷/۱۵۶، المحلی ابن حزم: ۱۰/۳۲۸)

اور یہ عموماً سات سال کی عمر میں ہوتا ہے اسی لئے قدامہؒ نے کہہ دیا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فیصلہ فرمایا کہ بچہ کی عمر جب سات سال ہو جائے اور وہ بے عقل نہ ہو تو اسے والدین میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کا موقع دیا جائے۔ (المغنی: ۷/۶۱۴)

مختصر یہ کہ بچے کی حضانت کے سب سے بڑے حقدار اس کے والدین ہیں، اس کے بعد اس کے ننہالی رشتہ دار جیسا کہ روایت میں ہے۔

بچے کا حق تعلیم و تربیت:

اسلام نے بچے کو تعلیم و تربیت کا بھی پورا پورا حق دیا ہے۔ یہ بھی والدین کا حق ہے کہ وہ بچے کو اعلیٰ تربیت اور تعلیم دیں تا کہ اس کا مستقبل روشن ہو۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿یا ایھا الذین آمنوا قوا انفسکم واھلیکم ناراً وقودھا الناس والحجارۃ﴾ (تحریم:۶)

''اے ایمان والو! بچاؤ اپنے نفسوں کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے جس کا ایندھن ہیں آدمی اور پتھر۔''

اس آیت کی تفسیر میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

﴿علموھم وادبوھم﴾ (تفسیر طبری: ۱۲/ ۵۷)

''یعنی انہیں علم سکھاؤ اور ادب سکھاؤ۔''

اب سیدنا حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

﴿مروھم بطاعة اللّٰه وعلموھم الخیر﴾

(تحقیق شعب الایمان: ۶/ ۳۹۷)

''ان کو اللہ کی اطاعت کا حکم دو اور نیکی کی تعلیم دو۔''

اور رسول اللہ ﷺ نے بھی بچوں کو نماز کی تعلیم دینے کا حکم فرمایا ہے۔

﴿مروا ابناء کم بالصلوٰة لسبع، واضربوھم علیھا لعشر، وفرقوا بینھم فی المضاجع﴾

''اپنے بچوں کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دو اور جب دس سال کے ہو جائیں تو انہیں مار کر بھی نماز پڑھاؤ اور انہیں بستروں سے الگ کر دو۔'' (سنن ابی داؤد ۴۹۵، صحیح بشواھدہ)

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿حق الولد علی الوالد ان یحسن اسمه، ویعلمه الکتابة ویزوجه اذا بلغ﴾

''والد پر بیٹے کا حق یہ ہے کہ اس کا اچھا سا نام رکھے اس کو کتابت سکھائے اور جب وہ بالغ ہو جائے تو اس کی شادی کر دے۔''

(رواہ ابو نعیم فی الحلیة عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ والدیلمی فی مسند الفردوس، فیض القدیر: ۳/ ۳۹۴)

شریعت نے بچوں کو ایسی تعلیم دینے کے بارہ میں کہا ہے جو ان کے لئے دین و دنیا دونوں میں فائدہ مند ہو، اسی لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿افتحوا علی صبیانکم اول کلمة ب لا الٰه الا اللّٰه﴾

''اپنے بچوں کو سب سے پہلے کلمہ یہ کہو، لا الٰہ الا اللہ''

(رواہ الحاکم تحفة المودود: ص ۳۷، کنز العمال، رقم: ۴۵۳۲۲)

رسول اللہ ﷺ نے اس کی تائید فرمائی اور سیدہ فاطمہ ؓ کے ہاں جب سیدنا حسن بن علیؓ پیدا ہوئے تو آپ نے ان کے کان میں پہلا یہی کلمہ کہا۔ (رواہ الترمذی: ۱۵۱۶)

بچے کے کان میں اذان دینے میں شاید یہ حکمت ہے کہ انسان کے کانوں میں سب سے پہلے اذان کے کلمات ٹکرائیں جن میں اللہ رب العزت کی کبریائی اور عظمت پائی جاتی ہے اور اس کو اس دنیا میں آنے کے وقت سب سے پہلے اسلام کے شعار کی تلقین دی ہے جیسے کہ اس کے دنیا سے جاتے وقت کلمہ طیبہ کی تلقین کی جاتی ہے۔ پھر بچے کے کان میں اذان اس لئے بھی دی جاتی ہے کہ شیطان اس سے بھاگے کیوں کہ اذان سے شیطان بھاگتا ہے۔ (ازاد المعاد ابن القیم: ۴/۳)

اسلام میں تربیت کی اصل بنیاد قرآن وسنت ہے اور یہ دونوں تادیب نفس، روح کے تصفیہ، عقل کی صقالت اور تقویت جسم کی کفیل ہیں۔ قرآن وسنت ہی سے دینی، خلقی، علمی اور جسمانی تربیت ہوتی ہے بچہ چونکہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ (رواہ مسلم: ۱۲/۲۰۷، الفتح الکبیر: ۲/۳۲۰، سنن کبریٰ بیہقی: ۶/۲۰۲، مسند احمد: ۲/۲۳۳)

اور دین فطرت اسلام ہے۔ بعد میں اس کے والدین اس کو یہودی، عیسائی اور مجوسی بنا لیتے ہیں لہٰذا بچے کو اسلام کی تربیت کے لئے ضروری ہے کہ والدین گھر کے ماحول کو دینی بنائیں۔ دونوں بچے کے سامنے قرآن پڑھیں، نماز قائم کریں، روزے رکھیں اور دوسرے تمام دینی شعائر پر سختی سے عمل کریں۔ اس طرح کے ماحول میں بچے کی صحیح معنوں میں دینی اور اسلامی تربیت اور تعلیم ہوگی اور بچپن اور لڑکپن میں ذہن اور قلب میں جو دین گھسے گا وہ پھر کبھی انشاء اللہ نہیں نکلے گا خواہ جس قسم کے ماحول میں چاہے چلا جائے، جب بچے کے عقیدہ اور عمل میں رسوخ پیدا ہو جائے گا تو پھر رسوخ فی الاسلام کی برکت سے وہ نیکی ہی کو قبول کرے گا اور گناہ سے اس کو اس طرح نفرت ہو جائے گی جس طرح ایک نفیس الطبع شخص کو غلاظت سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اور اب وہ ''الدنیا مزرعة الآخرة'' کے عقیدہ کے تحت یوم آخرت کے لئے اپنا زادِ راہ تیار کرے گا اور دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس کا ذہن وقلب آخرت اور یوم آخرت کی طرف لگا رہے گا۔

بچوں کے معاملہ میں اسلام نے نرمی اور رحم کرنے کی ہدایت کی ہے بلکہ ہر

معاملہ میں رفق اور نرمی سے کام لینا چاہئے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿الرفق ما دخل في شيء إلا زانه، ولا خرج من شيء إلا شانه﴾ (ابوداؤد: ۲/ ۲۴۷۸، کتاب الجہاد)

''نرمی جب کسی شے میں داخل ہوتی ہے تو اس کو زینت دیتی ہے اور جب نکلتی ہے تو اسے عیب دار کر دیتی ہے۔''

اور رسول اللہ ﷺ نے اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ سے جب اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو چومتا نہیں ہے، یہ فرمایا تھا:

﴿من لا يرحم لا يرحم﴾

''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔'' (صحیح البخاری، برقم: ۵۹۹۷)

نبی رحمت ﷺ نے بچوں کی تربیت وتادیب کے لئے اور ان کے نفوس میں اخلاق کریمانہ کے تخم کی آبیاری کے لئے فرمایا:

﴿ليس منا من لم يرحم صغيرنا، ولم يوقر كبيرنا﴾ (مجمع الزوائد، ۸/ ۱۴)

''جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور بڑوں کی عزت وتوقیر نہیں کرتا، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''

ایک اور روایت میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿الزموا أولادكم وأحسنوا أدبهم﴾ (الفتح الربانی: ۱۹/ ۴۵، اخرجہ ابن ماجہ)

''اپنی اولاد کو اپنے پاس رکھو اور اس کو اچھا ادب سکھاؤ۔''

ماں باپ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی اولاد کو کھانے پینے اور دوسرے آداب معاشرت کی تعلیم بھی دیں کیونکہ اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے آداب معاشرت کا سیکھنا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ سیدنا عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بچہ تھا اور کھانے میں میرا ہاتھ پلیٹ میں ہر طرف چلتا تھا۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ

نے ارشاد فرمایا:

﴿یا غلام! سم اللہ، و کل بیمینک، و کل مما یلیک﴾
(بخاری: ۹/ ۴۵۸، مسند احمد: ۴/ ۲۶، مسلم، رقم: ۵۱۵۴، کتاب الاشربہ)

"اے بیٹا! (کھانا کھاتے وقت) اللہ کا نام لیا کرو اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھایا کرو۔ پس اس کے بعد میرے کھانے کا طریقہ یہی رہا۔"

اسلام یہ چاہتا ہے کہ بچوں کو ایسی تعلیم دی جائے جو ان کے ذہنوں میں کشادگی اور وسعت پیدا کرے اور ان کے جسموں کو تقویت دے۔ چنانچہ سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

﴿علموا اولادکم السباحة والرمی و مروھم فلیثبوا علی الخیل وثبا﴾ (کنز العمال: ۴/ ۱۱۳۸۶)

"اپنی اولاد کو تیراکی اور تیراندازی سکھاؤ اور انہیں حکم دو کہ وہ گھوڑے پر کود کر سوار ہوں۔"

اسلام نے بچوں کی تعلیم پر اس قدر زور دیا ہے کہ جنگ بدر میں جو لوگ فدیہ نہ دے سکے تو آپ ﷺ نے انہیں فرمایا کہ اپنے مالوں کے عوض میں مدینہ کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں کیوں کہ اہل مکہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے جب کہ اہل مدینہ اس سے ناآشنا تھے۔ چنانچہ انہوں نے مدینے کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا۔ یہی ان کا فدیہ تھا۔

(طبقات کبریٰ ابن سعد: ۲/ ۲۲)

رسول اللہ چھوٹوں اور بڑوں دونوں کے قلوب میں علم و ایمان کا نخل شگفتہ اگانے کے حریص تھے تا کہ ہر شخص کے ذہن و قلب سے نور ایمان کی شعائیں اپنے ماحول کو روشن کریں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ایک روز سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔

"اے بچے! میں چند کلمات تمہیں سکھانا چاہتا ہوں تو انہیں محفوظ کر لے اللہ تعالیٰ تیری حفاظت کرے گا، جب تو سوال کرے تو صرف اللہ سے سوال کر، جب تو مدد چاہے تو صرف اللہ سے مدد مانگ، یہ جان لے کہ اگر سارے لوگ اکٹھے ہو کر تجھے کوئی فائدہ پہنچانا

چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر وہ جو اللہ نے تیرے لئے لکھ دیا ہے، اور اگر سارے لوگ مل کر تجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر وہ جو اللہ نے تیرے لئے لکھ دیا ہے۔ قلم اٹھا لئے گئے ہیں اور صحائف خشک ہو گئے ہیں۔'' (رواہ احمد والترمذی، رقم:۲۵۱۶ وقال: حدیث حسن صحیح)

نفقہ میں بچے کا حق:

اسلام نے نفقہ میں بھی بچے کا حق تسلیم کیا ہے جیسا کہ سورۃ البقرہ: ۲۳۳ اور سورۃ الطلاق: ۶۔۷ میں ہے۔ چنانچہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہند بنت عتبہ سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! ﷺ ابوسفیان ایک بخیل شخص ہے اور وہ مجھے گھر کے اخراجات کے لئے جو کچھ دیتا ہے وہ کفایت نہیں کرتا، نہ مجھے اور نہ میری اولاد کو مگر یہ کہ میں کچھ پوشیدہ طور پر اس کی جیب نہ لے لوں، کیا اس طرح لینے میں کوئی حرج ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو دستور کے مطابق تیرے اور تیرے بچوں کے لیے کافی ہو وہ لے لیا کرو۔'' (رواہ مسلم فی کتاب الاقضیہ، رقم:۱۷۱۴)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کی: ''یا رسول اللہ! ﷺ میرے پاس ایک دینار ہے۔'' فرمایا: ''اس کو اپنے آپ پر خرچ کر۔'' اس نے کہا: ''ایک اور بھی ہے۔'' فرمایا: ''اس کو اپنی اولاد پر خرچ کر۔''

(رواہ ابن جریر واخرجہ مسلم نحوہ فی کتاب الزکوۃ، رقم:۹۹۷)

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی شخص تم میں سے فقیر اور مفلس ہو تو وہ اپنے آپ پر خرچ کرے، اگر اس سے بچ جائے تو اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے اور اگر اس سے بھی بچ جائے تو اہل قرابت پر خرچ کرے۔

(اخرجہ احمد ومسلم وابوداؤد والنسائی من روایۃ جابر)

سیدنا ثوبان بن بجدد رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''سب سے افضل دینار جو آدمی خرچ کرتا ہے، وہ ہے جو اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے، اور پھر وہ دینار ہے جو اللہ کے راستہ میں اپنی سواری پر خرچ

کرے، اور پھر وہ دینار ہے جسے اللہ کے راستہ میں اپنے ساتھیوں پر خرچ کرے۔" (مسلم، رقم:۹۹۴، ریاض الصالحین، رقم:۲۹۰)

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ایک وہ دینار ہے جسے تو اللہ کے راستہ (جہاد) میں خرچ کرے، ایک وہ دینار ہے جو کسی گردن کے آزاد کرانے میں خرچ کرے اور ایک وہ دینار ہے جو تو کسی مسکین پر صدقہ کرے، اور ایک وہ دینار ہے جو تو اپنے بال بچوں پر خرچ کرے، ان میں سب سے زیادہ اجر اس دینار میں ہے جو تو اپنے بال بچوں پر خرچ کرے۔" (مسلم، رقم:۹۹۵)

ایک مرتبہ سیدہ ام سلمہ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: اگر میں ابوسلمہ (اپنے پہلے خاوند) کی اولاد پر خرچ کروں تو اس میں میرے لئے کوئی اجر ہے؟ میں ان کو اس طرح تو نہیں چھوڑ سکتی کہ وہ تلاش رزق میں ادھر ادھر پھرتے رہیں۔ آخر وہ میری اولاد ہیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا: "ہاں تو ان پر جو کچھ خرچ کرے گی، اس میں تیرے لئے اجر ہے۔" (بخاری: ۳/۲۶۱، مسلم، رقم:۱۰۰۱)

ایک اور روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا:

﴿کفی بالمرء اثماً ان یضیع من یقوت﴾

(حدیث صحیح رواہ ابوداؤد وغیرہ)

آدمی کے گنہگار ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ جن کی روزی کا ذمہ دار ہے ان کے حقوق کو ضائع کر دے یعنی ان کے نان ونفقہ میں کوتاہی کرے۔"

(ابوداؤد، رقم:۱۶۹۲، اخرجہ احمد، ۲/۱۶۰، وصححہ الحاکم: ۱/۴۱۵ ووافقہ الذہبی)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اوپر والا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے۔

و ابدا لمن تعول۔ (بخاری: ۳/۲۴۴، باب لاصدقۃ الا عن ظہر غنی)

اسلام نے بچوں کے نان ونفقہ کا اس قدر اہتمام کیا ہے کہ والدین کی حضانت کے باوجود اگر ریاست کے خزانہ میں وسعت ہو تو وہاں سے بھی ان کو راتب اور نفقہ دیا

جائے۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں ہر نومولود کیلئے اور لشکریوں، سرکاری ملازمین اور دوسرے تمام لوگوں کے بچوں کے لئے بیت المال سے وظیفہ لگا دیا تھا تاکہ بچوں کی پرورش میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ ہو۔

اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں ہماری کتاب ''سیرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ''

بچے کا اپنے درمیان اور اپنے بھائیوں کے درمیان حق عدل:

والدین کو اپنے بچوں سے دلی محبت میں کبھی کچھ فرق ہوتا ہے۔ کسی بچے سے کم محبت ہوتی ہے اور کسی سے زیادہ، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اولاد کے درمیان مالی اور عطایا کی تقسیم میں عدل کی تاکید فرما دی تاکہ کسی بچے کا حق نہ مارا جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اعدلوا بین اولادکم فی العطایا کما تحبون أن یعدلوا بینکم فی البر﴾

''اپنی اولاد کے درمیان عطیات میں عدل کرو جس طرح تم یہ چاہتے کہ وہ نیک سلوک میں تمہارے ساتھ عدل کریں۔''

(رواہ الطبرانی عن النعمان بن بشیر، فیض القدیر: ۱/۵۵۷)

چنانچہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو ان کے والد نے ایک غلام عطا کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا یہ غلام کیسا ہے؟ نعمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ میرا غلام ہے جو میرے باپ نے مجھے عطا کیا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تیرے باپ نے تیری طرح تیرے سب بھائیوں کو غلام عطا کیا ہے؟'' کہا: ''نہیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسے واپس کر دو۔'' (رواہ مسلم والنسائی وابوداؤد، رقم: ۳۵۳۵)

چنانچہ سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿اعدلوا بین ابناءکم، اعدلوا بین ابنائکم﴾

(ابوداؤد، رقم: ۳۵۴۰)

''اپنی اولاد میں عدل کرو، اپنے بیٹوں میں عدل کرو۔''

یتیم کے حقوق

یتیم وہ ہوتا ہے کہ بالغ ہونے سے قبل اس کی ماں یا اس کا باپ انتقال کر جائے۔ وہ چونکہ باپ کے سایۂ شفقت سے محروم ہو جاتا ہے، لہٰذا ہر مسلمان پر یہ ضروری قرار دیا گیا کہ وہ اس کو اپنی آغوشِ شفقت ومحبت میں لے۔ اسے پیار کرے، اس سے محبت کرے، اس کے باپ کے چھوڑے ہوئے مال کی حفاظت کرے اور اس کی تعلیم و تربیت اسی طرح کرے جس طرح وہ اپنے بچوں کی کرتا ہے۔ اور جب وہ عقل وشعور کی منزل پر پہنچ جائے تو اس کے باپ کی چھوڑی ہوئی جائیداد اس کو واپس کر دے۔ یتیم بچیوں کی حفاظت بھی ہر مسلمان کا فرض ہے اور ان کے بالغ ہونے کے بعد ان کی شادی بیاہ کی فکر مسلمان معاشرہ کی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری ہے۔ اسلام نے یتیم سے محبت وشفقت کرنے کا حکم دیا ہے جب کہ ان کو جھڑکنے سے سختی سے منع کیا۔ ''فاما **الیتیم فلا تقھر**'' پس تو یتیم کو نہ جھڑک۔

قرآن حکیم میں یتیم سے محبت کرنے کا حکم ہے اور اس کی اہانت کرنے سے سختی سے روکا گیا۔ چنانچہ فرمایا:

''کیا تو نے اس کو دیکھا جو انصاف کو جھٹلاتا ہے، سو وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔'' (الماعون:۱۔۲)

اسلام نے یتیم کی تکریم کرنے کا حکم دیا اور جو یتیم کی عزت وتکریم نہیں کرتے ان کے بارہ میں فرمایا:

﴿کلا بل لا تکرمون الیتیم، ولا تحاضون علی طعام

المسکین، وتاکلون التراث اکلاً لمّا وتحبون المال حباً جماً﴾ (فجر: ۱۷-۲۰)

''ہرگز ایسا نہیں، بلکہ تم یتیم کی قدر اور تکریم نہیں کرتے اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو، اور تم میراث کا سارا مال سمیٹ کر چٹ کر جاتے ہو اور تم لوگ مال سے بہت محبت کرتے ہو۔''

ان آیات میں کفار کی یتیموں کی حق تلفی پر مذمت کی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یتیموں کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام ضروری ہے، اور صرف حق کی ادائیگی کافی نہیں ان کا اکرام واحترام بھی واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو مال عطا فرمایا ہے عقل اور انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے شکریہ میں یتیموں اور محتاجوں کی پرورش کی جائے اور ان کو ذلت و حقارت کی نظر سے نہ دیکھا جائے۔ اپنے بچوں کے مقابلہ میں یتیموں کو ذلیل و حقیر نہ سمجھیں۔ یہ بھی ان کے اکرام میں داخل ہے۔ لیکن کفار مکہ یتیم کا اکرام تو کیا کرتے ان کا حق واجب بھی نہ دیتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں آ کر یتیموں کے بارہ میں تمام اخلاقی برائیوں کو جو مکی سورتوں میں دی گئی تھیں، قانون کی صورت دے دی۔ ان کو وراثت کا حق دلایا گیا، جاہلیت میں جوان کے باپوں کا چھوڑا ہوا مال کھایا گیا تھا، واپس دلایا اور کہا گیا کہ اگر تم نے یتامیٰ کے مالوں کو اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر کھالیا تو یہ ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ (نساء:)

یتیم کی کفالت کرنے والے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے جنت میں بلند درجات کی بشارت دی۔ چنانچہ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿انا وکافل الیتیم فی الجنۃ کھاتین﴾ (بخاری: ۹/۲۲۱، رقم: ۵۳۱۰)

''میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے۔ آپ نے اپنی درمیانی اور شہادت کی انگلی کو ملا کر بتایا۔''

پھر یتیم کو اپنے ساتھ ملانے کی ترغیب دی، فرمایا:

''جو مسلمان یتیم کو اپنے کھانے اور پینے میں ساتھ ملاتا ہے یہاں تک کہ وہ

بے پروا اور مستغنی ہو جائے تو اس کے لئے جنت واجب ہو گئی ہے۔"

(مسند احمد: ۵/۲۹)

یتیم سے شفقت و محبت سے پیش آنے کی نہ صرف تاکید کی بلکہ اس پر نیکیوں کی زیادتی اور جنت میں اپنی معیت کا وعدہ بھی فرمایا۔ چنانچہ فرمایا:

"جو شخص (محبت و شفقت سے) یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے تو اس کو ہر اس بال کے بدلہ میں ایک نیکی ملتی ہے جو اس کے ہاتھ کے نیچے آتا ہے، اور جو کسی یتیم لڑکی یا یتیم لڑکے کے ساتھ نیک سلوک کرے تو میں اور وہ جنت میں اس طرح ہوں گے۔ آپ نے اپنی شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کو ملایا۔"

پھر باطل طریقے سے یتیموں کا مال کھانے سے نہایت سختی سے منع کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ان الذین یاکلون اموال الیتامی ظلماً انما یاکلون فی بطونھم ناراً، وسیصلون سعیراً﴾ (النساء: ۱۰)

"بے شک جو لوگ ناجائز طریقے سے یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں صرف آگ بھر رہے ہیں، اور وہ عنقریب بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔"

اس آیت میں یتیم کا مال ظلماً کھانے پر سخت وعید فرمائی ہے، اور اس سے قبل بھی اللہ تعالیٰ نے ظلماً یتیم کا مال کھانے پر یکے بعد دیگرے آیات نازل فرمائیں۔

(النساء: ۲،۶)

اس آیت میں زیادہ سخت وعید سنائی کہ وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں۔ ان تمام وعیدوں کا نازل کرنا یتیموں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رحمت ہے کیوں کہ یتیم کمزور اور بے سہارا ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی زیادہ توجہ اور التفات کے مستحق ہیں۔ یتیم چونکہ انتہائی درجہ کے بے بس اور بے سہارا تھے، اس لئے ان پر ظلم کرنے والے کے لیے اللہ کی وعید بھی بہت سخت ہے۔

سیدنا ابو سعید خدری ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شب معراج

کے واقعات بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''میں نے دیکھا کہ کچھ لوگوں کے ہونٹ اونٹ کے ہونٹوں کی طرح ہیں، اور ان کو ایسے لوگوں کے سپرد کر دیا گیا ہے جو ان کے ہونٹوں کو پکڑ رہے ہیں۔ پھر ان کے مونہوں میں ایسے آگ کے پتھر ڈال رہے ہیں جو ان کے دھڑ کے نچلے حصہ سے نکل رہے ہیں۔ میں نے جبریل سے پوچھا: ''یہ کون ہیں؟'' اس نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو ظلماً یتیموں کا مال کھاتے تھے اور وہ درحقیقت اپنے پیٹوں میں آگ کھا رہے تھے۔'' (جامع البیان: ۱۸۳/۴)

امام ابن ابی شیبہ، ابو یعلیٰ موصلی، طبرانی اور ابن حبان نے سیدنا ابو برزہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے روز ایسے لوگ اپنی قبروں سے اٹھائے جائیں گے جن کے مونہوں سے آگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں گے۔ آپ سے عرض کیا گیا: ''یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہوں گے؟'' آپ نے فرمایا: ''کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔'' جو لوگ ظلماً یتیم کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں صرف آگ بھر رہے ہیں۔'' (الدر المنثور: ۱۴۴/۴، ایران)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا۔ اس نے کہا کہ میں فقیر ہوں، میرے پاس کچھ نہیں اور میرے ہاں ایک یتیم ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو یتیم کے مال سے بغیر اسراف کے اور نہ اس خوف سے کہ یہ بڑا ہو کر اپنا مال لے لے گا اور نہ اس کے مال کو خود جمع کرے یعنی اپنی اجرت سے زیادہ نہ لے۔

(رواہ ابوداؤد رقم ۲۸۷۰)

ایک روایت میں فرمایا کہ جو کسی یتیم کا ولی ہو اس کو چاہئے کہ اس کے مال کو تجارت میں لگائے ایسا نہ ہو کہ زکاۃ اور صدقہ ہی اس کے مال کو کھا جائے۔

(تفسیر قرطبی: ۱۴۴/۷)

وصی کے لئے یتیم کے مال سے سوائے زکاۃ کے اور کوئی صدقہ کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''میں دو کمزوروں کے حق میں وارث ہوں گا، یتیم اور عورت۔ (رواہ ابن ماجہ)

حقوق الادعیاء:

ادعیاء: جمع ہے دعی کی اور یہ اس بچے کو کہتے ہیں جس کو کوئی شخص اپنا متبنیٰ بناتا ہے۔ وہ اس کو بچپن میں لے لیتا ہے، اس کو اپنے نام کے ساتھ منسوب کرتا ہے، اس کی والدین کے بدل میں تربیت کرتا ہے۔ اس کو متبنیٰ کہتے ہیں یعنی بیٹا تو نہیں لیکن اسے بیٹا بنالیا گیا ہے۔ اسلام میں ایسا متبنیٰ بنانا جائز نہیں کیوں کہ اس سے بہت سے گناہ جنم لیتے ہیں۔ یہ کہا گیا کہ اس بچے کو اس کے والد کی طرف منسوب کرو۔ اگر اس کے والد کا علم نہ ہو تو وہ تمہارا دینی بھائی ہے۔ اس کے ساتھ حسن سلوک کرو اور ایک یتیم کی طرح اس کی پرورش اور تربیت کرو۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے۔

''نہ تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا (حقیقی) بیٹا بنایا ہے۔ یہ تمہارا صرف زبانی کہنا ہے۔ اللہ حق بات کہتا ہے اور سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔'' (الاحزاب: ۴)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ہم ان کو صرف زید بن محمد کہا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ ''اپنے منہ بولے بیٹوں کو ان کے حقیقی باپوں کی طرف منسوب کر کے بلاؤ۔ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف والی بات ہے۔''

(بخاری، رقم ۴۷۸۲، مسلم: ۲۴۲۵، ترمذی، رقم ۳۲۰۹)

اس بارہ میں گزشتہ صفحات میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔

اسلام نے حسب ونسب کی حفاظت کی ہے تاکہ یہ آپس میں خلط نہ ہو جائیں اور ہر ایک کو اس کے باپ کی طرف منسوب کرنے کی تاکید کی، کیوں کہ اسلام کے بے شمار مسائل حسب ونسب پر ہیں۔ جیسے نکاح اور میراث وغیرہ۔

نوکروں کے حقوق:

اسلام نے خدام اور نوکروں کے حقوق بھی بیان کیے ہیں۔

۱۔ ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کام نہ لو، اگر کوئی ایسا کام ہو جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو تو اس میں اس کی مدد کرو۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

غلام تمہارے بھائی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارے ماتحت کیا ہے، جس کا کوئی بھائی اس کے ماتحت ہو تو جو وہ خود کھاتا ہے اس کو وہ کھلائے، جو خود پہنتا ہے اس کو وہ پہنائے، ان کو کوئی ایسی تکلیف نہ دے جو انہیں مجبور کر دے، اور اگر کوئی مشقت والا کام دو تو اس میں ان کی مدد کرو۔ (بخاری: ۱/۳۰، مسلم، رقم: ۱۶۶۱، ابو داؤد، رقم: ۵۱۵۷، ترمذی: ۱۹۵۲)

رسول اللہ ﷺ جب اس دنیا سے انتقال فرما رہے تھے تو آپ ﷺ کی آخری بات یہ تھی: ''نماز کا خیال رکھو، نماز کا خیال رکھو، اپنے غلاموں کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔'' نماز کا حکم تو واضح ہے کہ دین کا ستون ہے جس پر اس کی عمارت قائم ہے۔ ''وماملکت ایمانکم'' میں غلاموں کے علاوہ چوپائے بھی داخل ہیں۔ ابن ماجہ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ غلاموں اور یتیموں کا اکرام کرو جیسا کہ اپنی اولاد کا کرتے ہو۔ ان کے ساتھ طعام ولباس میں برابری کرو۔ بخاری اور مسلم کی حدیث میں ہے کہ غلاموں کو ساتھ بٹھا کر کھلاؤ۔ کھانا اگر کم ہو تو ایک دو لقمے ان کے ہاتھ پر رکھ دو۔ ان پر طاقت سے بڑھ کر بوجھ نہ ڈالو۔

2- جب کھانا آئے تو اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلائے۔ اس میں اس کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ (بخاری مع الفتح: ۹/۵۴۶۰)

3- اگر اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کو معاف کر دے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کی: ''یا رسول اللہ! میں اپنے خادم کو ایک دن میں کتنی دفعہ (اس کی غلطیوں کو) معاف کروں۔ آپ ﷺ خاموش رہے۔ اس نے پھر پوچھا آپ پھر خاموش رہے۔ جب اس نے تیسری دفعہ پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿اعفوعنه فی کل یوم سبعین مرة﴾ (ابوداؤد، رقم: ۵۱۶۴)

''اس کو ہر روز ستر مرتبہ معاف کرو۔''

4- اگر ان سے کوئی خطا اور غلطی ہو جائے تو ان کو مت ڈانٹو۔ چنانچہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دس سال رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی۔ آپ ﷺ نے کبھی مجھے اف تک نہیں کہی اور نہ ہی کسی شی کے بارے

میں یہ کہا ہے تو نے یہ کیوں کی؟ اور تو نے یہ کیوں نہیں کی؟
(بخاری: ۶۰۳۸، مسلم: ۲۳۰۹)

5- خادموں اور نوکروں پر سختی کرنے سے منع فرمایا اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میری امت میں سے کسی امر کے بارہ میں اگر کوئی حاکم بنے اور ان پر سختی کرے، اے اللہ تو بھی اس پر سختی فرما، اور جو ان سے نرمی سے پیش آئے تو اے اللہ! تو بھی اس سے نرمی کا سلوک فرما۔ (مسلم عن عائشہ، رقم: ۱۸۲۸، کتاب الامارۃ)

6- خادم یا نوکر کو اگر کسی وجہ سے سزا دی جائے تو جب وہ اللہ کا واسطہ دے کر چھوڑ دینے کی درخواست کرے تو اس کو چھوڑ دینا چاہیے، خواہ کتنا ہی غصہ کیوں نہ آیا ہو۔ فرمایا:

﴿اذا ضرب احدکم خادمه، فذکر اللّٰه، فارفعوا ایدیکم﴾
(ترمذی)

"جب تم اپنے خادم کو مارو اور وہ کہے کہ خدا کے واسطے چھوڑ دو تو اسے چھوڑ دو۔"

سوید بن مقرن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے ایک شخص نے خادم کو مارا۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ اسے آزاد کر دو۔ (مسلم، رقم: ۱۶۵۸)

سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿من ضرب مملوکه ظلماً اقید منه یوم القیامة﴾
(ترغیب وترہیب: ۳:۲۱۱ رواہ الطبرانی)

"جو شخص اپنے غلام کو مارے گا میں قیامت کے روز اس سے قصاص لوں گا۔"

سیدنا ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے غلام کو مارا تھا۔ میں نے سنا کہ کوئی شخص میرے پیچھے کھڑا یہ کہہ رہا تھا: ابو مسعود تحمل کرو، ابو مسعود تحمل کرو، میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ رسول اللہ ﷺ تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "جتنا تم اس پر قادر ہو اللہ تم پر اس سے زیادہ قادر ہے۔" اگر تم ایسا نہ کرتے تو جہنم میں جاتے۔"
(سنن ترمذی، رقم: ۱۹۵۵، مسلم، رقم: ۱۶۵۹، سنن ابی داؤد، رقم: ۵۵۹)

اجتماعی حقوق

مسلمان کے حقوق

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل عربوں کے اندر ایک عجیب قسم کی دشمنی پائی جاتی تھی۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کا دشمن تھا۔ ایک خون کا بدلہ لینے کے لئے پشتوں تک دشمنی چلتی اور سینکڑوں انسان لقمہ اجل بن جاتے۔ ہر شخص اپنی جگہ پر ہر وقت چوکنا رہتا اور اپنے آپ کو خطروں میں گھرا ہوا پاتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے بعثت کے بعد آپ ﷺ نے ایمانی رشتے کو قائم کیا جو نسبی رشتے سے بڑھ کر تھا۔ اس ایمانی رشتہ نے دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دیا۔ اور خاندانی اور قبائلی رنجشیں دور کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو لوگوں کے لئے باعث نعمت قرار دیا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تمہیں ہرگز موت نہ آئے مگر مسلمان ہونے کی حالت میں، اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ نہ ڈالو، اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب تم (آپس میں) دشمن تھے، تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کے کرم سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے، اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تم کو اس سے نجات دی، اللہ اسی طرح تمہارے لئے اپنی آیتوں کو بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ'' (آل عمران: ۱۰۲_۱۰۳)

ان آیات میں تفرقہ کی ممانعت فرمائی گئی۔ مسلمان دنیوی امور، اغراض باطلہ، بغض، حسد اور عصبیت کی وجہ سے ایک دوسرے سے اختلاف نہ رکھیں اور باہمی تفرقہ پیدا

نہ کریں۔ مسلمان جب بھی تفرقہ کا شکار ہوئے عنان حکومت ان کے ہاتھ سے جاتی رہی اور وہ غیر قوموں کے محکوم اور غلام بن گئے۔ اندلس اور ہندوستان کی تاریخ ہمارے اس دعویٰ کی بین دلیل ہے، بغداد میں اسی تفرقہ بازی اور شیعہ سنی اختلافات کی وجہ سے ہلاکو خان اور چنگیز خان کے ہاتھوں ان کو ذلت اٹھانا پڑی۔ چنانچہ مسلمانوں کو اس قسم کے تفرقہ اور اختلافات سے روکا گیا۔ چنانچہ فرمان خداوندی ہے۔

﴿ولا تنازعوا فتفشلوا و تذهب ريحكم﴾ (الانفال:۴۶)

''اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔''

احادیث نبویہ میں رسول اللہ ﷺ نے مختلف مثالوں سے مسلمانوں کو اس تشتت وافتراق سے منع فرمایا۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''مومن مومن کے لئے ایک دیوار کی طرح ہے جس کے بعض اجزاء بعض کو مضبوط کرتے ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنی انگلیاں انگلیوں میں ڈالیں۔

(بخاری ۸۹۳/۲)

رسول اللہ ﷺ نے تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

''مسلمانوں کا ایک دوسرے پر رحم کرنا، ایک دوسرے سے دوستی رکھنا اور ایک دوسرے پر نرمی کرنا تم دیکھو گے کہ اس کی مثال ایک جسم کی طرح ہے۔ جب جسم کے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم درد اور تکلیف سے بے قرار ہو جاتا ہے اور جاگتا رہتا ہے۔'' (بخاری، رقم:۸۹۳/۲)

خطبہ حجۃ الوداع میں آپ نے فرمایا:

''تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں اسی طرح حرام کردی گئی ہیں جس طرح اس دن کی اس مہینے میں اور اس شہر میں حرمت ہے۔''

(بخاری:۸۹۳/۲)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حسد کرنے سے بچو کیوں کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا

جاتی ہے۔" (سنن ابی داؤد: ۲/۳۱۶)

سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کیا میں تم لوگوں کو اس عبادت کی خبر نہ دوں جس کا نماز روزہ اور صدقہ سے زیادہ اجر ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: "کیوں نہیں، یا رسول اللہ!" آپ نے فرمایا: "دو لڑے ہوئے شخصوں میں صلح کرا دینا۔" (سنن ابی داؤد: ۲/۳۱۷)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کسی مسلمان کے لئے تین روز سے زیادہ اپنے مسلمان بھائی سے ترک تعلق رکھنا جائز نہیں ہے، اور جس نے تین دن سے زیادہ ترک تعلق رکھا اور مر گیا تو وہ جہنم میں جائے گا۔ (سنن ابی داؤد: ۲/۳۱۷)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوگی جب اختلاف دیکھو تو سواد اعظم کے ساتھ رہو۔"

(سنن ابن ماجہ: ص ۲۸۳)

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے منبر پر بآواز بلند فرمایا:

"اے لوگو! جو زبان سے اسلام لائے ہو اور ایمان تمہارے دلوں تک نہیں پہنچا، مسلمانوں کو ایذا نہ دو، ان کو عار نہ دلاؤ، ان کے عیوب تلاش نہ کرو، کیوں کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے عیوب تلاش کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے عیوب کو ظاہر کرے گا۔ اور جس کے عیوب کو اللہ ظاہر کردے گا اس کو رسوا کر دے گا، خواہ وہ کجاوے کے اندر چھپا ہو۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دن بیت اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا کہ تو کس قدر عظیم ہے اور تیری حرمت کس قدر عظیم ہے، اور اللہ کے نزدیک مومن کی حرمت تجھ سے زیادہ ہے۔"

(سنن الترمذی: ص ۲۹۷)

نبی اکرم ﷺ کی اسی تعلیم نے ان کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا اور دشمنی کے تمام جراثیم ان کے دلوں سے دور ہو گئے اور دشمنی کے جذبات کے بجائے ایک دوسرے کے لئے محبت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے بطور نعمت ذکر فرمایا ہے۔

(آل عمران: ۱۰۳)

مدینہ طیبہ میں دو بڑے قبیلے اوس اور خزرج تھے جن کی صدیوں سے آپس میں دشمنی چلی آ رہی تھی۔ دونوں قبیلے ایک دوسرے کو قتل کرنے کے موقع کی تلاش میں رہتے اور جب یہ لوگ حلقہ اسلام میں داخل ہوئے تو ان کی دشمنیاں باہمی محبت، خیر خواہی اور تعاون میں تبدیل ہو گئیں اور حق تعالیٰ نے اس محبت و الفت کو نعمت قرار دیتے ہوئے فرمایا: "اور (اللہ ہی نے) مسلمانوں کے دلوں میں الفت و محبت پیدا کی۔ اگر آپ زمین کا سب کچھ بھی خرچ کر دیتے تو ان کے دلوں میں الفت پیدا نہیں کر سکتے تھے، لیکن اللہ نے ان کے دلوں میں الفت پیدا کی۔ (الانفال: ۶۳)

مسلمانوں کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل اور نعمت کی قدر کریں اور سب مل کر اللہ کے دین کی رسی کو جو ان کی یگانگت کا اصلی رشتہ ہے، مضبوط پکڑیں اور باہمی اختلافات اور تشتت وانتشار سے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں۔

ایک اور موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرے، نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑے اور نہ اس کی تحقیر کرے .... انسان کے لئے یہ برائی کیا کم ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے۔ مسلمان کا ہر حصہ دوسرے مسلمان پر حرام ہے، ان کا خون، ان کا مال اور ان کی عزت و آبرو۔ (مسلم: ۲/۳۸۲)

ابوداؤد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ نہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس کو اس کے دشمن کے حوالے کرے۔ جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت پوری کرے گا، اور جو کوئی کسی مسلمان کی تنگی کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں قیامت کے روز اس کی تنگی کو دور فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی پردہ پوشی کرے گا۔"

(سنن ابوداؤد: ۲/۱۹۰، کتاب الادب)

یہ تو صرف چند حقوق تھے جن کا تذکرہ سطور بالا میں کیا گیا ہے۔ اسلام نے تو ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر بے شمار حقوق رکھے ہیں، اور سرکار دو عالم ﷺ کا اسوۂ حسنہ اس بارہ میں تمام مسلمانوں کے لئے ایک روشنی کا مینار ہے جس کی روشنی میں

ایک مسلمان اپنے اخلاق کی راہیں تلاش کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ پر جب غار حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی تو آپ ہانپتے کانپتے اپنے گھر پہنچے اور سیدہ خدیجہ ؓ کو سارا قصہ سناتے ہوئے فرمایا: "انی خشیت علی نفسی" مجھے اپنی جان کا خطرہ ہو گیا ہے۔ تو سیدہ ؓ نے جواب میں کہا۔

﴿کلا واللہ لا یخزیک اللہ ابدا﴾

"اللہ تعالیٰ ہرگز آپ کو رسوائی میں مبتلا نہیں کریں گے۔"

اور وجہ اس کی سیدہ خدیجہ ؓ نے یہ بیان کی:

﴿انک لتصل الرحم، وتحمل الکل، و تکسب المعدوم و تقری الضیف و تعین علیٰ نوائب الحق﴾

"کیوں کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں ،اور مال سے آپ دوسروں کی مدد کرتے ہیں، آپ مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق بجانب امور میں مصیبت زدہ لوگوں کی مدد فرماتے ہیں۔" (بخاری، رقم ۳)

یہ وہ اوصاف ہیں جو ایک مسلمان میں اسلام دیکھنا چاہتا ہے، کیوں کہ یہ جناب مصطفیٰ ﷺ کے اخلاق حسنہ ہیں۔ یہ اخلاق آپ ہر ایک سے برتتے تھے۔ آپ کے بعد ایک مسلمان کو کم از کم یہ اخلاق ہر مسلمان برتنے چاہئیں۔

ایک مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو اپنی زبان اور اپنے ہاتھ کے شر سے محفوظ رکھے جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

﴿المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده﴾

(بخاری، رقم: ۱۰)

"مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔"

کیوں کہ مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿انما المومنون اخوة﴾ (حجرات: ۱۰)

"مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔"

ایمان اخوت اور نفوس کے روابط میں سب سے مضبوط رابطہ، دلوں کے تعلقات ہیں۔ سب سے مستحکم تعلق، عقلوں اور ارواح کے رشتوں میں سب سے قوی رشتہ ہے، اس لئے اس میں کوئی تعجب نہیں کہ یہ بے مثل اخوت، محبت کا ایک ایسا طریقہ وجود میں لاتی ہے، جو اپنی بلندی، عظمت، گہرائی و گیرائی اور دوام میں منفرد نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ جسے اسلام "اللہ کے لئے محبت" کا نام دیتا ہے۔ چنانچہ جس شخص میں یہ تین باتیں ہوں گی وہ اپنے اندر ایمان کی حلاوت کو محسوس کرے گا:

1- اللہ اور اس کا رسول ﷺ سب سے زیادہ محبوب ہو۔

2- آدمی کی محبت صرف اور صرف اللہ کے لئے ہو، کوئی دنیوی غرض اس میں نہ ہو۔

3- ہدایت پانے کے بعد کفر میں لوٹ جانا اسے اتنا ہی ناپسندیدہ ہو جتنا کہ آگ میں ڈال دیا جانا۔ (بخاری، باب حلاوۃ الایمان: ۱۶، مسلم، رقم: ۴۳)

مسلمانوں کی باہمی محبت کو اسلام بہت پسند کرتا ہے کیوں کہ اس باہمی محبت و تعاون سے ایک ایسی اجتماعی قوت وجود میں آتی ہے جو رزم حق و باطل میں مومن کو فولاد بنا دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہ اتنی محبوب ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ جن سات لوگوں کو اپنے سایہ میں جگہ دے گا، ان میں ایک شخص وہ ہے۔

﴿رجلان تحابا فی اللہ اجتمعا علیہ و تفرقا علیہ﴾

(مسلم، رقم: ۱۰۳۱، بخاری، رقم: ۶۶۰)

"وہ دو اشخاص جو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے باہم محبت کریں، صرف اسی کی رضا کے لئے جمع ہوں اور اسی کی رضا کے لئے جدا ہوں۔"

اور اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان کو یہ مژدہ سنائیں گے:

"کہاں ہیں میری عظمت کی وجہ سے باہم محبت کرنے والے؟ آج میں ان کو اپنے سایہ میں پناہ دوں گا جب کہ آج میرے سایہ کے سوا کوئی اور سایہ نہیں۔"

(مسلم: ۲۵۶۶)

کیوں کہ مفادات و مصالح اور شہوات و منافع سے بھری ہوئی دنیا میں کسی

دوسری چیز کے بجائے صرف اور صرف اللہ کے لئے کسی سے محبت کرنا نہایت مشکل کام ہے، جو صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کے نفوس پاکیزہ اور ارواح بلند ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے لئے نور کے ایسے منبر عطا کرے گا جن پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے۔

پھر کیسے عجیب انداز میں اس باہمی محبت کو پروان چڑھایا گیا جس کی وجہ سے ہر مومن کا دل یہ چاہنے لگا کہ میں دوسرے مومن سے زیادہ سے زیادہ محبت کروں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ما تحاب الرجلان الا کان افضلهما اشدهما حباً لصاحبه﴾

''باہم محبت کرنے والے دو اشخاص میں سے افضل وہ ہے جو اپنے بھائی سے زیادہ محبت کرے۔'' (رواہ البخاری فی الادب المفرد: ۵۴۴)

حدیث میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ایک شخص اپنے کسی بھائی سے محبت کرنے کے لئے دوسرے گاؤں جا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے راستہ میں ایک فرشتہ مقرر کر دیا۔ جب وہ شخص اس فرشتے کے پاس پہنچا تو فرشتے نے اس سے پوچھا! ''کہاں جانے کا ارادہ ہے؟'' اس نے جواب دیا کہ ''اس گاؤں میں میرا ایک بھائی رہتا ہے اس سے ملنے جا رہا ہوں۔'' فرشتے نے پوچھا: ''کیا تجھ پر اس کا کوئی احسان ہے کہ جس کی وجہ سے تم اس کے پاس جا رہے ہو؟'' اس نے کہا: ''نہیں، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں، مجھے اس سے صرف اللہ کے لئے محبت ہے۔'' فرشتے نے کہا:

﴿انی رسول الله الیک بان الله قد احبک کما احببته فیه﴾
(مسلم، رقم: ۲۵۶۷)

''میں اللہ کا رسول ہوں اور تجھے یہ بتلانے آیا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم سے اسی طرح محبت کرتا ہے جس طرح تم نے صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے اس بھائی سے محبت کی ہے۔''

اس باہمی محبت کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو نہ تو حقیر سمجھتا ہے، نہ اس کو گالی دیتا ہے اور نہ ہی اس سے نفرت کرتا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے:

﴿سباب المسلم فسوق و قتاله کفر﴾

(بخاری:۱/۴۸، مسلم، رقم:۶۳)

''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس کو قتل کرنا کفر ہے۔''

سیدنا ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمان عورتوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

﴿یا نساء المسلمات! لا تحقرن جارة لجارتها ولو فرسن شاة﴾

''اے مسلمان عورتو! کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کو کوئی قلیل شئی دینے میں حقارت نہ محسوس کرے خواہ وہ بکری کا کھر ہی کیوں نہ ہو۔''

(رواہ البخاری، رقم: ۲۰۱۷، مسلم، رقم: ۱۰۳۰)

حدیث میں آتا ہے رسول اللہ ﷺ ایک انصاری کے پاس سے گزرے جو اپنے بھائی کو حیاء کے بارہ میں بتا رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا:

﴿دعه، فان الحیاء من الایمان﴾ (بخاری، رقم:۲۴)

''اس کو چھوڑ دو، حیاء ایمان کا ایک جزو ہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان کا ایک حق یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو نیکی کی تلقین کرتا رہے۔

ایک حق مسلمان کا یہ ہے کہ اس کی حق کے ساتھ نصرت کی جائے اور اس سے ظلم کو دفع کیا جائے اور اس کی عزت و ناموس کی حفاظت کی جائے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ اپنے ظالم اور مظلوم بھائی دونوں کی مدد کرو۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ ''مظلوم کی مدد تو سمجھ میں آ گئی، ظالم کی مدد کیسے کی جائے؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿تمنعه من الظلم﴾

''اس کو ظلم کرنے سے منع کرنا یہ ظالم کی مدد ہے۔''

(رواہ البخاری:۳/۲۶، مسلم:۲۵۸۴)

ایک مومن کو دوسرے مومن کی ہر حال میں خیر خواہی کرنی چاہیے کیوں کہ ''الدین النصیحة'' دین تمام ہی خیر خواہی کا ہے۔ (رواہ مسلم عن تمیم الداری ؓ:۵۵)

اسی وجہ سے فرمایا گیا:

''مومن مومن کا آئینہ ہے، اور مومن مومن کا بھائی ہے، وہ اس کی ان چیزوں کو محفوظ رکھتا ہے جن کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، اور اس کی غیر حاضری میں اس کی حفاظت کرتا ہے۔'' (رواہ ابوداؤد، رقم: ۴۹۰۷)

مطلب یہ ہے کہ جس طرح آئینہ میں چہرہ صحیح طور پر نظر آجاتا ہے اور اس کے عیوب معلوم ہو جاتے ہیں مگر آئینہ خاموشی سے سب کچھ بتاتا ہے، اسی طرح ایک مومن بطور خیر خواہی دوسرے کے عیوب اسے بتاتا ہے مگر انہیں مشتہر نہیں کرتا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ''اللہ اس پر رحم فرمائے جو مجھے میری کوتاہیوں اور غلطیوں کا ہدیہ پیش کرے۔''

سیدنا جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز کے قائم کرنے، زکوۃ کے ادا کرنے اور ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کرنے پر بیعت کی۔
(رواہ البخاری ۱/ ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰/ ۱۶۸، مسلم، رقم: ۵۶ واخرجہ ابوداؤد، رقم ۴۹۴۵ والنسائی ۷/ ۱۵۲)

یہ بھی ایک مسلمان کی خیر خواہی ہے کہ اس کی عزت وناموس کی حفاظت کی جائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

﴿من ذب عن عرض اخیه ردّ اللّٰه عن وجهه النار یوم القیامة﴾ (سنن الترمذی، ۱۹۳۱)

''جو شخص اپنے بھائی کی عزت وآبرو کی حفاظت کرتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز جہنم کی آگ کو اس سے ہٹادیں گے۔''

سیدنا سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا جس شخص کے سامنے کسی مومن کو (ناحق) ذلیل کیا جائے اور وہ اس کی مدد نہ کرے جب کہ وہ اس کی مدد کرنے پر قادر بھی ہو، اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے روز تمام لوگوں کے سامنے ذلیل کرے گا۔ (رواہ احمد فی مسندہ: ۳/ ۴۸۷، مجمع الزوائد ۷/ ۲۶۷)

سیدہ اسماء بنت یزید فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اپنے بھائی کی غیر حاضری میں اس کی عزت وآبرو کی حفاظت کرے، اللہ کے ذمہ یہ حق ہے کہ وہ

اسے جہنم سے آزاد کر دے۔ (الترغیب والترہیب للمنذری: ۳/ ۱۵۱۷، وقال رواہ احمد باسناد حسن)

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ایک مسلمان کے حقوق بتاتے ہوئے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا: مریض کی عیادت کرنے، جنازوں کے ساتھ جانے، کمزور کی مدد کرنے، مظلوم کی اعانت کرنے، سلام کو پھیلانے، قسم کو پورا کرنے اور ہمیں منع فرمایا: چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے، سونے کی انگوٹھی پہننے اور ریشمی لباس پہننے سے۔'' (بخاری مع الفتح: ۱۱/ ۶۲۳۵، مسلم: ۲۰۶۶)

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اطعموا الجائع، وعودوا المریض، و فکوا العانی﴾

(بخاری: ۹/ ۵۳۷۴)

''بھوکوں کو کھانا کھلاؤ، اور بیماروں کی عیادت کرو اور قیدیوں کو چھڑاؤ۔''

ایک اور روایت میں فرمایا:

﴿عودو المریض، واتبعوا الجنائز، تذکرکم الآخرۃ﴾

(الادب المفرد: ص ۱۳۸)

''مریض کی عیادت کرو، جنازوں کے ساتھ جاؤ وہ تمہیں آخرت کی یاد دلائیں گے۔''

مسلمان کا ایک حق یہ ہے کہ بوڑھے شخص اور صاحب عزت شخص کا اکرام کیا جائے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''اللہ تعالیٰ کا اجلال (تعظیم) یہ بھی ہے کہ بوڑھے مسلمان کی عزت کی جائے اور قرآن پڑھنے پڑھانے والے کی بھی جو اس میں غلو نہ کرتا ہو اور نہ اسے ترک کرتا ہو، اور عادل حاکم کی عزت کی جائے۔'' (ابوداؤد، رقم: ۴۸۴۳)

گویا تین آدمیوں کا اکرام اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے۔ بڑی عمر کا مسلمان، حافظ قرآن اور انصاف کرنے والا حاکم، کیوں کہ ان کا اعزاز و اکرام ان کی اچھی صفات کے باعث ہوگا جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔

سیدنا جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی تو میں آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: "جریر! کیسے آئے؟" عرض کی! "یا رسول اللہ! میں اس لئے آیا ہوں کہ آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کروں۔ سیدنا جریر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

﴿اذا جاء کریم (قوم) فاکرموہ﴾ (ابن ماجہ، رقم ۳۷۱۲)
"جب کوئی صاحب عزت شخص آئے تو اس کی تکریم کرو۔"

ایک مسلمان کا حق یہ بھی ہے کہ اس کی دعوت کو قبول کیا جائے اور جب وہ اللہ کے نام سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دی جائے، جب وہ اللہ کا نام لے کر سوال کرے تو اس کو دیا جائے، اور جب وہ قسم کھائے تو اس کی تصدیق کی جائے اور جب وہ کوئی نیکی کرے تو اس کا بدلہ دیا جائے یا اس کے لئے دعا کی جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جو اللہ کے نام پر پناہ مانگے اسے پناہ دو، اور جو اللہ کے نام پر سوال کرے اسے عطا کرو، اور جو تمہاری دعوت کرے اسے قبول کرو، اور جو تم سے نیکی کرے اس کا بدلہ دو اور اگر بدلہ نہ دے سکو تو اس وقت تک اس کے لئے دعا کرو کہ تمہارے نزدیک اس کا بدلہ ہو جائے۔" (رواہ ابوداؤد، رقم ۱۶۷۲)

ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نیکی کرنے والے کو جس نے "جزاک اللہ خیرا" کہا تو اس نے نیکی کرنے والے کی حد درجہ ثنا کی یعنی اپنے عجز کا اظہار کر کے جزا کو اللہ کے حوالے کر دیا، گویا اس نے شکریہ ادا کر دیا۔

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں، سلام کا جواب دینا، چھینک مارنے والے کو دعا دینا، اور دعوت قبول کرنا، اور بیمار کی عیادت کرنا اور جنازے کے پیچھے جانا۔" (بخاری، مسلم، نسائی، ابوداؤد، رقم ۵۰۳۰)

مسلم کی ایک روایت میں ایک حق یہ بھی بتایا گیا کہ جب وہ تجھ سے مشورہ

مانگے تو اسے صحیح مشورہ دے۔

ایک حق مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ ہے کہ وہ اس کو پریشان نہ کرے کیوں کہ اس سے اسے ایذا پہنچے گی اور کسی مسلمان کو ایذا دینا حرام ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ چند صحابہ کرام ﷺ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی سو گیا تو کوئی شخص اس کی ایک رسی کی طرف گیا اور اسے پکڑ لیا۔ وہ شخص گھبرا گیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿لا یحل لمسلم ان یروع مسلماً﴾

(ابوداؤد، رقم: ۴۹۹۴، جامع الاصول: ۱۱/ ۵۸)

''کسی مسلمان کیلئے حلال نہیں ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کو ڈرائے۔''

اسی سلسلہ میں ابوداؤد ہی میں ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کا سامان مزاح سے نہ لے کہ پھر واپس ہی نہ دے۔'' سلیمان راوی نے کہا کہ فرمایا: ''نہ مزاح اور نہ سچ سچ سے، اور جو اپنے بھائی کا عصا لے وہ اسے واپس کر دے۔'' (رواہ ابوداؤد، رقم: ۴۹۹۱)

سیدنا ابوہریرہ ﷺ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص اپنے بھائی کی طرف چھری وغیرہ یا کسی اور ہتھیار سے اشارہ کرے، فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں، اگرچہ وہ اس کا باپ کی طرف سے بھائی ہو یا ماں کی طرف سے۔ (رواہ مسلم، رقم: ۲۶۱۶)

کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کو کسی قسم کی کوئی ایذاء نہ دے یہاں تک کہ بدبو کی ایذا بھی نہ دے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص پیاز، لہسن اور گندنا (لہسن کی طرح بدبودار سبزی) کھائے وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے کیوں کہ اس سے جس طرح انسانوں کو تکلیف اور ایذا ہوتی ہے اسی طرح ملائکہ کو بھی ایذا ہوتی ہے۔''

(رواہ البخاری، رقم: ۸۵۴، مسلم: ۵۶۴ عن جابر بن عبداللہ ﷺ)

مسلمان کا یہ بھی حق ہے کہ اس کے عیوب کی تشہیر نہ کی جائے بلکہ ان کو چھپایا جائے۔ وہ خود بھی چھپائے اور دوسرے اگر ان عیوب سے آشنا ہو جائیں تو وہ بھی چھپائیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو بندہ کسی بندے کی دنیا میں پردہ پوشی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔'' (مسلم، رقم: ۲۵۹۰)

سیدنا ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا آپ ﷺ فرماتے تھے کہ ''میری امت کا ہر فرد درگزر کے قابل ہوگا سوائے ان لوگوں کے جو کھلم کھلا گناہ کرنے والے ہوں گے، اور یہ بھی اعلانیہ گناہ میں سے ہے کہ آدمی رات کو کوئی گناہ کا کام کرے پھر صبح کو باوجود اس بات کے کہ اللہ نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا، وہ کہے، اے فلاں! گزشتہ رات میں نے اس طرح کام کیا حالانکہ اس نے وہ رات اس طرح گزاری تھی کہ اس کے رب نے اس کی پردہ پوشی کر دی تھی اور یہ صبح کو وہ پردہ چاک کر رہا ہے جو اللہ نے اس پر ڈال دیا تھا۔'' (بخاری: ۱۰/۴۰۵، مسلم: ۲۹۹۰)

مسلمان کا یہ بھی ایک حق ہے کہ اس کے سلام کا جواب اچھے طریقے سے دیا جائے جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے۔ (نساء/۸۶)

اس سلسلہ میں سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا ''السلام علیکم''۔ آپ نے اس کے سلام کا جواب دیا اور وہ بیٹھ گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: دس (نیکیاں)۔ پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا: ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' آپ نے اس کے سلام کا بھی جواب دیا اور فرمایا: بیس (نیکیاں) پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا: ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' آپ نے سلام کا جواب دیا اور وہ بیٹھ گیا۔ پھر آپ نے فرمایا: تیس (نیکیاں)۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا۔ ابوداؤد میں ہے کہ پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا: ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ''۔ آپ نے فرمایا چالیس (نیکیاں)

(سنن ابی داؤد، رقم: ۵۱۹۵، سنن ترمذی: ۲۶۹۸، الادب المفرد، رقم: ۹۸۶)

ایک مسلمان کا یہ بھی حق ہے کہ عہد کو پورا کیا جائے اور امانت کو ادا کیا جائے۔

چنانچہ قرآن حکیم میں ہے۔

﴿یا ایھا الذین آمنوا اوفوا بالعقود﴾ (المائدہ:۱)

"اے ایمان والو! اپنے عہدوں کو پورا کرو۔"

اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿ردّ الامانۃ الیٰ من ائتمنک ولا تخن من خانک﴾

(ابوداؤد، رقم:۳۵۳۰، ترمذی، رقم:۱۲۶۴)

"جس نے تجھے امانت دی وہ امانت اس کو ادا کر، اور جو تجھ سے خیانت کرے تو اس سے خیانت نہ کر۔"

ایک اور روایت میں ہے:

﴿المستشار مؤتمن﴾

"جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امین ہے۔" (ترمذی:۲۸۲۲)

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیامت کے روز بڑی خیانت میں یہ (خیانت) ہوگی کہ شوہر اپنی بیوی کے پاس رہے اور بیوی شوہر کے پاس رہے۔ پھر شوہر بیوی کا راز فاش کرے۔" (ابوداؤد، رقم:۴۸۷۰)

پڑوسی کے حقوق

پڑوسی وہ ہے جو قریب رہتا ہے۔ انسانیت کے تمدن کی بنیاد اشتراک عمل، تعاون اور موالات پر قائم ہے کیوں کہ اس دنیا میں ہر انسان دوسرے انسان کی مدد کا محتاج اور خواہاں ہے۔ اگر ایک بھوکا ہے تو دوسرے پر یہ حق اور ضروری ہے کہ وہ اپنے کھانے میں اس کو شریک کرے، اگر ایک بیمار ہے تو دوسرا اس کی تیمارداری کرے۔ اس اخلاقی نظام میں انسانوں کی مجموعی آبادی باہمی محبت اور حقوق کی ذمہ داریوں کی گرہ میں بندھ کر ایک ہو جاتی ہے۔ اسلام نے ان دونوں انسانوں پر جو ایک دوسرے کے قریب رہتے ہوں آپس کی محبت ومودت اور باہمی تعاون کی ذمہ داری رکھی ہے کیوں کہ وہ اوروں سے پہلے وقت پر ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔

لیکن یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ انسان کو اس سے تکلیف اور دکھ پہنچنے کا اندیشہ اور خطرہ بھی زیادہ ہوتا ہے جو زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اسی سے یہ محاورہ ہے۔ "الاقارب کالعقارب" قریبی بچھو ہوتے ہیں۔ اسی پر ایک شاعر نے کہا۔

الاقارب كالعقارب فى الايذاء

فلا تفرح بعم او بخال

فكم عم يكون الغم فيه

وكم خال عن الاحسان خال

اسی وجہ سے ان قریبی رہنے والوں سے تعلقات خوش گوار رکھنا نہایت ضروری ہے، اور اسلام نے اس بارہ میں بہت ساری تعلیمات دی ہیں تاکہ برائیوں اور باہمی

ناخوش گواریوں کا سد باب ہو کہ یہ پڑوس جہنم نہ بنے بلکہ جنت کا نمونہ ہو۔

اس بارہ میں امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ پڑوسی کے حقوق و آداب میں سے یہ ہے کہ اس کو ابتداء سلام کرے اور اس سے زیادہ دیر گفتگو نہ کرے۔ ان کے خانگی معاملات کی تفتیش نہ کرے اور نہ ہی ان کی ٹوہ لگائے۔ بیماری میں اس کی عیادت کرے۔ مصیبت میں اظہار ہمدردی اور موت میں اس کی تعزیت کرے اور تجہیز و تکفین میں شریک ہو۔ خوشی کے موقع پر اس کو مبارکباد دے اور اس کی خوشیوں میں شریک ہو، اس کے عیوب معلوم کرنے کی کوشش نہ کرے، اس کے گھر میں نظر نہ ڈالے اور اگر اس کے گھر کا اندرونی منظر دکھائی دیتا ہو تو اس کو چھپانے کی کوشش کرے۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کے گھر والوں کا خیال رکھے اور دین اور دنیا کی بھلائی سے جو باتیں اس کے بچے نہ جانتے ہوں وہ ان کو بتلائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اگر پڑوسی تم سے مدد طلب کرے تو اس کی مدد کرو، اگر قرض مانگے تو قرض دو۔ مرض میں اس کی عیادت کرو، مر جائے تو جنازہ میں شریک ہو، اس کی اجازت کے بغیر اس کے مکان کے سامنے اتنا اونچا مکان نہ بناؤ جس سے اس کی ہوا رک جائے یا اس کی بے پردگی ہو، اس کو ایذا مت دو۔ اگر پھل خریدو تو اس کو ہدیہ دو، اور اگر نہ دے سکو تو اپنے گھر میں چپکے سے پھل لے جاؤ تا کہ اس کے بچوں کو پتہ نہ چلے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ پڑوسی تین قسم کے ہیں۔ اول وہ جو پڑوسی بھی ہو اور رشتہ دار بھی، اس کا حق سب سے زیادہ ہے، دوسری قسم عام مسلمان پڑوسی کی ہے۔ اس کا حق دوسرے درجہ پر ہے اور تیسرا پڑوسی غیر مسلم شخص ہے، اور جو احکام مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں ہیں ان تمام احکام، حقوق اور آداب کا غیر مسلم پڑوسی بھی مستحق ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

﴿واعبدوا الله ولا تشركوا به شيئاً وبالوالدين احساناً و بذي القربى واليتامى والمساكين والجار ذي القربى و الجار الجنب والصاحب بالجنب و ابن السبيل، و ما ملكت ايمانكم، ان الله لايحب من كان مختالاً فخوراً﴾ (النساء:٣٦)

''اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، اور
ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں
اور قرابت دار پڑوسی اور اجنبی پڑوسی اور مجلس کے ساتھی اور مسافر
اور اپنے غلاموں کے ساتھ (نیکی کرو) بے شک اللہ مغرور اور متکبر
کو پسند نہیں کرتا۔''

اسلام نے پڑوسی کا سلسلہ صرف مسلمانوں ہی تک نہیں رکھا بلکہ غیر مسلم پڑوسی بھی اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''پڑوسی تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ پڑوسی جس کا صرف ایک حق ہے، اور وہ سب سے ادنیٰ پڑوسی ہے۔ دوسرا وہ پڑوسی جس کے دو حق ہیں اور تیسرا وہ پڑوسی ہے جس کے تین حق ہیں۔ وہ پڑوسی جس کا صرف ایک حق ہے وہ ہے جو مشترک ہے اور اس سے کوئی رحمی رشتہ بھی نہیں۔ اور وہ پڑوسی جس کے دو حق ہیں، وہ پڑوسی ہے جو پڑوسی بھی ہے اور مسلمان بھی اور وہ پڑوسی جس کے تین حق ہیں وہ رشتہ دار پڑوسی ہے۔ جو پڑوسی بھی ہو اور مسلمان بھی ہو اور رحمی رشتہ دار بھی ہو۔ (ذکرہ السیوطی نحوہ فی الجامع الکبیر: ۵۲/۲)

احسان کرنے میں اسلام مسلمان پڑوسی اور غیر مسلم کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا۔ چنانچہ مجاہدؒ روایت کرتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمر ؓ کے ہاں ایک غلام تھا۔ اس نے ایک بکری ذبح کی۔ سیدنا ابن عمر ؓ نے اپنے غلام سے فرمایا: ''اے غلام! ہمارے یہودی غلام کو نہ بھولنا۔ آپ نے یہ بات دو تین بار دہرائی۔ مجاہد کہتے ہیں کہ میں نے حیرانگی سے پوچھا: ''آپ اتنی مرتبہ کیوں کہہ رہے ہیں؟'' سیدنا عبداللہ بن عمر ؓ نے فرمایا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جبرئیل مجھ کو ہمیشہ پڑوسی کے بارہ میں وصیت کرتے رہے حتیٰ کہ میں نے یہ گمان کیا کہ وہ پڑوسی کو میرا وارث کر دے گا۔''

(سنن ترمذی، رقم: ۱۹۴۳، بخاری، رقم: ۶۰۱۴، مسلم، رقم: ۲۶۲۴، سنن ابوداؤد، رقم: ۵۱۵۱، سنن ابن ماجہ، رقم: ۳۶۷۳)

حجۃ الوداع کے موقع پر جب کہ سوا لاکھ سے زائد انسان آپ کے سامنے موجود

تھے، آپ ﷺ نے اس وقت بھی پڑوسی کے بارہ میں لوگوں کو حسن سلوک کی تاکید فرمائی۔ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

"حجۃ الوداع میں آپ اونٹنی پر سوار تھے۔ میں نے اس حالت میں آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: لوگو! میں تمہیں پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کرتا ہوں۔ آپ نے یہ اتنی بار فرمایا اور پڑوسیوں کے حقوق پر اتنا زور دے کر فرمایا کہ میں سمجھنے لگا کہ آپ ﷺ اسے وراثت میں حق دار قرار دے دیں گے۔"

(ترمذی، رقم:۱۹۴۳، ابوداؤد، رقم:۵۱۵۲، مسند احمد:۵:۲۶۷)

رسول اللہ ﷺ نے پڑوسی سے حسن سلوک اور اچھا برتاؤ کرنے کو اس قدر اہمیت دی کہ اس کو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے ایمان کی علامات میں سے ایک علامت اور اس کے بہترین نتائج میں سے ایک لازمی اور حتمی نتیجہ قرار دیا ہے۔ آپ نے امت کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

﴿من كان يؤمن بالله و اليوم الآخر فليحسن الى جاره، ومن كان يومن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه﴾

(بخاری:۱۰، ۴۴۵۱، رقم:۶۰۱۸، مسلم:۱/۲۲۱)

"جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرے، جو شخص اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔"

پڑوسی کو تکلیف اور ایذا دینا ایمان کی کمزوری کی علامت بتایا اور اس سے سختی سے روکا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿والله لايؤمن، والله لايؤمن، والله لايؤمن، قالوا! من يا رسول الله قد خاب وخسر؟ فقال: من لايأمن جاره بوائقه﴾

(بخاری:۱۰/۳۴۳، مسلم:۱/۲۲۰)

"اللہ کی قسم وہ مومن نہیں، اللہ کی قسم وہ مومن نہیں، اللہ کی قسم وہ مومن نہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: "یا رسول اللہ ﷺ! ایسا

خائب و خاسر کون ہے؟ فرمایا: ''جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے امن میں نہ ہو۔''

اور مسلم کی روایت میں ہے کہ:

﴿لا یدخل الجنة من لا یأمن جاره بوائقه﴾

''وہ شخص جنت میں نہیں جائیگا جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی امن میں نہ ہو۔''

ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں:

﴿من کان یؤمن باللّٰہ والیوم الآخر فلا یؤذ جاره﴾

''جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائے۔''

شریعت نے پڑوسی کو اذیت دینے کو جہنم میں جانے کا سبب قرار دیا۔ (نسأل اللّٰہ العافیة) چنانچہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ ''فلاں عورت اپنی کثرت نماز، صدقہ اور روزوں کی کثرت کی وجہ سے مشہور ہے لیکن وہ اپنی زبان سے اپنے پڑوسیوں کو اذیت دیتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ھی فی النار'' وہ جہنم میں جائے گی۔ (اخرجہ احمد فی مسندہ، ۲: ۴۴۰، ابن حبان، رقم ۵۷۶۴، مسند البزار، رقم: ۱۹۰۲)

پڑوسی کا یہ بھی حق ہے کہ اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور اگر وہ بھوکا ہو تو اسے کھانا کھلایا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿ما آمن بی من بات شبعان و جاره جائع الی جنبه وھو یعلم﴾

''وہ شخص مجھ پر ایمان نہیں لایا جس نے پیٹ بھر کر رات گزاری اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا سویا جب کہ وہ جانتا بھی ہے۔''

(رواہ الطبرانی فی المعجم الکبیر، ۱: ۲۴۴، والبزار، برقم: ۱۹۰۲، مسند ابی یعلیٰ، ۲۶۹۹)

ایک اور روایت میں ہے:

﴿لیس المؤمن الذی یشبع و جاره جائع﴾ (مسند بزار: ۱۱۹)

”وہ شخص مومن نہیں جو خود تو سیر ہو مگر اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔“

شریعت نے پڑوسی کے ساتھ نہایت نرمی سے معاملات کرنے کی تلقین کی۔ اس کے پڑوسی کو اس کے گھر سے اگر کوئی نفع پہنچ رہا ہو تو اسے روکنا نہیں چاہئے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لا یمنع جار جارہ أن یغرز خشبة فی جارہ﴾

(بخاری، رقم: ۱۰/۵۶۲۷، مسلم، رقم: ۱۶۰۹)

”کوئی پڑوسی اپنے پڑوسی کو دیوار میں کھونٹی گاڑنے سے نہ روکے۔“

اگر کوئی پڑوسی کوئی چیز پکائے جب کہ وہ معاشی طور پر خوش حال ہے تو شریعت یہ کہتی ہے کہ وہ اپنے غریب پڑوسیوں کو فراموش نہ کرے اور اس بات کا خیال رکھے کہ اس کے غریب اور تنگ دست پڑوسیوں کو اس کے کھانے کی خوشبو سے تکلیف نہ پہنچے اور انہیں اپنی مفلسی اور قلاشی کا احساس نہ ہو۔ اس لئے شریعت نے یہ کہا کہ جب تو ہنڈیا پکائے تو اس میں تھوڑا سا پانی زیادہ ڈال دے اور پڑوسیوں کو بھی تھوڑا سا سالن بھیج دے تاکہ اس کے بچے بھی اس کے اچھے سالن سے لطف اندوز ہوسکیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

﴿یا ابا ذر! اذا طبخت مرقة فاکثر ماء ها و تعاهد جیرانک﴾

”اے ابوذر! جب تم شوربے والا سالن پکاؤ تو اس میں پانی زیادہ کرلو اور اپنے پڑوسی کا خیال رکھو۔“

اور اس کی ایک اور روایت میں ہے کہ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے خلیل (نبی اکرم ﷺ) نے مجھے تاکید فرمائی کہ جب تم شوربے والا سالن پکاؤ تو اس میں پانی زیادہ کرلو، پھر اپنے پڑوسیوں کے گھر والوں کو دیکھو اور ان کی بھلائی کے ساتھ اس میں سے کچھ حصہ پہنچاؤ۔ (مسلم، باب الوصیة بالجار والاحسان الیہ، رقم: ۲۶۲۵)

اسلام نے پڑوسی کو یہاں تک اہمیت اور فوقیت دی کہ حق شفعہ میں پڑوسی کو سب سے زیادہ مستحق قرار دیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿الجار احق بسقبه﴾

"پڑوسی قریبی ہونے کے ناطے شفعہ کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔"

(رواه البخاري في كتاب الشفعة، رقم: ۲۲۵۸)

ایک اور روایت میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "پڑوسی شفعہ کرنے کا سب سے زیادہ حق دار ہے اگر وہ موجود نہ ہو تو اس کا انتظار کیا جائے جب کہ دونوں کا راستہ بھی ایک ہو۔ (ترمذی، رقم: ۱۳۶۹)

حسن سلوک میں قریبی پڑوسی کو مقدم رکھنا چاہئے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا جب انہوں نے آپ ﷺ سے دریافت فرمایا تھا کہ "یا رسول اللہ! ﷺ میرے دو پڑوسی ہیں میں ان میں سے کس کو ہدیہ کروں؟ آپ نے فرمایا۔

﴿الی اقربهما منك باباً﴾ (بخاری، رقم: ۲۵۹۵)

"دونوں میں سے اس سے جس کا دروازہ تیرے قریب ہو"

اس بارہ میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ۔

"آدمی حسن سلوک میں دور کے پڑوسی کو قریب کے پڑوسی پر مقدم نہ کرے بلکہ قریب کے پڑوسی کو دور کے پڑوسی پر مقدم رکھے۔" (الادب المفرد، ۱۱۰)

اس ترتیب کا مطلب یہ بھی نہیں کہ جو مسلمان پڑوسی اس کے گھر سے دور رہتے ہیں ان سے بالکل اعراض برت لیا جائے۔ قریبی پڑوسی کو مقدم کرنے کی ترتیب صرف ترجیحی ترتیب ہے۔ جس میں نبی اکرم ﷺ نے قریبی پڑوسی کی نفسیات کی رعایت کی ہے، ورنہ پڑوس کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ ایک مرتبہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا "یا رسول اللہ! میں بنی فلاں کے محلہ میں رہنے لگا ہوں، وہاں جس شخص کا گھر میرے گھر کے سب سے زیادہ قریب ہے وہی مجھے سب سے زیادہ ایذا اور تکلیف دیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ وہ مسجد نبوی میں آئے اور مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر زور سے اعلان کیا۔

''لوگو! جان لو کہ چالیس گھر تک پڑوس ہوتا ہے اور وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے شر سے اس کا پڑوسی مامون نہ ہو۔'' (رواہ الطبرانی فی المعجم الکبیر: ۱۹/۷۳)

پڑوسیوں کے مابین جھگڑے وغیرہ کی نوبت آجائے تو نہایت غور وفکر سے اس معاملہ کو سلجھانا چاہئے کیوں کہ پڑوسی کے بارہ میں روز قیامت سب سے پہلے پوچھ گچھ ہوگی۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اوّل خصمین یوم القیامۃ جاران﴾

(معجم کبیر، رقم: ۸۵۴، مسند احمد ۴/۱۵۱)

''قیامت کے روز سب سے پہلے جو دو جھگڑا کرنے والے پیش کئے جائیں گے وہ دونوں پڑوسی ہوں گے۔''

جو لوگ پڑوسی سے نیک اور حسن سلوک کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں، ان سے روز قیامت سخت باز پرس ہوگی۔ چنانچہ ارشاد نبوت ہے کہ:

''قیامت میں بہت سے پڑوسی ایسے ہوں گے جو اپنے پڑوسی کو پکڑیں گے اور کہیں گے: ''اے رب! اس نے میرے لئے اپنا دروازہ بند رکھا اور مجھ سے خیر واحسان کا معاملہ کرنے سے باز رہا۔''

(الترغیب والترہیب: ۲۷، باب الترغیب فی کفالۃ الیتیم)

پڑوسی اگر کوئی تکلیف دے تو اس پر صبر کرنا چاہئے اس صبر پر بھی اجر عظیم ملتا ہے، ایک دفعہ ایک صحابی محمد بن عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ مجھے میرا پڑوسی تکلیف دیتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: صبر کرو۔ وہ دوبارہ حاضر ہوئے اور پڑوسی کے تکلیف دینے کا ذکر کیا۔ آپ نے پھر فرمایا: صبر کرو۔ پھر وہ تیسری مرتبہ حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مجھے میرے پڑوسی نے تکلیف پہنچائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اپنا سامان گھر سے نکال کر راستہ میں رکھ دو اور جب کوئی شخص وہاں سے گزرے تو اس سے کہو کہ میرے پڑوسی نے مجھ کو تکلیف پہنچائی ہے۔ اس طرح تمہارے پڑوس پر لوگوں کی لعنت پڑے گی۔''

لوگ اس سے پوچھتے تھے اور وہ اپنا قصہ بتاتا تھا۔ لوگ اس کے ہمسائے پر لعنت کرتے اور کہتے اللہ اس کے ساتھ یہ کرے وہ کرے۔ پس اس کا ہمسایہ اس کے پاس آیا اور اس سے کہا: تو واپس چل تو مجھ سے آئندہ کوئی ناپسندیدہ چیز نہ دیکھے گا۔"

(ابوداؤد، رقم: ۵۱۳۹)

ایک اور روایت میں ارشاد فرمایا:

"جس شخص کا پڑوسی بداخلاق ہو اور اسے اذیتیں پہنچاتا رہتا ہو اور وہ اس کی اذیتوں پر صبر کرے یہاں تک کہ اسے موت آجائے۔"

(رواہ احمد فی مسندہ: ۵/۱۸۶، معجم کبیر طبرانی: ۲/۱۹۳۷)

ایک روایت میں سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص اپنے دوستوں کے نزدیک اچھا ہو وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے اور جو شخص اپنے پڑوسیوں کے نزدیک اچھا ہو وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے۔"

(رواہ الترمذی، رقم: ۱۹۵۱، الادب المفرد، رقم: ۵۵، سنن الدارمی، رقم: ۲۱۵)

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اذا اراد اللہ بعبد خیرا عسلہ﴾

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو شہد کی طرح میٹھا کر دیتے ہیں۔"

آپ سے پوچھا گیا: "عسلہ" کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا: پڑوسی اس کو محبت کرنے لگتے ہیں۔" (رواہ احمد فی مسندہ: ۴/۲۰۰، ورواہ البیہقی فی الزہد، وقال اسنادہ جید)

برائی برائی ہے جہاں بھی ہو اور گناہ گناہ ہے جہاں بھی سرزد ہو، لیکن اگر وہ اس جگہ ہو جہاں لازمی طور پر نیکی ہونی چاہئے تو اس برائی اور گناہ کا درجہ دوسرے عام گناہوں اور برائیوں سے بڑا زیادہ ہو جاتا ہے۔ زنا حرام ہے اور بہت بڑا گناہ ہے لیکن پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

"زنا حرام ہے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس کو حرام کیا ہے لیکن دس

بدکاریوں سے بڑھ کر یہ بدکاری ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے۔ چوری حرام ہے، اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) نے اس کو حرام کیا ہے لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرالے۔" (الادب المفرد باب حق الجار)

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا ہر صحابی اپنے پڑوسی کا بھائی اور خادم بن گیا۔ ایک مرتبہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا لٹکائے جا رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا: "کیا ہے؟" فرمایا: "امیر المومنین! گوشت کھانے کو جی چاہ رہا تھا تو یہ ایک درہم کا گوشت خریدا ہے۔" فرمایا: "جابر! کیا اپنے پڑوسی یا عزیز کو چھوڑ کر صرف اپنے پیٹ کی فکر کیا چاہتے ہو۔" کیا یہ آیت یاد نہ رہی!

"اس روز کافر دوزخ پر پیش ہوں گے، (ان سے کہا جائے گا) تم اپنے مزے اپنی دنیا کی زندگی میں لے چکے اور اس سے فائدہ اٹھا چکے۔" (الاحقاف ۲۰)

(موطا امام مالک، باب ماجاء فی اکل اللحم)

مہمان کے حقوق

پیغمبر اسلام نے مہمان کے حقوق بھی بتائے کیوں کہ ہر انسان کسی نہ کسی وقت کسی کا مہمان ہوتا ہے۔ اس لئے اسلام نے مہمان کے حقوق لوگوں کے ذہن نشین کرائے۔ موجودہ نظام تمدن میں گو مہمانی کی خدمت ہوٹلوں اور ریسٹورانوں کے ذریعہ کی جاتی ہے لیکن گزشتہ نظام تمدن میں مہمان کی ایک اہم جگہ تھی خصوصی طور پر اہل عرب میں مہمان کا بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا۔ مہمان کی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ایک معمولی عرب جس کا کل اثاثہ اور کل کائنات ایک اونٹنی ہوتی، وہ اپنے مہمان کی خاطر و مدارات کے لئے اس کو ذبح کرنے کے لئے خوشی اور مسرت محسوس کرتا تاکہ وہ دل کھول کر اپنے مہمان کی مہمانداری کر سکے۔ قبیلہ طے کا سردار حاتم جو دنیا میں اپنی سخاوت اور مہمان داری کی وجہ سے مشہور تھا، عرب ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ ابو بکر بن عیاش کہتے ہیں کہ حاتم سے کسی نے پوچھا: "کیا عرب میں کوئی آپ سے بھی بڑا سخی ہے؟" (**هل في العرب اجود منك؟**) اس نے کہا: "ہر عرب مجھ سے زیادہ سخی ہے۔"

(السیرۃ النبویۃ لابن کثیر: ۱/۱۱۳)

عبداللہ بن جدعان سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے والد ابو قحافہ رضی اللہ عنہ کا چچا زاد بھائی تھا۔ اس کے پاس کھانے کا ایک بہت بڑا برتن ہوتا تھا جو ہر وقت کھانے سے بھرا رہتا تھا۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ ایک شتر سوار اپنے اونٹ پر بیٹھ کر اس میں سے کھانا لے سکتا تھا۔

مہمان نوازی کی ضیافتوں کے بارہ میں ایک عورت فخریہ طور پر اپنے شوہر کی یہ خصوصیت بیان کرتی ہے۔ "اس کے اونٹ ہر وقت اصطبل ہی میں موجود رہتے ہیں۔

صرف تھوڑے سے اونٹ چراگاہوں میں چرنے کے لئے بھیج دیئے جاتے ہیں۔ یہ اونٹ جیسے ہی باجے کی آواز سنتے ہیں تو انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ اب ہم ذبح ہو جائیں گے۔
(بخاری: ۲/۲۸۰)

اسی طرح کبشہ نامی ایک عورت اپنے خاوند کی تعریف میں کہتی ہے۔

﴿زوجي رفيع العماد، طويل النجاد، عظيم الرماد، قريب البيت من النار﴾ (بخاری: ۳/۷۸۰)

"میرے خاوند کے محل کے ستون بہت بلند و بالا ہیں، وہ بہادر، باوجاہت اور تلوار کا دھنی ہے۔ (مہمانوں کی کثرت کی وجہ سے اس کے چولہوں کی) راکھ کے ڈھیر لگے رہتے ہیں، اور قبیلہ کی پنچایت اس کے گھر کے قریب ہی ہے (تاکہ لوگ اس کو آسانی سے مل سکیں)۔"

قرآن حکیم میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا ذکر ہے جو کچھ یوں ہے کہ:
"اے پیغمبر! ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تم تک پہنچی ہے کہ جب یہ لوگ ان کے پاس آئے تو آتے ہی سلام کی۔ ابراہیم نے سلام کا جواب دیا اور دل میں کہا کہ یہ لوگ تو کچھ اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ پھر جلدی سے اپنے گھر جا کر ایک موٹا بچھڑا یعنی اس کا گوشت بھنوا کر مہمانوں کے لئے لائے اور ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے تامل کیا۔ ابراہیم نے پوچھا آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں۔ اس پر بھی انہوں نے کھانے سے انکار کیا، تب ابراہیم ان سے دل ہی میں ڈرے۔ انہوں نے ان کی یہ حالت دیکھ کر کہا کہ آپ کسی طرح کا اندیشہ نہ کریں، اور ان کو ایک ہوشیار فرزند کی خوش خبری بھی دی۔"

(ذاریات: ۲۴، ۲۷)

ان آیات میں مہمان داری کے آداب کے بارہ میں بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں:

1- مہمان اور میزبان میں کلام کی ابتدا سلام سے ہونا چاہئے۔
2- مہمان کے کھانے کا فوراً انتظام کرنا چاہئے۔

3- مہمانوں کے کھانے پینے کا سامان پوشیدہ طور پر ان کی نگاہ سے بچا کر کرنا چاہیے۔
4- مہمانوں کے سامنے عمدہ سے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہیے۔
5- مہمانوں کے کھانے سے خوش اور نہ کھانے سے مغموم ہونا چاہیے۔
6- نہ کھانے کی حالت میں مہمانوں کو عمدہ الفاظ میں عذر کرنا چاہیے۔

صحابہ کرام ؓ نے اسلام کی روشنی میں اپنی طاقت سے بڑھ کر مہمانوں کی مہمان داری کی۔ چنانچہ سیدنا ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اپنی بیویوں کے پاس کہلا بھیجا کہ جو کچھ کھانا ہو وہ بھیج دو۔ سب کے ہاں سے جواب آیا کہ ہمارے پاس پانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ تب رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ سے فرمایا کہ اس شخص کی کون مہمان نوازی کرے گا۔ ایک انصاری نے عرض کیا: ''میں، یا رسول اللہ!'' پھر وہ اسے اپنے گھر لے گئے اور اپنی بیوی سے کہا رسول اللہ ﷺ کے مہمان کی خاطر تواضع کرو۔ اس نے کہا: میرے پاس بچوں کے کھانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ انصاری نے کہا ''بچوں کو سلا دینا۔'' بیوی نے ایسا ہی کیا۔ کھانا تیار کرلیا اور بچوں کو سلا دیا۔ پھر کھڑی ہوئی اور چراغ درست کرنے کے بہانے اسے گل کر دیا، اور دونوں نے مہمان کے سامنے بیٹھ کر یہ ظاہر کیا کہ اس کے ساتھ وہ بھی کھا رہے ہیں۔ اس طرح انہوں نے وہ کھانا مہمان کو کھلا دیا اور خود بھوکے رات گزار دی۔ جب صبح ہوئی اور وہ انصاری رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا:

﴿لقد عجب اللہ من صنیعکما بضیفکما اللیلۃ﴾

''تم دونوں (میاں بیوی) نے رات اپنے مہمان کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ اللہ کو بہت پسند آیا۔''

اس پر یہ آیت اتری ''وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچائے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔'' (مسلم، رقم: ۲۰۵۴، بخاری، رقم: ۴۷۹۸، مختصر تفسیر ابن کثیر: ۳/۴۷۰)

اس انصاری کا نام ابوطلحہ رضی اللہ عنہ تھا۔

رسول اللہ ﷺ پر جب پہلی وحی نازل ہوئی اور آپ گھر تشریف لائے اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے تو سیدہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے جو آپ کی صفات بیان فرمائیں، ان میں ایک یہ تھی "تقری الضیف" آپ مہمان نوازی کرتے ہیں۔ (بخاری، رقم ۱۰، مختصر تفسیر ابن کثیر ۴۵۶/۳)

ایک مسلمان مہمان کی آمد سے خوش ہوتا ہے اور اس کے اعزاز و اکرام کی طرف لپکتا ہے کیونکہ اکرام ضیف ایمان کی علامات میں سے ہے، سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا:

﴿من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه﴾

(بخاری، رقم: ۶۰۱۸، مسلم، رقم: ۴۸)

"جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے مہمان کی تکریم اور اس کی عزت کرے۔"

عزت و احترام مہمان کا اس وجہ سے ہے کہ اس نے میزبان کو مہمان داری جو کہ ایک نیک عمل ہے، کا موقع دیا۔ اس سے اس کا رب خوش ہوگا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، وہ اپنے مہمان کا اکرام اور اس کی عزت کرے اور اس کا انعام دے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا: "یا رسول اللہ! اس کا انعام کیا ہے؟" ایک رات اس کی پر تکلف مہمانی کرے۔ مہمان نوازی تین روز تک ہے اور اس سے زائد صدقہ ہے۔ اس کے لئے جائز نہیں کہ اپنے بھائی کے ہاں اتنا ٹھہرے کہ اسے تنگی میں ڈال رہے۔

(عمدۃ القاری شرح بخاری: ۱۷۲/۲۲، مسلم مع شرح نووی: ۳۰/۱۲، موطا امام مالک: ۹۲۹/۲، ابوداؤد: ۱۲۷/۴، ترمذی: ۳۳۵/۴، ابن ماجہ: ۱۲۱/۲)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: کیا مجھے یہ خبر نہیں ملی کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو اور دن کو روزہ

رکھتے ہو؟ انہوں نے عرض کی! بے شک، فرمایا ایسا نہ کرو۔ نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی، روزہ بھی رکھو اور بے روزہ بھی رہو کیوں کہ تمہارے اوپر تمہارے جسم کا حق ہے، تمہاری آنکھ کا حق ہے، تمہارے مہمانوں کا حق ہے اور تمہاری بیوی کا حق ہے۔ ہر حق دار کو اس کا حق دو۔

(بخاری مع عمدۃ القاری: ۱۷۳/۲۲)

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یارسول اللہ! آپ ہمیں (جہاد و تبلیغ وغیرہ کے لئے) بھیجتے ہیں اور ہم کسی قوم پر جا کر اترتے ہیں۔ جو مہمان نوازی نہیں کرتے، تو آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ پس ہمیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم کسی قوم پر اترو، اور وہ تمہارے لئے وہ حکم دیں جو مہمان کے لئے مناسب ہے تو قبول کرلو، لیکن اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان سے وہ حق لے لو جو ان پر مناسب ہے۔

(عمدۃ القاری: ۱۷۴/۲۲، مسلم: ۳۲۱۲، ابوداؤد، رقم: ۳۷۴۹)

ابی کریمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مہمان کی شب بسری ہر مسلمان کا حق ہے البتہ کوئی مہمان اگر صبح آئے وہ اس پر قرض ہے، چاہے تو ادا کرے اور چاہے تو ترک کرے۔'' (ابوداؤد، رقم: ۳۷۵۰)

بعض لوگ مہمان کے آنے سے تنگ دل ہو جاتے ہیں اور اس پر اپنے دروازے بند کر لیتے ہیں ان لوگوں میں کوئی خیر نہیں ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿لا خیر فیمن لا یضیف﴾ (مسند احمد: ۱۵۵/۴)

''جو شخص مہمان نوازی نہ کرے اس میں کوئی خیر نہیں۔''

مہمان نوازی اسلام کے عمدہ اخلاق میں سے ہے لہٰذا کوئی مسلمان مہمان نوازی میں بخل نہیں کر سکتا خواہ وہ معاشی لحاظ سے کمزور ہی کیوں نہ ہو۔ اسلام نے بتایا کہ دو آدمیوں کا کھانا تین آدمیوں کے لئے کافی ہے لہٰذا اگر کوئی مہمان اچانک آجائے پھر بھی پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿طعام الاثنین کافی الثلاثة وطعام الثلاثة کافی الاربعة﴾

''دو آدمیوں کا کھانا تین آدمیوں کے لئے کافی ہے اور تین آدمیوں کا کھانا چار آدمیوں کیلئے کافی ہے۔''

(بخاری، رقم: ۵۳۹۲، مسلم، رقم: ۲۰۵۸، باب فضیلۃ المواساۃ)

آج مغرب میں کھانا تو بہت بڑی بات ہے اگر چائے پیتے ہوئے کوئی مہمان آجائے تو اس کو چائے تک نہیں پوچھی جاتی، لیکن ایک مسلمان اگر زیادہ مہمان بھی آجائیں تو وہ پریشان نہیں ہوتا جیسا کہ مغرب کا انسان پریشان ہوتا ہے۔ مسلمان ہر مہمان کو اپنے کھانے میں شریک کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کھانے میں برکت بھی عطا فرما دیتے ہیں۔ ایک آدمی کا کھانا دو تین آدمیوں کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ اگر نہ بھی کافی ہو تو وہ خود بھوکا رہ جائے گا لیکن مہمان کو ضرور کھلائے گا۔

اسلام میں مہمان بھی اپنے میزبان کے حالات کا خیال رکھتا ہے اور وہ زیادہ دن اس کے گھر میں پڑا نہیں رہتا کہ اس کے رہنے سے میزبان کو پریشانی اور دشواری لاحق ہو، یہاں تک کہ بعض اوقات معاملہ تنگی، دل برداشتگی اور نفرت و کراہت تک پہنچ جاتا ہے، بلکہ وہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے یہ جانتا ہے کہ آپ نے ایسا کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے اور اسے اسلام کی روح کے منافی فرمایا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کسی مسلمانوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کا مہمان اتنا ٹھہرے کہ اسے گنہ گار کر دے۔'' صحابہ کرام ؓ نے دریافت کیا: ''یا رسول اللہ! وہ اسے گنہ گار کیسے کر دے گا؟'' فرمایا: ''اس کے یہاں ٹھہرے گا اور اس کی مہمان داری کے لئے میزبان کے پاس کچھ نہیں رہے گا۔''

(مسلم، رقم: ۱۷۲۷، باب الضیافۃ)

اور بخاری کی حدیث میں ہے کہ

﴿ولا یحل له ان یثوی عنده حتی یحرجه﴾

(بخاری، رقم: ۶۱۳۵، باب اکرام الضیف)

''کسی مہمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کے ہاں اتنا

ٹھہرے کہ اسے تنگی میں ڈال دے۔''

بہر حال حقیقی مسلمان اپنے میزبان کو بے جا تکلیف میں مبتلا نہیں کرتا۔ مسلمان مہمان سلیقہ مند ہوتا ہے، وہ اسلام کے آداب ضیافت سے آشنا ہوتا ہے، اور ان آداب پر وہ دل و جان سے عمل بھی کرتا ہے۔ وہ میزبان کی ہر بات مانتا ہے اور جن خواہشات کا میزبان اظہار کرتا ہے ان کو نہایت خوش اسلوبی سے بجا لاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مہمان کو ایک ادب یہ بھی سکھایا۔

''جو شخص کسی جگہ مہمان بن کر جائے تو گھر والوں کی اجازت کے بغیر روزہ نہ رکھے، اور جب گھر میں داخل ہو تو جہاں وہ لوگ کہیں وہیں بیٹھے کیوں کہ گھر والے اپنے گھر کی قابل پردہ جگہوں سے زیادہ آشنا ہوتے ہیں۔''

(المعجم الاوسط للطبرانی ۷/۱۵۵۱ معجم صغیر، رقم: ۹۲۶)

اسلام نے جہاں میزبان کو مہمان کی تکریم کی تاکید کی وہاں مہمان کو بھی کہا کہ کسی کے ہاں بے وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے منافی ہے۔ کسی دوسرے کے خوان کرم سے زیادہ فائدہ نہ اٹھایا جائے کیوں کہ مہمانی تو صرف تین روز تک ہے، تین دن سے زیادہ کی مہمانی صدقہ ہے جس کو خود کوئی غیور اور خود دار مہمان پسند نہیں کرے گا۔

مہمان نوازی سے مقصود فخر و مباہات اور اپنی شہرت و ناموری نہ ہو بلکہ اس سے مقصود رسول اللہ ﷺ اور ماقبل کے انبیاء علیہم السلام کی سنت کا اتباع ہو، اور یہ نیت ہو کہ ایک مومن جب میرے دستر خوان سے کھانا کھائے گا تو وہ خوش ہوگا اور مومن کی خوشی اللہ کی خوشنودی کا باعث ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے مہمان کے لئے تکلف کرنے سے منع فرمایا ہے، جو کچھ پکائے وہ مہمان کی محبت میں نہایت خوش دلی سے پکائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''مہمان کے لئے تکلیف نہ کرو ورنہ تم اس سے بغض رکھنے لگو گے، اور جس نے مہمان سے بغض رکھا اس نے اللہ سے بغض رکھا، اور جس نے اللہ سے بغض رکھا، اللہ بھی اس سے بغض رکھے گا۔''

(احیاء العلوم للغزالی: ۱۲/۲، ورواہ البیہقی فی شعب الایمان ۷/۹۳)

امام جزری نے لکھا ہے کہ ایک دن رات تک مہمان نوازی میں تکلف ہونا چاہئے، اس کے بعد تکلف نہیں، جو کچھ گھر میں پکا ہوا ہو وہی مہمان کے سامنے رکھا جائے۔

مہمان کا اکرام یہ بھی ہے کہ اس کو کھانا جلدی دیا جائے کیوں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ حاتم الاصمؒ فرماتے ہیں: ''عجلت اگرچہ شیطان کی طرف سے ہے لیکن پانچ چیزوں میں عجلت رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے، ان میں سے ایک ''اطعام الضیف'' مہمان کو کھانا کھلانا ہے۔ (ذکرہ ابونعیم فی حلیۃ الاولیاء: ۸/۷۸)

جب تک دسترخوان پر بیٹھے ہوئے سب کھانے والے کھانے سے ہاتھ نہ اٹھالیں، بچا ہوا کھانا دسترخوان سے نہیں اٹھانا چاہئے کیوں کہ اس سے مہمان اپنی خفت محسوس کرتا ہے۔

جب مہمان جانا چاہے تو میزبان یا صاحب خانہ اس کو رخصت کرنے کے لئے اس کے ساتھ گھر کے دروازہ تک جائے کیوں کہ اس سے مہمان کی عزت افزائی ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں بھی ہے:

﴿ان من السنة ان یخرج الرجل مع ضیفه الیٰ باب الدار﴾

''آدمی مہمان کے ساتھ گھر کے دروازے تک جائے یہی سنت ہے۔'' (ابن ماجہ، رقم: ۳۳۵۸، تحقیق شعیب ارنؤوط: ۷/۱۰۴)

اگر کوئی شخص کسی کی مہمان نوازی نہ کرے تو جب مہمان نوازی نہ کرنے والا شخص اس مہمان کے گھر جائے تو اسے اس کی مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں رکھنا چاہئے۔ ایک صحابی فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ اگر میں کسی شخص کے پاس جاؤں اور وہ میری مہمان نوازی نہ کرے۔ پھر اگر وہ میرے پاس آئے تو میں اس کی مہمان نوازی کروں؟ یا اس سے بدلہ لوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا ''بل اقرہ'' نہیں بلکہ تم اس کی مہمان داری کرو۔ (ترمذی)

فقراء اور مساکین کے حقوق

دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں، اہل ثروت اور فقراء و مساکین، لیکن کبھی کبھی اہل ثروت کو بھی دوسروں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے اور ان کو دوسروں سے مالی مدد لینی پڑتی ہے۔ لہٰذا دولت والوں کا یہ فرض ہے کہ وہ فقراء اور مساکین اور سائلین کی ہر طرح مدد کریں۔ قرآن حکیم میں دو جگہوں پر فرمایا گیا:

﴿فی اموالھم حق للسائل و المحروم﴾ (زاریات:۱۹)

''ان کے مالوں میں حصہ تھا مانگنے والوں کا اور ہارے ہوؤں کا۔''

﴿فی اموالکم حق معلوم، للسائل و المحروم﴾

(معارج:)

''اور جن کے مالوں میں حصہ مقرر ہے مانگنے والوں اور ہارے ہوؤں کا۔''

سائل کا لفظی مطلب تو مانگنے والا، اور سوال کرنے والا ہے، لیکن سائل کے معنی صرف بھیک مانگنے کے لئے لینا درست نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد ہر وہ ضرورت مند ہو سکتا ہے جو تم سے مالی مدد کا خواہاں ہو اور محروم سے مراد وہ مصیبت زدہ ہے جس کی کمائی یا کھیتی پر کوئی آسمانی افتاد پڑ گئی ہو اور اب وہ دوسروں کی مدد کا محتاج ہو گیا ہو۔

قرآن حکیم نے ہر طریقے سے مسلمانوں میں انفاق فی سبیل اللہ کی گرم جوشی پیدا کی۔ پہلے تو اس نے مسلمانوں کو یہ باور کرایا کہ یہ مال جو تم محنت اور جدوجہد سے کماتے ہو، یہ تمہاری ملکیت نہیں بلکہ اس کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے تم اس مال کے امین

اور مسکین ہو، لہٰذا معاشرہ کے وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے کسی وجہ سے دولت کی نعمت سے محروم رکھا ہے، ان کا تمہارے مالوں میں حق رکھا گیا ہے۔ یہی اوپر کی دو آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا جس طرح نماز کا ادا کرنا تمہارے ذمہ ضروری ہے، اسی طرح ان لوگوں کا مالی حق بھی تمہارے ذمہ ضروری اور لازمی ہے۔ یہ بات مسلمانوں کے ذہنوں میں اس قدر راسخ ہو گئی تھی کہ اب ان کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا بالکل گراں نہیں معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ جب سورۃ الحدید کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿من ذا الذی یقرض اللّٰہ قرضاً حسناً فیضٰعفہ لہ ولہ اجر کریم﴾ (حدید ۱۱)

''کون ہے ایسا کہ قرض دے اللہ کو اچھی طرح، پھر وہ اس کو دونا کر دے اس کے واسطے اور اس کو ملے ثواب عزت کا۔''

تو اس پر سیدنا ابوالدحداح نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! کیا اللہ ہم سے قرض چاہتا ہے؟'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، ابوالدحداح''۔ انہوں نے کہا: ''ذرا اپنا ہاتھ مجھے دکھائیے۔'' آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ میں آپ کا ہاتھ لے کر کہا: ''میں نے اپنے رب کو اپنا باغ قرض دے دیا۔'' سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس باغ میں چھ سو درخت تھے۔ اسی میں ان کا گھر تھا اور بیوی اور ان کے بچے رہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ سے یہ بات کر کے وہ سیدھے گھر پہنچے اور باہر سے بیوی کو پکار کر کہا: ''دحداح کی ماں! باہر نکل آؤ، میں نے یہ باغ اپنے رب کو قرض دے دیا ہے۔'' وہ بولیں: ''دحداح کے ابا! تم نے نفع کا سودا کیا۔'' اور اسی وقت اپنا سامان اور بچے لے کر باغ سے نکل گئیں۔'' (الاصابہ، ج ۲: ۵۸)

زکوٰۃ کے مصارف اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں خود مقرر فرمائے۔ (توبہ: ۶۰)

ان میں پہلے دو مصرف فقراء اور مساکین کے ہیں۔ فقیر سے مراد وہ شخص ہے جو اپنی ضروریات زندگی میں دوسروں کی مدد کا محتاج ہو، خواہ جسمانی نقصان یا بڑھاپے کی وجہ سے، یہ محتاجی مستقل ہو یا عارضی طور پر ہو، کوئی وقتی مدد کا محتاج ہو اور سہارا ملنے پر خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہو، جیسے یتیم بچے، بے سہارا بیوائیں اور بے روزگار لوگ مستحق زکوٰۃ

ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ غنی اور مالی دار پر زکوٰۃ صرف کرنا جائز نہیں ہے مگر یہ کہ وہ غنی زکوٰۃ وصول کرنے پر عامل مقرر ہو۔

مسکین کے معنی چونکہ عاجزی، درماندگی اور بے چارگی کے ہیں اس لئے مسکین ایسے شخص کو کہیں گے جو حاجت مندوں سے زیادہ درماندہ ہو، مسکین فقیر سے زیادہ ابتر ہوتا ہے۔ حدیث کی رو سے ایسے لوگ خصوصیت سے مستحق اعانت ہوتے ہیں۔ جو انتہائی ضرورت مند اور مفلوک الحال ہونے کے باوجود کسی کے سامنے زبان نہیں کھولتے۔ انہیں مر جانا گوارا ہے لیکن کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنا گوارا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مسکین وہ ہے جو ضروری مال سے بھی محروم ہو اور پہچان میں نہ آئے اور نہ ہی وہ لوگوں سے کھڑے ہو کر مانگتا ہے۔"

بعض حضرات نے فقیر اور مسکین کو ایک ہی جنس قرار دیا ہے لیکن یہ دونوں علیحدہ علیحدہ جنسیں ہیں۔ البتہ مسکین اور فقیر کے معنوں میں اور اس بات میں کہ ان دونوں میں سے کون زیادہ حاجت مند اور زیادہ بدحال ہے؟ اس میں اہل لغت اور اہل تفسیر میں اختلاف ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ فقیر وہ ہے جس کے پاس کھانے پینے کے لئے کچھ ہو، اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ اس کو مسکین اس لئے کہا جاتا ہے کہ حاجت مندی نے اسے حرکت کرنے اور چلنے پھرنے سے بھی ساکن کر دیا ہو، چنانچہ وہ اپنے ٹھکانے سے ملنے جلنے کی طاقت نہیں پاتا کیوں کہ مسکین کا مادہ سکون ہے۔ یہ راجح ترین ہے۔

اصل یہ ہے کہ فقیر اور مسکین میں سے ہر ایک کے نام میں احتیاج کا مفہوم پایا جاتا ہے لیکن مسکین کی احتیاج زیادہ شدید ہوتی ہے۔ جس نے یہ کہا کہ "فقیر وہ ہے جو مانگتا نہیں اور مسکین وہ ہے جو مانگتا ہے۔" اس نے اس حقیقت کے مطابق کہا کیوں کہ ایک مسلمان کی فقیری کی شان یہ ہے کہ جب تک پیٹ بھرنے کے لئے اس کے پاس کوئی سبب اور چارہ ہے، وہ برداشت کرتا رہتا ہے اور اپنا دامن سوال کے دھبے سے پاک رکھتا ہے اور مانگنے کے لئے باہر نہیں نکلتا، تو جب کوئی شخص مانگتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے

کہ وہ شدید تنگ دستی اور بدحالی میں مبتلا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿ليس المسكين الذى لامال له، ولكن المسكين الذى لا مكسب له﴾

''یعنی مسکین صرف وہ نہیں جس کے پاس مال نہیں بلکہ مسکین وہ بھی ہے جس کے پاس کمائی کا کوئی ذریعہ نہیں۔''

مطلب یہ ہے کہ جس کے پاس مال نہیں ہے وہ اگرچہ مسکین ہے لیکن جس شخص کے پاس مال بھی نہیں اور کمائی کا کوئی ذریعہ بھی نہیں، اس کی مسکنت پہلے سے شدید تر ہے۔ اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ جس کے پاس مال نہیں اور وہ کمائی کا کوئی ذریعہ رکھتا ہے تو وہ فقیر ہے اور جس کے پاس نہ تو مال ہے اور نہ ہی کوئی ذریعہ کسب، تو وہ مسکین ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے مسکین کے بارہ میں فرمایا:

''مسکین وہ نہیں ہے جو لوگوں کے گھروں کے چکر لگائے اور لقمہ دو لقمہ اور کھجور دو کھجوریں اسے واپس لوٹا دیں، بلکہ مسکین تو وہ ہے جو اتنی دولت بھی نہ پائے جو اسے لوگوں سے بے نیاز کر دے۔ اس کی غربت کی بابت احساس بھی نہ کیا جائے کہ اس پر صدقہ کیا جائے اور نہ وہ خود دست سوال دراز کیے کھڑا ہو کہ لوگوں سے مانگے۔'' (بخاری: ۳/۲۹۹، ۴۸۰، ۸/۱۵۲، مسلم، رقم: ۱۰۳۹)

اسلام نے سب سے پہلے تو ایک مومن کو بخل سے منع کیا اور اس کو بتایا کہ تیرے پاس جو مال ہے اس کو تو نے جمع نہیں کرنا بلکہ اس کو فقراء اور مساکین میں تقسیم کرنا ہے۔ اس نظریہ کو کئی مثالوں سے ذہنوں میں اتارنے کی کوشش کی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت فرمایا: ''تم میں سے کسی شخص کو اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کا مال پسند ہے؟'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! ہم میں سے ہر شخص کو صرف اپنا مال محبوب ہوتا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی کا اپنا مال وہ ہے جو اس نے آگے بھیج دیا اور وارث کا مال وہ ہے جو اس نے پیچھے چھوڑ دیا۔''

(بخاری، کتاب الرقاق، رقم: ۶۴۴۲)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اسلام لانے کے بعد جس کسی نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ مانگا آپ ﷺ نے اسے ضرور دیا۔ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اسے بکریوں کا اتنا بڑا ریوڑ دے دیا جو پہاڑوں کے درمیان آئے۔ وہ اپنی قوم میں واپس آیا تو کہنے لگا: "اے لوگو! اسلام لے آؤ، محمد (ﷺ) تو اس شخص کی طرح دیتے ہیں جسے فقر و فاقہ کا کچھ خوف نہیں۔ بعض لوگ محض دنیا کے لئے اسلام قبول کرتے تھے مگر جلد ہی اسلام ان کے نزدیک دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہو جاتا ہے۔" (مسلم، باب فی سخاء ﷺ، رقم: ۲۳۱۲)

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ بقیع کی طرف جا رہے تھے۔ سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ آپ ﷺ سے جا ملے۔ راستہ میں چلتے ہوئے آپ نے ان سے فرمایا:

﴿ان المکثرین هم المقلون یوم القیامة الا من قال هکذا و هکذا فی حق﴾

"یعنی دنیا میں مال و دولت جمع کرنے والے قیامت کے روز تہی دست اور تہی دامن ہوں گے سوائے ان لوگوں کے جو پوری فیاضی سے مناسب جگہوں پر خرچ کریں۔"

پھر احد پہاڑ دکھائی دیا تو نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ابوذر! سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "یا رسول اللہ! ﷺ لبیک و سعدیک، میں آپ ﷺ پر قربان جاؤں۔ (آپ ﷺ کیا فرماتے ہیں؟) آپ نے فرمایا:

﴿ما یسر نی ان احداً لآل محمد ذهباً فیمسی عندهم دینار أو قال مثقال﴾

"مجھے یہ چیز پسند نہیں ہے کہ آل محمد کے پاس احد کے مثل سونا ہو اور شام ہوتے ہوتے ان کے پاس ایک دینار بھی بچ جائے۔ یا فرمایا ایک مثقال بچ جائے۔" (مسلم، رقم: ۹۴، مسند احمد: ۲/۵۲۵)

پھر رسول اللہ ﷺ نے صدقہ کو ہر مسلمان کے لئے لازم قرار دیا۔ ایک حدیث میں فرمایا: "ہر مسلمان پر صدقہ لازم ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: "یا رسول

اللہ! جس شخص کے پاس صدقہ کرنے کو کچھ نہ ہو وہ کیا کرے؟" فرمایا: "اپنے ہاتھ سے کمائے، خود بھی فائدہ اٹھائے اور صدقہ بھی کرے۔" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پھر عرض کیا: "اگر اس کی بھی طاقت اور استطاعت نہ ہو؟" فرمایا: "حاجت مند اور مصیبت زدہ اشخاص کی مدد کرے۔" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پھر عرض کیا: "اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو" فرمایا: "نیکی کرے اور برائی سے رکا رہے۔ یہ بھی صدقہ ہے۔"

(بخاری، باب کل معروف صدقۃ، رقم:۶۰۲۲)

اسلام نے یہ نہیں کہا کہ سب مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دو بلکہ فرمایا کہ ضرورت سے زائد مال خرچ کرو اور بقدر رزق اور روزی روک لینے والوں کو ملامت نہیں کی بلکہ ان کے لئے یہ چیز بہتر قرار دی کہ وہ اپنی ضرورتیں بذات خود پوری کریں۔ چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

"اے ابن آدم! اگر تو اپنا زائد مال خرچ کرے گا تو یہ تیرے حق میں بہتر ہے۔ اگر تو اسے بچا بچا کر رکھے گا تو یہ تیرے لئے برا ہے۔ بقدر ضرورت روکنے میں کوئی ملامت نہیں۔ خرچ کی ابتداء اس سے کرو جس کی کفالت کرتے ہو۔ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔"

(مسلم، باب أن الید العلیا..... رقم:۱۰۳۶)

ایک اور حدیث میں مال کو صدقہ کرنے کی ترغیب دی اور اس شبہ کا ازالہ فرمایا کہ صدقہ دینے سے مال کم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿مانقص مال عبد من صدقة﴾ (مسلم، رقم:۲۵۸۸)

"کسی بندے کا مال صدقہ دینے سے کم نہیں ہوتا۔"

مساکین و فقراء سے محبت کرنے کی تلقین کی اور بغض رکھنے سے منع فرمایا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ ایک دعا فرمایا کرتے تھے۔

﴿اللّٰهم انی اسئلک فعل الخيرات، و ترک المنكرات، و حب المساكين﴾

"اے اللہ! میں تجھ سے نیکیوں کے کرنے کا سوال کرتا ہوں، اور

برائیوں کے چھوڑنے کا، اور مسکینوں کی محبت کا۔"

ایک اور دعا میں رسول اللہ ﷺ یوں فرماتے تھے۔

﴿اللھم احینی مسکیناً و توفنی مسکیناً، و احشرنی فی زمرۃ المساکین﴾

"اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ اور مسکینی میں وفات دے اور (قیامت کے روز) مساکین کے گروہ میں سے اٹھانا۔"

(رواہ الحاکم فی المستدرک، رقم: ۷۹۷۴ وقال حدیث صحیح الاسناد ووافقہ الذہبی)

اللہ تعالیٰ بیوہ اور مسکین کی خبر گیری کرنے والے کو ثواب عظیم عطا فرمائے گا حتیٰ کہ اس کا ثواب روزہ رکھنے والے، نمازیں پڑھنے والے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے والے کے اجر سے بھی بڑھ جاتا ہے، جیسا کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"بیوہ اور مسکین کی خبر گیری کرنے والا اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے۔ (راوی حدیث سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ) میرا خیال ہے کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: "اور مسلسل نمازیں پڑھنے والے اور مسلسل روزے رکھنے والے کی طرح۔ (مسلم، باب فضل الاحسان، رقم: ۲۹۸۲، بخاری، رقم: ۵۳۵۳)

فقراء اور مساکین پر خرچ کرنا بہت بڑا نیک کام ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا تقریب حاصل ہوتا ہے نہ کہ ان دعوتوں سے جو مال دار اور ذی وجاہت لوگوں کو دی جاتی ہیں جن پر بے تحاشا دولت خرچ کی جاتی ہے۔ جس کا مقصود صرف نام آوری، شہرت اور وقتی فائدہ ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے دنیا میں نام ہو جائے، حکام اور مال دار لوگ ہماری تعریف کریں لیکن اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ہاں ایسی دعوتیں قابل مذمت ہیں کیوں کہ اس سے دنیا کی خوشنودی مقصود ہوتی ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿شر الطعام طعام الولیمہ، یدعیٰ الیھا الاغنیاء و یترک الفقراء﴾

''بدترین کھانا اس ولیمہ کا ہے جس میں امیروں کو تو بلایا جائے اور غریبوں کو چھوڑ دیا جائے۔''

(بخاری، رقم: ۵۱۷۷ باب من ترک الدعوۃ، مسلم، رقم: ۱۴۳۲، ابوداؤد، رقم: ۳۷۴۲)

بیوہ و مسکین کی خبر گیری کرنے، یتیم کی کفالت کرنے اور اس کے ساتھ فضل اور احسان کا برتاؤ کرنے سے ثواب عظیم حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ خرچ کرنے والے کے نفس کا تزکیہ بھی ہوتا ہے، اس کے دل میں رقت پیدا ہوتی ہے۔ انسانیت پروان چڑھتی ہے اور وہ بخشش و عطا کی حلاوت محسوس کرتا ہے۔ شفقت و محبت کے احساس سے لذت حاصل کرتا ہے۔ سیدنا ابوہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم کی بارگاہ میں ایک شخص نے اپنی سنگ دلی کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿امسح راس الیتیم واطعم المسکین﴾

''یتیم کے سر پر ہاتھ پھیر اور مسکین کو کھانا کھلا۔''

یہ مساکین و فقراء معاشرہ کا کمزور ترین حصہ سمجھا جاتا ہے، ان کی حدیث میں بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ سے فرمایا کہ ''کیا میں تمہیں جنتیوں کی خبر نہ دوں؟'' (پھر آپ ﷺ نے خود ہی فرمایا) ہر کمزور، جو کمزور سمجھا جاتا ہے، اگر وہ اللہ پر قسم کھالے تو اللہ اس کی قسم پوری کر دیتا ہے۔''

(رواہ البخاری: ۸/۵۰۸، ۱۰/۴۰۸، مسلم، رقم: ۲۸۵۳)

سیدنا ابوسعید خدری ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جنت اور جہنم میں جھگڑا ہوا۔ جہنم نے کہا کہ میرے اندر سرکش اور متکبر انسان ہوں گے۔ اور جنت نے کہا:

﴿فی ضعفاء الناس و مساکینھم﴾

''میرے اندر کمزور اور مساکین ہوں گے۔''

(مسلم، رقم: ۲۸۴۷، مسند احمد: ۳/۷۹)

ایک حدیث میں سیدنا ابوہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿رب اشعث اغبر مدفوع الابواب لو اقسم علی اللّٰہ لابرہ﴾
(مسلم، رقم: ۲۶۲۲)

''بہت سے پراگندہ، اور غبار آلود اشخاص جنہیں دروازوں سے دھتکار دیا جاتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ پر قسم کھالیں تو اللہ ان کی قسم پوری فرمادیتا ہے۔''

سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:
''میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا تو (میں نے دیکھا کہ) اس میں داخل ہونے والے اکثر مسکین لوگ ہیں، اور دولت منداور مال دار لوگ روکے ہوئے ہیں، البتہ اہل جہنم کو جہنم میں لے جانے کا حکم دیا گیا ہے اور میں جہنم کے دروازے پر کھڑا ہوا تو (دیکھا) ان میں داخل ہونے والی اکثر عورتیں ہیں۔ (بخاری: ۱۱/ ۳۶۱، مسلم، رقم: ۲۷۸۶)

یہ فقراء اور مساکین جن کو ہم اپنے دروازہ سے دھتکارتے رہتے ہیں۔ اصل میں انہی کی وجہ سے ہمیں رزق ملتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دو بھائی تھے۔ ایک تو کوئی کام کرتا تھا اور دوسرا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتا۔ ایک روز اس کام کرنے والے نے حضور ﷺ کی خدمت میں رہنے والے بھائی کی آپ ﷺ سے شکایت کی کہ یہ کام کاج کوئی نہیں کرتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿لعلک ترزق بہ﴾ (ترمذی: ۲۳۴۵ وقال حسن صحیح)

''شاید اسی کی وجہ سے تو رزق دیا جاتا ہے۔''

اس سلسلہ میں سیدنا مصعب بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کو ایک مرتبہ یہ خیال ہوا کہ انہیں اپنے سے کم تر لوگوں پر فضیلت حاصل ہے، نبی ﷺ نے فرمایا:

﴿هل تنصرون و ترزقون الا بضعفائكم﴾

''تم لوگ تو انہی کمزوروں کی وجہ سے مدد کیے اور رزق دیے جاتے ہو (پھر ان سے برتر ہونے کے زعم کا کیا جواز ہے؟''

(رواہ البخاری: ۶/ ۹۵، مسند احمد: ۱/ ۱۷۳)

سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔

﴿ابغونی فی الضعفاء، فانما تنصرون و ترزقون بضعفائکم﴾

"مجھے کمزوروں میں تلاش کرو، یقیناً تمہاری اپنے ان ضعفاء اور کمزوروں کی وجہ سے ہی مدد کی جاتی ہے اور تمہیں روزی دی جاتی ہے۔"

(رواہ ابوداؤد، رقم: ۲۵۹۴، واخرجہ احمد: ۵/۱۹۸، النسائی: ۶/۴۵، ترمذی: ۱۷۰۲، واسنادہ حسن، وصححہ ابن حبان، رقم: ۱۲۰، والحاکم: ۲/۱۰۶، ۱۴۵، ووافقہ الذہبی)

اس کی وجہ علماء نے یہ بیان کی ہے کہ کمزور، ضعیف، مساکین، فقراء اور غرباء کے دل زخارف دنیا (دنیا کی خوبصورتی اور جاذبیت) سے پاک و صاف ہوتے ہیں، اس لئے ان میں اخلاص اور انابت الی اللہ کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے ان کی دعائیں بھی بارگاہ الٰہی میں مقبول ہوتی ہیں۔

اس کو نسائی کی ایک دوسری حدیث میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے:

"اللہ تعالیٰ اس امت کی مدد فرماتا ہے اس امت کے کمزور لوگوں کی دعا، نماز اور ان کے اخلاص کی وجہ سے۔"

(النسائی: ۶/۴۵، عون المعبود جلد ۲ باب فی الانتصار برذل الخیل والضعفۃ)

بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کوئی سائل یا حاجت مند آتا تو آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرماتے کہ "تم سفارش کرو تو تمہیں بھی اجر و ثواب ملے گا۔"

(بخاری، کتاب الادب، باب تعاون المومنین و باب قول اللہ من یشفع شفاعۃ حسنۃ، رقم: ۱۴۳۲، مسلم، رقم: ۲۶۲۷)

سونے والے کے حقوق

شریعت میں سونے والے انسان کے بھی حقوق بیان کئے گئے ہیں۔ جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین آدمیوں سے قلم اٹھالیا گیا ہے یعنی تین آدمیوں کو غیر مکلف ٹھہرایا گیا ہے، پہلا وہ مجنون جس کی عقل مغلوب ہو، دوسرا سونے والا یہاں تک کہ وہ بیدار ہو، اور تیسرا بچہ حتیٰ کہ وہ بالغ ہو جائے۔

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿من نسی صلاۃ او نام عنها فکفارتها ان یصلیها اذا ذکرها﴾

(بخاری: ۲/ ۵۹۷، مسلم، رقم: ۶۸۴)

"جو شخص نماز پڑھنا بھول جائے یا وہ سو جائے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب اسے یاد آئے اس وقت وہ نماز پڑھ لے۔"

اسلام نے اپنی رحمت سے سونے والے پر کئی امور کو اٹھالیا ہے جن میں ایک نماز بھی ہے۔ چنانچہ جنگ خیبر سے فارغ ہو کر رسول اللہ ﷺ واپس مدینہ طیبہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مدینہ منورہ کے قریب پہنچ کر آپ نے آخر شب میں آرام کی خاطر ایک وادی میں پڑاؤ ڈالا اور سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو یہ تاکید کر کے تمام لشکر سو رہا کہ ہمیں صبح صادق ہوتے ہی نماز کے لئے بیدار کر دینا۔ اتفاق سے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ بھی اونٹ کے ایک کجاوے سے ٹیک لگا کر سو گئے یہاں تک کہ سورج نکل آیا۔ سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ گھبرا کر اٹھے۔ پھر آپ نے لوگوں کو جگایا۔ آپ نے بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا: یہ کیا ہوا؟ یا رسول اللہ! میرے

ماں باپ آپ پر قربان، میری بھی ایسے ہی آنکھ لگ گئی جیسے آپ کی لگ گئی۔ آپ نے اس وادی سے کوچ کرنے کا حکم فرمایا۔ اس وادی سے نکل کر آپ نے آگے نزول فرمایا اور سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کا حکم دیا۔ وضو کر کے پہلے صبح کی دو سنتیں پڑھیں، پھر بلال رضی اللہ عنہ کو اقامت کے لئے فرمایا اور جماعت کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی گئی۔ نماز کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿من نسی الصلاۃ فلیصلها اذا ذکرها﴾

"جو شخص نماز پڑھنا بھول جائے اس کو جب یاد آئے اس وقت پڑھ لے۔"

کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، "اقم الصلوۃ لذکری"

(رواہ مسلم، رقم: ۶۸۰، کتاب المساجد، زاد المعاد ابن قیم: ۲/۱۲۷، ابن ہشام: ۲/۳۴۰)

سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک عورت آئی جب کہ ہم آپ ﷺ کے پاس تھے۔ اس نے کہا: "یا رسول اللہ! ﷺ میرا خاوند صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ مجھے نماز پڑھوں تو پیٹتا ہے اور روزہ رکھوں تو کھلوا دیتا ہے، اور نماز فجر اس وقت پڑھتا ہے جب سورج طلوع ہو جائے۔" سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ بھی وہیں موجود تھے۔ ابو سعید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے عورت کی شکایت کے بارہ میں اس سے پوچھا۔ اس نے کہا: "یا رسول اللہ! اس کا یہ کہنا کہ جب نماز پڑھوں تو مجھے مارتا ہے، سو یہ اس لئے ہے کہ یہ دو سورتیں پڑھتی ہے، اور میں نے اسے اس سے روکا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایک سورت ہو تو لوگوں کے لئے کافی ہے۔ اور رہی اس کی یہ بات کہ وہ میرا روزہ کھلوا دیتا ہے، تو یہ برابر روزے رکھے چلی جاتی ہے اور میں ایک نوجوان آدمی ہوں صبر نہیں کر سکتا۔ پس اس روز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی عورت اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر روزہ (نفلی) نہ رکھے۔ اور یہ جو اس کی بات ہے کہ میں سورج چڑھے نماز پڑھتا ہوں، تو ہم ایک ایسے گھر کے لوگ ہیں کہ ہم میں یہ بات معروف ہے کہ ہم سورج ہونے سے پہلے بیدار ہو ہی نہیں سکتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پس جب تو

بیدار ہو تو نماز پڑھ لیا کر۔“

(ابوداؤد: ۲/۳۳۰، واخرجہ الحاکم فی المستدرک: ۱/۳۳۶ وقال ھذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین ووافقہ الذہبی)

اگر کوئی شخص سویا ہوا ہو تو اس کو خواہ مخواہ نہیں جگانا چاہئے، البتہ کوئی مشروع یا ضروری کام ہو تو جگانے کی اجازت ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تشریف لاتے تو اتنی اونچی آواز سے سلام کہتے کہ جو کسی سونے والے کو نہ جگاتی اور جاگتا ہوا آپ کی آواز (سلام) کو سن لیتا۔ (مسلم، رقم: ۲۰۵۵)

کسی سوئے آدمی کو ڈرانے کی بھی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿لا یحل لمسلم ان یروع مسلماً﴾

(ابوداؤد، رقم: ۵۰۰۴، جامع الاصول: ۱۱/۸۵)

کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی مسلمان کو ڈرائے۔“

لیکن ایک مسلمان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے سونے کا ایک ضابطہ بنائے تا کہ اس کی نمازوں کے اوقات میں کوئی خلل نہ آئے اور وہ وقت پر نماز ادا کر سکے۔ رسول اللہ ﷺ اسی طرح کرتے تھے۔ اور آپ نے نماز عشاء سے پہلے سونے کو ناپسند فرمایا۔ کیوں کہ اس سے نماز عشا جانے کا اندیشہ ہوتا۔

(رواہ الترمذی، رقم: ۱۵۸ عن ابی برزہ ؓ وقال حدیث حسن صحیح)

عشاء کی نماز پڑھ کر سو جانا انسان کے لئے روحانی طور پر بہت مفید ہے۔ اس سے ایک تو نماز تہجد کے لئے انسان کو قوت حاصل ہو جاتی ہے، اور اگر پھر بھی نماز فجر کے بعد اس کو کچھ نیند کی حاجت ہو تو وہ قیلولہ میں پوری ہو جاتی ہے اور اس سے انسان وقت پر طلب معاش کے لئے بھی جا سکتا ہے۔

بیمار کے حقوق

دنیا کا ایک کمزور طبقہ ہماری ہمدردیوں کا نہایت مستحق ہے اگرچہ وہ دولت مند ہی کیوں نہ ہو، لیکن دولت ہونے کے باوجود وہ بیماری کی وجہ سے کمزور ہو گیا ہوتا ہے۔ اس طبقہ کی عیادت اور خبر گیری کرنا بھی اس کا ایک حق ہے اور شریعت نے ہمارے ذمہ یہ ضروری قرار دیا ہے کہ اس کی خدمت، خبر گیری، دیکھ بھال، تیمارداری اور عیادت کریں۔

1- اس کا پہلا حق تو یہ ہے کہ اس کا علاج کروایا جائے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿تداووا عباد الله! فان الله تعالیٰ لم یضع داء الا وضع له دواء، غیر داء واحد: الهرم﴾ (الجامع الصغیر، رقم: ۲۹۲۷)

''اے اللہ کے بندو! علاج کرایا کرو کیونکہ اللہ نے کوئی بیماری پیدا نہیں کی مگر اس کے ساتھ اس کی دوا بھی پیدا فرما دی سوائے ایک بیماری کے اور وہ بڑھاپا ہے۔''

2- حرام چیزوں سے علاج نہیں کرانا چاہئے نہ کرنا چاہئے کیوں کہ حرام چیزوں سے علاج کروانے سے شریعت نے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿ان الله خلق الداء والدواء، فتداووا، ولا تداووا بالحرام﴾

''اللہ تعالیٰ نے دوا بھی پیدا کی اور بیماری بھی۔ پس دوا کیا کرو لیکن حرام چیزوں سے علاج نہ کیا کرو۔''

3- بیماری میں بھی نماز کا اہتمام کیا جائے۔ اگر کھڑے ہو کر پڑھ سکتا ہے تو کھڑے ہو کر پڑھے اور اگر بیٹھ کر یا لیٹ کر پڑھ سکتا ہے تو بیٹھ کر اور لیٹ کر پڑھے اور اگر اشارے سے پڑھ سکتا ہے تو اشارے سے پڑھے کیوں کہ

﴿لا یکلف اللّٰہ نفساً الاّ وسعھا﴾ (البقرہ:۲۸۶)

''اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''

چنانچہ سیدنا عمران بن حصین ؓ فرماتے ہیں کہ مجھے بواسیر کا عارضہ تھا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز کے بارہ میں دریافت کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

کھڑے ہو کر نماز پڑھو، لیکن اگر کھڑے ہونے کی طاقت نہیں تو بیٹھ کر پڑھو، اور اگر بیٹھ کر پڑھنے کی بھی استطاعت نہیں تو اپنے پہلو پر لیٹ کر پڑھو۔

(رواہ البخاری: ۲/ ۱۱۷، وابوداؤد والترمذی وابن ماجہ والنسائی)

4- اگر مریض وضو کرنے یا غسل کرنے سے عاجز ہو، یا وضو اور غسل اس کے لئے تکلیف اور مضرت کا باعث ہو تو وہ تیمم کر لے۔ چنانچہ سیدنا جابر ؓ فرماتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں تھے۔ دوران سفر ہم میں سے ایک شخص کے سر میں پتھر لگنے سے زخم آیا، پھر رات کو اسے احتلام ہو گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کیا اس حالت میں مجھے تیمم کرنے کی رخصت اور اجازت ہے؟ انہوں نے کہا: ہمارے نزدیک تو تمہیں کوئی رخصت نہیں کیوں کہ تو پانی کے استعمال پر قدرت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس نے (احتلام کی وجہ سے) غسل کیا اور اس کا انتقال ہو گیا۔ جب ہم سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور آپ کو اس بات کی اطلاع دی گئی، تو آپ نے نہایت افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ''انہوں نے اسے مار ڈالا اللہ انہیں قتل کرے۔ جب جانتے نہ تھے تو پوچھ کیوں نہ لیا؟ کیوں کہ عاجز اور معذور کی شفا سوال میں ہے، اس کے لئے صرف یہ کافی تھا کہ تیمم کر لیتا اور اپنے زخم پر پٹی باندھتا پھر اس پر مسح کر لیتا اور باقی جسم کو دھو لیتا۔

(اخرجہ ابوداؤد: ۱/ ۹۳، رقم: ۳۳۵، والدار قطنی: ۱/ ۱۹۰)

یہ جو کہا گیا کہ انہوں نے اس کو قتل کیا، اس سے مراد یہ ہے کہ وہ یہ فتویٰ دے کر اس کے قتل کا سبب بنے، اور قتلھم اللہ کا لفظ بطور بددعا نہیں بلکہ زجر و توبیخ کی غرض سے ہے۔

5- اللہ تبارک و تعالیٰ نے بیمار آدمی کو جہاد وغیرہ کئی امور سے معافی عطا فرما دی ہے۔ فرمایا

﴿لیس علی الاعمیٰ حرج، ولا علی الاعرج حرج ولا علی المریض حرج ﴾ (النور: ۶۱)

"نابینا پر کوئی حرج نہیں، لنگڑے پر کوئی حرج نہیں اور نہ ہی بیمار پر کوئی حرج ہے۔"

امام قرطبیؒ نے اسی آیت کی تفسیر میں لکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے عاجز ہونے کی وجہ سے یہ تکلیفات ان سے ساقط کر دی ہیں، اور جو شخص بھی عاجز ہوگا اس سے یہ تکلیفات ساقط ہو جائیں گی۔

6- ایک مریض کو جو حالت صحت میں کوئی نیک عمل کرتا تھا، لیکن بیماری نے اس کو وہ نیک عمل کرنے سے روک دیا، حدیث کی رو سے اس بیمار کو شفایاب ہونے تک اس اجر کا ثواب ملتا رہے گا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اذا سافر العبد أو مرض کتب اللہ له مثل ما کان یعمل صحیحاً﴾

(بخاری، باب رقم: ۱۳۴)

"جب کوئی آدمی سفر میں ہو یا بیمار ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے عمل کا ثواب لکھتے رہتے ہیں جیسا کہ وہ زمانہ صحت میں وہ عمل کرتا تھا اور اس کا ثواب لکھا جاتا تھا۔"

7- اسلام نے مریض کی عیادت کو مستحب قرار دیا ہے اور اس کو قربت الٰہی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ سیدنا ثوبان ؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿ان المسلم اذا عاد اخاہ المسلم لم یزل فی خرفة الجنة حتی یرجع﴾ (رواہ المسلم: ۲۵۶۸)

"مسلمان جب اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے تو واپس آنے تک

برابر جنت کے پھل چننے میں مصروف رہتا ہے۔"

ایک اور حدیث میں ہے جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔

"کوئی مسلمان جب کسی مسلمان کی صبح عیادت کرتا ہے تو ستر ہزار فرشتے شام ہونے تک اس پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں اور جب شام کے وقت عیادت کرتا ہے تو ستر ہزار فرشتے صبح تک اس پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں اور جنت میں اس کے لئے میوے ہوں گے۔

(ترمذی، رقم:۹۶۹، ابوداؤد، رقم:۳۰۹۸)

امام مسلم نے ایک باب "فضل عیادۃ المریض" کے عنوان سے قائم کیا ہے۔ اس میں ایک حدیث نقل کی ہے جس سے عیادت کی اہمت کا پتہ چلتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا: "اے ابن آدم! میں بیمار ہوا تو تو نے میری عیادت نہ کی۔" وہ عرض کرے گا! "اے میرے رب! تو تو سارے جہان کا رب ہے، میں تیری عیادت کیسے کرتا؟" اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا مگر تو نے اس کی عیادت نہیں کی، کیا تجھے نہیں معلوم کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔"

(مسلم، رقم:۵۰۶۹)

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اطعموا الجائع، وعودوا المریض، وفکوا العانی﴾

(بخاری، رقم۔۵۶۴۹)

"بھوکے کو کھانا کھلاؤ، بیمار کی عیادت کرو اور قیدی کو آزاد کراؤ۔"

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جب کوئی کسی مریض کی عیادت کرتا ہے تو آسمان سے ایک ندا دینے والا ندا دیتا ہے تو نے اچھا کیا۔ تیرا آنا اچھا ہوا اور تو نے اپنی منزل جنت بنالی۔"

(رواہ الترمذی، رقم:۲۰۰۹، ابن ماجہ:۱۴۴۳، جامع الاصول:۵۳۳/۹)

سیدنا ہارون بن ابی داؤد بیان کرتے ہیں کہ میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "اے ابو حمزہ! آپ کی رہائش دور ہے اور آپ کی عیادت میں ہمیں کچھ تکلیف اور زحمت ہوتی ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر اپنا سر اٹھایا اور فرمایا: "میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ فرماتے تھے کہ "جب کوئی شخص کسی مریض کی عیادت کرتا ہے تو وہ رحمت الٰہی میں ڈوب جاتا ہے، اور جب وہ (عیادت کے لئے) مریض کے پاس بیٹھتا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی رحمت ڈھانپ لیتی ہے۔" فرماتے ہیں: "میں نے عرض کیا!" یا رسول اللہ! ﷺ یہ تو (اجر وثواب) اس تندرست آدمی کے لئے ہے جو مریض کی عیادت کرتا ہے۔" مریض کے لئے کیا ہے؟" فرمایا: "اس کے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔"

(رواہ احمد فی مسندہ: ۳/۱۷۴، ورجالہ ثقات، مجمع الزوائد: ۲/ ۲۹۷، وللحدیث طرق اخریٰ عند الطبرانی فی الصغیر والاوسط)

اسلامی معاشرہ میں جب کوئی شخص بیمار پڑتا ہے تو کرب وتکلیف کے لمحات میں اس کو تنہائی اور اکیلے پن کا احساس نہیں ہوتا کیوں کہ اس کے ارد گرد تیمارداری اور عیادت کرنے والوں کا ایک ہجوم اور ان کی دعائیں اسے ڈھانپے رہتی ہیں۔ یہ صحیح معنوں میں انسانی ترقی ہے کہ ایک انسان کے دل میں دوسرے انسان کیلئے خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبات موجزن ہوں، خاص کر اس وقت جب وہ حزن وکرب اور بیماری میں مبتلا ہو۔ یورپ اور امریکہ میں جب کوئی شخص بیمار پڑتا ہے تو اس کو کسی ہسپتال میں داخل کرا دیا جاتا ہے اور سوائے ڈاکٹروں اور نرسوں کے اس کی عیادت کرنے والا اور کوئی نہیں ہوتا۔ اس سے تسلی بخش گفتگو، محبت آمیز لمس، فرحت آگین مسکراہٹ، پرخلوص دعا اور جذباتی ہم آہنگی کرنے والا اور کوئی نہیں ہوتا اور وہ بستر مرض پر موت کے انتظار میں یا بیماری سے شفا کے انتظار میں اکیلا پڑا رہتا ہے۔

مریض کی عیادت سے اس مریض پر اور اس کے اہل خانہ پر بڑا گہرا نفسیاتی اثر پڑتا ہے جس سے اس کو جلد شفایاب ہونے کی امید بندھتی ہے اور اس کے اہل خانہ کو ایک گونہ تسلی اور اطمینان ہوتا ہے کہ مریض جلد شفایاب ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے سرکار دو

عالم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام ﷺ مریضوں کی عیادت میں سستی اور کوتاہی نہ کرتے تھے، اوران کی مزاج پرسی کرتے ہوئے دعا اور غم خواری کے کلمات کا اظہار فرماتے تھے، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے غیر مسلموں کی بھی عیادت کی۔

9- اسلام نے غیر مسلموں کی عیادت کو بھی مستحسن قرار دیا۔ چنانچہ سیدنا انس بن مالک ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی لڑکا رسول اللہ ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ بیمار ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ نے اس کے سرہانے بیٹھ کر فرمایا: ''اسلام قبول کرلو'' اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا: ''ابو القاسم ﷺ کی بات مان لو۔'' وہ اسلام لے آیا۔ نبی ﷺ باہر تشریف لائے تو فرمایا:

﴿الحمد لله الذی انقذه من النار﴾ (بخاری:۱۰/۵۶۵۷)

''اللہ کا شکر ہے جس نے اسے جہنم سے بچالیا۔''

10- عیادت کرنے والا مریض کے سرہانے بیٹھے اور اس کی شفا کے لئے دعا کرے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی عادت کے بارہ میں سیدنا عبداللہ بن عباس ﷺ فرماتے ہیں کہ آپ جب کسی مریض کی عیادت فرماتے تو اس کے سرہانے بیٹھ کر سات مرتبہ یہ دعا پڑھتے:

﴿اسئل الله العظیم، رب العرش العظیم، ان یشفیک﴾

''میں اللہ بزرگ و برتر جو عرش عظیم کا رب ہے، دعا کرتا ہوں کہ تمہیں شفا دے۔'' (ابوداؤد رقم:۳۱۰۹، ترمذی:۲۰۸۳)

بعض روایات میں ہے کہ داہنے ہاتھ سے مریض کے جسم کو چھوا جائے اور مریض کے لئے دعا کی جائے جیسا کہ سیدہ عائشہ صدیقہ ﷺ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بعض گھر والوں کی عیادت کرتے تو اپنا داہنا ہاتھ مریض کے جسم پر پھیرتے اور فرماتے تھے:

﴿اللهم رب الناس، اذهب الباس، اشفه وانت الشافی، لاشفا الا

شفاءً لا یغادر سقماً﴾ (بخاری، رقم: ۵۷۴۳، مسلم، رقم: ۵۷۰۷ ۲۱۹۱)

''اے اللہ تمام لوگوں کے پروردگار، تکلیف کو دور فرما کر اس کو شفا عطا فرما، تو ہی شفا دینے والا ہے۔ تیری ہی شفا ہے، ایسی شفا مرحمت فرما جو بیماری کو نہ چھوڑے۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ایک اعرابی کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ جب آپ کسی کی عیادت کے لئے تشریف لے جاتے تو فرماتے:

﴿لاباس طهور ان شاء الله تعالیٰ﴾ (بخاری، رقم: ۵۶۵۶)

''گھبراؤ نہیں بیماری ان شاء اللہ (گناہوں سے) پاک کرنے والی ہے۔''

11- یہ مستحب ہے کہ عیادت کرنے والا مریض سے کہے کہ میرے لئے دعا کرو کیوں کہ مریض کی دعا مستجاب ہوتی ہے۔ چنانچہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تم مریض کے پاس (عیادت کے لئے) جاؤ تو اس سے کہو کہ وہ تمہارے لئے دعا کرے کیوں کہ اس کی دعا فرشتوں کی دعا کی طرح ہے۔'' (ابن السنی، رقم: ۵۶۲)

اور روایات میں بھی آتا ہے کہ بیمار اور مسافر کی دعا قبول ہوتی ہے۔

12- مرض سے اگرچہ مریض کو چند روز تکلیف ہوتی ہے لیکن بیماری مسلمان کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان کو کوئی رنج اور بیماری، غم اور حزن، کوئی تکلیف اور ایذا یہاں تک کہ جو کانٹا بھی اس کو چبھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔''

(بخاری، رقم: ۵۶۴۲، مسلم، رقم ۲۵۷۳)

بڑھاپے کے حقوق

بڑھاپا انسان کی اس آخری زندگی کے ایام کو کہتے ہیں جب انسان کی تمام ہڈیاں اور جوڑ کمزور ہو جاتے ہیں، سر میں چاندی چھا جاتی ہے، جسم کی تمام قوتیں اور توانائیاں زوال پذیر اور انحطاط کی آخری حد تک پہنچ جاتی ہیں، انسان نہ صرف جسمانی طور پر کمزور ہو جاتا ہے بلکہ اس کی عقل اور تمام نفسانی اور نفسیاتی قوتیں بھی ضعیف اور کمزور ہو جاتی ہیں۔ یادداشت اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور وہ ہر لمحہ اپنے کو اس دار فنا سے دار بقاء کی طرف منتقل ہونے کے انتظار میں گزارتا ہے۔ اس بڑھاپے کے زمانہ کے لیے اولاد کو خصوصی ہدایات دی گئیں کہ والدین کے اس بڑھاپے کے دور میں ان کی طرف خصوصی توجہ کی جائے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

''اگر تمہاری زندگی میں وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک بڑھاپے کو پہنچ جائے تو ان کو اف تک نہ کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے ادب سے بات کرنا، ان کے سامنے عاجزی اور رحم دلی کا بازو جھکائے رکھنا اور یہ دعا کرنا: اے میرے رب! ان پر رحم فرما جیسا انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی تھی۔'' (بنی اسرائیل: ۲۳۔۲۴)

اس سلسلہ میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ناک خاک آلود ہو، ناک خاک آلود ہو، پھر ناک خاک آلود ہو۔'' آپ ﷺ سے پوچھا گیا: ''کس کی، اے اللہ کے رسول!'' فرمایا: جس نے اپنے ماں باپ کے بڑھاپے کو پایا، یا ان میں سے کسی ایک کے یا دونوں کے، پھر وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوا۔ (رواہ مسلم: رقم: ۲۵۵۱)

بوڑھوں کی عزت و تکریم کرنا اور ان کے بڑھاپے کا خیال رکھنا صرف اولاد تک محدود

نہیں بلکہ ہر شخص کے ذمہ یہ ضروری قرار دیا گیا کہ وہ بوڑھے شخص کی عزت و تکریم کرے، کیونکہ بوڑھا ہونا بذات خود ایک بہت بڑا اکرام ہے۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو ہمارے بڑے کی تکریم نہ کرے اور ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے اور ہمارے عالم کا حق نہ پہچانے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''

(رواہ احمد: ۱۸۵/۳، مستدرک حاکم: ۱۲۲/۱)

جو شخص کسی بوڑھے یا بزرگ کی اس کے بڑھاپے میں اس کی عزت و تکریم کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے بڑھاپے میں اس کی عزت و تکریم کروائے گا۔

(ترمذی، رقم: ۲۰۲۳، الفتح الکبیر: ۳۱۵/۱)

اسلام نے کبیر السن اور بوڑھے لوگوں کی عمر کی رعایت فرماتے ہوئے جنگ و قتال کے وقت میں ان کے بارے میں خصوصی حکم دیا۔ چنانچہ آپ ﷺ جب بھی جہاد کے لیے فوج روانہ فرماتے تو اس کے سپہ سالار کو یہ خصوصی حکم فرماتے:

﴿ولا تقتلوا شیخاً فانیاً، ولا طفلاً، ولا امرأة﴾
''کسی شیخ فانی کو قتل نہ کرنا اور نہ کسی بچے اور عورت کو قتل کرنا۔''

(رواہ ابوداؤد عن انس رضی اللہ عنہ مرفوعاً، الفتح الکبیر: ۲۸۲/۱)

رسول اللہ ﷺ وسلم نے جب جیش اسامہ رضی اللہ عنہ تیار کیا تو انہیں دس باتوں کا حکم فرمایا:

''اے لوگو! میں تم کو دس باتوں کا حکم دیتا ہوں، میری ان باتوں کو کوزۂ ذہن میں محفوظ رکھنا۔ خیانت نہ کرنا، کسی بوڑھے کو قتل نہ کرنا، کسی عورت کو قتل نہ کرنا، کسی درخت کو جڑ سے نہ اکھاڑنا، اور نہ جلانا، کسی پھل دار درخت کو نہ کاٹنا، کسی بکری کو، کسی گائے اور اونٹ کو ذبح نہ کرنا مگر کھانے کے لیے، عنقریب تم ایسے لوگوں کے پاس سے گزرو گے جنہوں نے اپنے آپ کو گرجاؤں کے لیے یا عبادت کے لیے وقف کر رکھا ہے، ان کو کچھ نہ کہنا، کچھ لوگ تمہیں ایسے بھی ملیں گے جو مختلف کھانے تمہارے سامنے پیش کریں گے، جب تم ان میں سے کچھ کھاؤ تو اس پر اللہ کا نام لے لینا۔'' (طبری: ۲۲۷/۳)

میت کے حقوق

اسلام نے نہ صرف زندہ لوگوں کے حقوق مقرر کیے ہیں بلکہ مرنے والے کے حقوق بھی اسلام نے متعین کیے ہیں۔ یہ انسان کی عظمت اور بزرگی کی وجہ سے ہے، اسلام میں نہ صرف ایک زندہ انسان باعث عظمت ہے بلکہ جب اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جاتی ہے، اس کے بعد بھی اسلام نے انسان کی عظمت اور بزرگی کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اسلام نے ضروری قرار دیا کہ مرنے کے بعد میت کو اچھے طریقے سے غسل دیا جائے، اس کی تطہیر و تنظیف کی جائے، اس کو خوشبو وغیرہ لگائی جائے۔ اس کے غسل و کفن کا اچھے طریقے سے اہتمام کیا جائے جس میں اس کی ستر پوشی کا پورا پورا خیال کیا جائے۔ اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے اور اس کے لیے دعا مغفرت کی جائے۔ پھر اس کو نہایت وقار اور اعزاز و اکرام کے ساتھ قبر میں دفن کیا جائے۔ یہ سب حقوق ایک مسلمان کے اس دنیا سے جانے کے بعد کے ہیں۔ چنانچہ ایک مسلمان کے مرنے کے بعد اس کے دوست احباب اور رشتہ داروں اور وارثوں پر کچھ حقوق لازم ہیں۔

سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ موت کیا ہے؟ موت ایک ایسی صفت ہے جو صفت حیات کے تغیر پر بدن کو عارض ہوتی ہے۔ یہ فقط روح کے بدن سے جدا ہونے کا نام نہیں بلکہ ایک وجودی شے ہے جس کی قرآن حکیم کی رو سے تخلیق کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿خلق الموت والحیاۃ﴾ (الملک:۲)

''اللہ تعالیٰ نے موت کو بھی پیدا کیا اور حیات (زندگی) کو بھی۔''

اس آیت کی رو سے جس طرح حیات کی خلقت ہوئی ہے اسی طرح موت کی بھی اپنی ایک خلقت ہے۔ اپنا ایک وجود ہے، لہٰذا اسے محض روح و بدن کی مفارقت سے تعبیر کرنا اور ایک عدمی شے قرار دینا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ علمائے اسلام نے موت کو ایک عدمی شے قرار دینے کو غلط کہا ہے۔ (روح المعانی: ۲۹/۴)

امام رازیؒ نے بھی لکھا ہے کہ موت کوئی عدمی صفت نہیں بلکہ ایک وجودی صفت ہے۔ (تفسیر کبیر: ۸/۱۷۰)

موت کوئی بری شے نہیں بلکہ ''مومن کے لیے تحفہ'' ہے۔ (مستدرک حاکم: ۴/۳۱۹)

ایک مکان سے دوسرے مکان اور ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہونے کا نام موت ہے۔ (حلیۃ الاولیاء: ۵/۲۸۷)

امام احمدؒ نے اپنی مسند میں اور امام سعید بن منصورؒ نے اپنی سنن میں صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اکثروا ذکر هاذم اللذات یعنی الموت﴾

''تمام لذتوں کو ختم کر دینے والی چیز موت کو کثرت سے یاد کرو۔''

(ترمذی، رقم: ۲۳۰۸، نسائی: ۴/۴، ابن ماجہ، رقم: ۴۲۵۸، حلیۃ الاولیاء، ۶/ ۳۵۵)

امام ترمذیؒ نے اس بارے میں ایک اور حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد پیش آنے والے واقعات کے لیے تیاری کرے، اور عاجز اور کم عقل وہ ہے جو اپنے نفس کا اتباع کرے اور اللہ تعالیٰ پر بڑی بڑی امیدیں باندھتا پھرے۔''

(ترمذی، رقم ۲۴۵۹، ابن ماجہ: ۴۲۶۰، مسند احمد: ۴/۱۲۴)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿الموت کفارة لکل مسلم﴾

(حلیۃ الاولیاء: ۳/۱۲۱، تاریخ بغداد: ۱/ ۳۴۷)

''موت ہر مومن کے لیے گناہوں کا کفارہ ہے۔''

مومن اپنے مرض الموت میں جو رنج اور تکالیف اٹھاتا ہے وہ بھی اس کے گناہوں کے لیے کفارہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ:

''مومن کو جب بھی کوئی تکلیف، بیماری یا اور کوئی رنج والم پہنچتا ہے تو اس سے اس کے گناہ جھڑتے ہیں جس طرح درخت سے سوکھے ہوئے پتے گرتے ہیں۔''

(مسلم، رقم: ۲۵۷۱، ۱۹۹/۴)

اسی قسم کی ایک اور روایت موطا امام مالکؒ میں بھی مذکور ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جس سے بھلائی اور نیکی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو کسی تکلیف میں مبتلا فرما دیتے ہیں۔''

(موطا امام مالک: ۹۴۱/۲)

موت کے وقت اللہ سے حسن ظن رکھنا:

حدیث میں ہے ''انا عند ظن عبدی بی'' (میں اپنے بندے سے وہی سلوک کروں گا جیسا وہ میرے متعلق گمان کرے گا۔) تمام زندگی میں ایک بندے کو اپنے اللہ سے ہمیشہ حسن ظن رکھنا چاہیے لیکن موت کے وقت تو حسن ظن رکھنے کی خاص تاکید آئی ہے۔ چنانچہ مسلم میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو آپ ﷺ کی وفات سے تین روز قبل یہ فرماتے ہوئے سنا:

''تم میں سے ہرگز کوئی نہ مرے مگر اس حالت میں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھتا ہو۔''

(مسلم، رقم: ۲۸۷۷، ابوداؤد، رقم: ۳۱۱۳، ابن ماجہ، رقم: ۴۱۶۷، مسند احمد: ۲۹۳/۳، ۳۱۵، ۳۲۵، ۳۳۰، ۳۳۴، ۳۹۰)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک نوجوان کے پاس نزع کی حالت میں تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: ''تم اس وقت کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' اس نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! مجھے اللہ تعالیٰ سے (مغفرت) کی امید بھی ہے اور اپنے گناہوں کا خوف بھی۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ یہ دو چیزیں کسی قلب میں جمع نہیں فرماتے مگر یہ کہ جس شے کی وہ امید رکھتا ہے اس کو وہ عطا فرما دیتے ہیں، اور جس شے کا اسے خوف ہوتا ہے اس سے محفوظ فرما دیتے ہیں۔ (سنن ابن ماجہ: ۲/۴۲۳)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تم کسی شخص کو نزع کی حالت میں دیکھو تو اس کو رب سے ملاقات کرنے کی خوشخبری اور بشارت سناؤ، اور یہ اللہ سے حسن ظن ہے، اور جب وہ زندہ ہو تو اس کو اللہ تعالیٰ کا خوف دلاتے رہو۔''

کلمہ طیبہ کی تلقین:

آدمی جب نزع کی حالت میں ہو تو اسے کلمہ طیبہ یعنی لا الہ الا اللہ کی تلقین کرنا چاہیے تاکہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہو۔ چنانچہ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لقنوا موتاکم لا الٰہ الا اللہ﴾

''مرنے والوں کو لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کیا کرو۔''

(مسلم، رقم: ۹۱۶، ۲/۶۳۱، ترمذی: ۳/۳۰۶، ابوداؤد: ۳/۱۹۰، رقم: ۳۱۱۷، نسائی: ۴/۵)

حافظ ابن ابی الدنیا نے سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تم مرنے والے کے پاس جاؤ تو اسے لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کرو، کیونکہ جس بندے کا خاتمہ اس پر ہو گیا اس کے لیے یہ جنت کا زادِ راہ ہوگا۔

اس بارے میں ابی نعیمؒ نے بھی ایک روایت نقل کی ہے کہ سیدنا واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اپنے مرنے والوں کے پاس موجود رہا کرو اور انہیں لا الٰہ الا اللہ کی تلقین اور جنت کی بشارت دیا کرو کیونکہ بڑے بڑے سمجھدار اور ہوشیار لوگ بھی اس معرکہ میں متحیر ہو جاتے ہیں، اور اس کش مکش میں شیطان ابن آدم سے بہت زیادہ قریب ہوتا ہے (تاکہ اس آخری وقت میں اس کے ایمان کو خراب کر

سکے کیونکہ اب اس کے پاس توبہ کے لیے بھی وقت نہیں ہے۔) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، ملک الموت کو دیکھ لینا تلوار کی ہزار ضرب سے زیادہ سخت ہے، اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، بندے کی روح جب اس سے نکلتی ہے تو اس کے بدن کا ہر بال اس سے تکلیف پاتا ہے۔'' (حلیۃ الاولیاء: ۱۸۶/۵)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کو لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کرنا سنت ماثورہ ہے، اور مسلمانوں نے ہر دور میں مرنے والے کا یہ حق سمجھ کر اس پر عمل کیا ہے، کیونکہ جب مرنے والے کا آخری کلام لا الٰہ الا اللہ ہو تو یہ ایک بہت بڑی سعادت ہے اور جنت کے لیے زادِ راہ ہے۔ چنانچہ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿من كان آخر كلامه لا اله الا الله دخل الجنة﴾

''جس کا آخری کلام لا الٰہ الا اللہ ہوا وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

(ابوداؤد: ۱۹۰/۳، رقم: ۳۱۱۶، مسند احمد: ۲۳۳/۵، ۲۴۷)

اس سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رہے کہ مرنے والے کو صرف ایک مرتبہ لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کرنی چاہیے۔ بار بار نہیں کہنا چاہیے کہیں وہ چڑ نہ جائے اور کلمہ پڑھنے سے انکار ہی نہ کر دے۔ چنانچہ عبداللہ بن مبارکؒ فرمایا کرتے تھے: ''مرنے والے کو لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کیا کرو، اور جب وہ یہ کلمہ کہہ دے تو پھر اسے چھوڑ دو۔

مرنے والے کی اچھائی بیان کرنا:

مریض یا مرنے والے کے پاس بیٹھ کر اس کی اچھی باتیں اور اس کے محاسن بیان کرنے چاہئیں نہ کہ اس کے عیوب اور بری باتوں کو بیان کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سرورِ کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اذا حضرتم المريض او الميت، فقولوا خيراً فان

الملائکة یؤمنون علی ماتقولون﴾

''جب تم کسی مریض یا مرنے والے کے پاس جاؤ تو اس کے بارے میں اچھی بات ہی کہو، کیونکہ جو کچھ تم کہتے ہو اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں۔''

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کے مرض الموت میں اس وقت تشریف لائے جب ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی نظر پھٹ چکی تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی آنکھوں کو بند فرمایا۔ پھر فرمایا کہ روح جب قبض کی جاتی ہے تو آدمی کی نگاہ اس کے پیچھے جاتی ہے۔ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کے گھر والوں نے اس پر رونا دھونا شروع کر دیا۔ آپ نے فرمایا: ''اس کے بارے میں کوئی نازیبا بات نہ کہو کیونکہ جو کچھ تم کہتے ہو، فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿اللھم اغفر لابی سلمه وارفع درجته فی المھدیین، واخلفه فی عقبه فی الغابرین، واغفرلنا وله یارب العالمی، وافسح له فی قبره ونورله فیه﴾

(مسلم: ۲/ ۶۳۴، رقم: ۹۲۰، ترمذی: ۳/ ۳۰۷، رقم: ۹۷۷، ابوداؤد، رقم: ۳:۱۵، نسائی: ۴/ ۵)

مستحب ہے کہ مرنے والے کے پاس سورۃ یٰسین پڑھی جائے کیونکہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿مامن میت یموت فتقرأ عنده یس الاھون الله علیه﴾

(مسند الفردوس عن ابی الدرداء رضی اللہ عنہ)

''مرنے والے کے پاس یٰسین پڑھی جائے تو اللہ تعالیٰ قبض روح میں آسانی فرما دیتے ہیں۔''

مرنے کے بعد اس کے منہ کو کسی کپڑے کے ساتھ باندھ دینا چاہیے، اس کی آنکھوں کو بند کر دینا چاہیے، اور اس کے تمام اعضاء کو نہایت آرام کے ساتھ سیدھا کر دینا چاہیے۔ اور اس کو چادر سے ڈھانپ دینا چاہیے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی جب

وفات ہوئی تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ کو ایک دھاری دار چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔ (بخاری، رقم: ۵۸۱۴، مسلم: ۹۴۲ کتاب الجنائز)

میت کو چومنا بھی جائز ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو ان کے انتقال کے بعد انہیں بوسہ دیا۔ اور جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو سیدنا ابوبکر صدیق تشریف لائے، آپ کے چہرۂ اقدس سے چادر ہٹائی اور آپ کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور کہا: "یا نبیاہ، یا صفیاہ" (فقہ السنۃ: ۱/۵۰۲)

میت کا قرض ادا کرنا:

یہ بھی سنت ہے کہ مرنے والے کا قرض جتنی جلدی ہو سکے ادا کیا جائے۔ چنانچہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿نفس المومن معلقة بدينه حتى يقضى عنه﴾

(رواہ الترمذی، رقم: ۱/۵۰۲)

"مومن کی روح اپنے قرض کی وجہ سے معلق رہتی ہے جب تک کہ اس کو ادا نہ کیا جائے۔"

یہ اس صورت میں ہے جب مرنے والا مال چھوڑ کر مرا ہو تو اس کے ترکہ سے سب سے پہلے اس کا قرض ادا کیا جائے۔ اگر کوئی شخص کسی سے قرض لیتا ہے، اور قرض ادا کرنے کی نیت ہے اور کوشش بھی کرتا ہے کہ قرض جلد از جلد ادا کر دیا جائے، پھر اگر وہ قرض ادا کرنے سے قبل مر گیا تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں اس کا ولی اور ذمہ دار ہوں۔

(مسند احمد: ۶/۷۴، مسند ابی یعلی، رقم: ۴۸۱۹، زوائد المسند، رقم: ۶/۹۸، مجمع الزوائد: ۴/۱۲۸)

ایک روایت میں ہے کہ جس شخص نے کسی سے کوئی قرض لیا اور نیت یہ ہے کہ وہ اس کو واپس نہیں کرے گا تو اس نے اس شخص سے دھوکہ کیا کہ اس کا مال لے لیا۔ پس اگر وہ قرض ادا کیے بغیر مر گیا تو قیامت کے روز وہ اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملاقات کرے گا کہ وہ چور ہوگا۔" (مجمع الزوائد: ۴/۱۲۷، معجم الاوسط طبرانی، رقم: ۲۲۱۳)

غسل المیت:

میت کو غسل دینا فرض کفایہ ہے، اور جو شخص میت کو غسل دیتا ہے اس کے لیے حدیث میں اجر عظیم بتایا گیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص کسی مومن کو غسل دیتا ہے اور اس کے عیوب کو چھپاتا ہے، حق تعالیٰ شانہ اس کی چالیس مرتبہ مغفرت فرماتے ہیں، اور جو اس کے لیے قبر کھودتا ہے اس کو اتنا اجر ملتا ہے، اور جو اس کو کفن دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو سندس اور استبرق یعنی دیباج وکمخواب کا لباس پہنائے گا۔

(رواہ الحاکم: ۱/۳۵۴، ۳۶۲، تلخیص احکام الجنائز، الالبانی: ص: ۳۰)

میت کو خوشبو کی دھونی دینے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿اذا أجمرتم المیت فاجمروہ ثلاثاً﴾

''جب تم میت کے کپڑوں کو دھونی دو (خوشبو کی) تو تین بار دھونی دو۔''

غسل دیتے وقت مردہ کے ستر کو دیکھنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

﴿لاتنظر الیٰ فخذ حی ولا میت﴾

(سنن کبریٰ نسائی: ۱/۲۲۰، رقم: ۲۰۹۳، مسلم نحوہ: ۲/۶۵۱)

''کسی زندہ اور مردہ کی ران کو نہ دیکھو۔''

میت کو کفن دینا:

میت کو کفن دینا فرض کفایہ ہے۔ مردوں کے لیے مسنون تین کپڑے ہیں۔ آزار، کرتا اور لفافہ، اور عورت کے لیے مسنون پانچ کپڑے ہیں: کرتا، آزار، اوڑھنی، لفافہ اور سینہ بند۔ (بخاری: ۱/ ۳۲۸، مسلم: ۲/ ۶۴۹)

میت کو کفن اچھا دینا چاہیے، اور وہ سفید رنگ کا ہو، لیکن کفن زیادہ قیمتی نہ ہو، مگر صاف ستھرا اور بدن کو ڈھانپنے والا ہو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اذا کفن احدکم اخاہ فلیحسن کفنہ ان استطاع﴾

''جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کفن دے تو اپنی استطاعت

کے مطابق اچھا کفن دے۔"

(مسلم: ۲/ ۶۵۱، رقم: ۹۴۳، ابوداؤد: ۳/ ۱۹۸، رقم: ۳۱۵۰، ترمذی، رقم: ۹۹۵، ابن ماجہ: ۱/ ۳۶۹، مسند احمد: ۱/ ۳۲۹، اومسند الفردوس بنحوہ: ۱/ ۱۴۳، رقم: ۳۱۹)

سفید کفن ہونا مستحب ہے۔ چنانچہ فرمایا "سفید کپڑے پہنا کرو کیونکہ سفید کپڑے سب سے اچھے ہیں، اور مرنے والوں کو بھی سفید کفن دو۔ (وکفنوا فیہا موتاکم)

(مسند احمد: ۱/ ۳۲۸)

میت پر نماز جنازہ:

میت پر نماز جنازہ فرض کفایہ ہے، اور اس کے لیے باجماعت ضروری اور واجب ہے، اور اس میں میت اور نماز جنازہ پڑھنے والے دونوں کے لیے اجر عظیم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نماز جنازہ پڑھنے والے کی میت کے بارے میں شفاعت قبول فرماتے ہیں، اور نماز جنازہ پڑھنے والے کو اجر عظیم عطا فرماتے ہیں۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جب کوئی مومن انتقال کر جاتا ہے اور مومنوں کی تین صفیں اس کی نماز جنازہ پڑھتی ہیں تو اللہ تعالیٰ مرنے والے کی مغفرت فرما دیتا ہے۔ چنانچہ راوی حدیث سیدنا مالک بن ہبیرہ رضی اللہ عنہ اگر کسی کی نماز جنازہ پڑھتے اور لوگ کم ہوتے تو وہ ان کو (چھوٹی چھوٹی) تین صفوں میں کھڑا کر دیتے۔"

(رواہ ابوداؤد، رقم: ۳۱۶۶، ترمذی، رقم: ۱۰۲۸، حاکم: ۱/ ۳۶۲)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص جنازہ کے ساتھ جاتا ہے اور صرف اس پر نماز جنازہ پڑھتا ہے تو اس کو ایک قیراط ثواب ملتا ہے۔ اور دفن کرنے تک ساتھ رہتا ہے تو اس کو دو قیراط ثواب ملتا ہے۔ اور ایک قیراط احد پہاڑ کی مثل ہے۔ (رواہ البخاری: ۱/ ۴۴۵، رقم: ۱۲۶۱، مسلم: ۲/ ۶۵۳)

جنازہ کے ساتھ چلنا:

جنازہ کو اٹھا کر قبرستان تک لے جانا بھی سنت ہے۔ اور جنازہ کو جلدی لے جایا جائے۔ جنازہ میں دو طرح کی جلدی ہوتی ہے۔ ایک تو جنازہ اٹھانے میں جلدی کرنا،

دوسرے جب جنازہ لے جایا جا رہا ہو، اس وقت جلدی چلنا۔ بعض لوگ کسی شخص کے مرنے کے بعد کئی دنوں کا اس کی نعش رکھ چھوڑتے ہیں تا کہ اس کا فلاں رشتہ دار یا عزیز آجائے۔ ایسا کرنا اچھا نہیں ہے بلکہ مرنے والے کا فوری طور پر کفن دفن کا انتظام کرنا چاہیے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

''جب جنازہ کو اٹھا لیا جاتا ہے تو میت اگر صالح اور نیک ہو تو وہ کہتی ہے کہ مجھے جلدی لے چلو، مجھے جلدی لے چلو۔ اگر غیر صالح اور گناہوں سے کنارہ نہ کرنے والی ہو تو وہ کہتی ہے: ''افسوس! تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' اور اس کی آواز کو سوائے انسانوں کے اور سب سنتے ہیں۔ انسان اگر سن لے تو اس کی موت واقع ہو جائے۔''

(بخاری: ۳/۱۸۱، رقم: ۱۳۱۴، ۱۳۱۶، نسائی، باب السرعة بالجنازة، مسند احمد: ۳/۴۱)

باقی رہا جنازہ کو تیزی کے ساتھ قبر کی طرف لے جانا تو نسائی کی حدیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ سیدنا عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے جنازہ پر ان کے اعزاء و اقرباء نہایت آہستگی کے ساتھ چل رہے تھے۔ راستہ میں انہیں سیدنا ابوبکرہ رضی اللہ عنہ مل گئے جو کہ ایک خچر پر سوار چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے جب ان کا جنازہ لے جانے والوں کو دیکھا تو سواری سے اتر کر ان کو کوڑا لے کر چڑھ دوڑے اور فرمایا: ''تیز چلو، کیونکہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں ایسا ہی دیکھا ہے۔''

(نسائی، باب السرعة بالجنازة: ۴/۴۲، مسند احمد: ۵/۳۶، ۳۸)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے نبی اکرم ﷺ سے جنازہ کے ساتھ چلنے کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''رفتار بھاگنے سے کم ہو، اور اگر وہ نیک آدمی ہے تو اسے بھلائی تک پہنچایا جائے، اور اگر اس کے علاوہ ہے تو جہنم والوں کے لیے دوری ہے۔'' (ابوداؤد: ۳/۲۰۶، رقم: ۳۱۸۴، ترمذی: ۳/۳۳۲، رقم: ۱۰۱۱)

حافظ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں: ''اہل علم کی جماعت کا فیصلہ یہ ہے کہ عادی رفتار سے تھوڑا سا تیز چلنا چاہیے، اور تیزی ان کے نزدیک سستی سے زیادہ ناپسندیدہ ہے، لیکن ایسی تیزی ان کے نزدیک مکروہ ہے جو جنازہ کے ساتھ چلنے والے ضعیف اور کمزور

آدمیوں پر شاق ہو۔"

سوار جنازہ کے پیچھے چلیں اور پیدل چلنے والے جنازے کے آگے پیچھے دائیں بائیں چل سکتے ہیں۔ جیسا کہ ترمذی کی روایت میں ہے:

﴿الراكب خلف الجنازة، والماشي حيث شاء منها، والطفل يصلى عليه﴾ (ترمذی، رقم:۱۰۳۱)

"سوار جنازہ کے پیچھے اور پیدل جہاں چاہے، اور بچہ میت پر نماز جنازہ پڑھ سکتا ہے۔ لیکن عورتیں جنازہ کے ساتھ نہ جاسکتیں۔"

(بخاری، رقم:۱۲۷۸، مسلم:۹۳۸)

جنازہ کے ساتھ جو لوگ چل رہے ہیں وہ خاموشی سے چلیں، اونچی آواز سے کلمہ طیبہ یا کوئی اور ذکر کرنا مکروہ ہے، اگر ذکر کرنا چاہیں تو نیچی آواز سے (سری طور پر) کریں۔ جیسا کہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿يجب الصمت في ثلاث: عند الزحف، وقراة القرآن والجنازة﴾ (جامع الصغیر سیوطی:۱/۳۹۸)

"تین چیزوں میں خاموشی واجب ہے، لشکر میں، قراۃ القرآن میں اور جنازہ میں۔"

اور اکرام میت کے لیے یہ فرمایا کہ "جب تم جنازہ کو دیکھو تو اس کے لیے (یعنی اس کے اکرام کے لیے) کھڑے ہو جاؤ۔ (بخاری:۱/۳۳۰، مسلم:۵/۲۶)

اور ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ جنازہ کے ساتھ جا رہے ہیں وہ جب تک جنازہ رکھا نہ جائے اس وقت تک نہ بیٹھیں۔ مسلم:۷/۲۷)

میت کی تدفین:

میت کی تدفین فرض کفایہ ہے اور میت کو صبح و شام ہر وقت دفن کیا جا سکتا ہے، اس سے میت کے حقوق کی کوئی حق تلفی نہیں ہوتی، لیکن عمداً تین اوقات مکروہہ میں دفن کرنا اور نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے۔ اگر میت کے خراب ہونے کا خطرہ ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔

میت کو قبر میں دائیں پہلو پر رکھا جائے اور اس کا چہرہ جانب قبلہ ہو اور اس کو قبر میں رکھنے والے رکھتے وقت یہ کہیں "بسم اللہ وعلی ملۃ رسول اللہ ﷺ" اور کفن کے ربند کھول دیں۔

عورت کی میت قبر میں رکھتے وقت مستحب یہ ہے کہ اس پر کپڑا تان لیا جائے۔ بیہقی میں حدیث ہے کہ حارث الاعور رضی اللہ عنہ کی قبر پر جب کپڑا تانا گیا تو سیدنا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو کپڑا تاننے سے روکا اور فرمایا کہ یہ مرد ہے (لہٰذا نہیں تاننا چاہیے) اس حدیث کے بارے امام بیہقی فرماتے ہیں:

﴿وھذا اسناد صحیح وان کان موقوفا﴾

میت خواہ مرد کی ہو یا عورت کی اس کو قبر میں مرد ہی اتاریں۔ عورتیں نہیں اتار سکتیں۔ البتہ اگر میت عورت کی ہو تو اس کے محارم (قریبی رشتہ دار) اس کو قبر میں اتاریں تو بہتر ہے۔ اور جو لوگ دفن کے وقت موجود ہوں ان کے لیے مستحب ہے کہ وہ تین لپ مٹی کے قبر میں میت کے سر کی طرف سے ڈالیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا۔

(رواہ ابن ماجہ، نیل الاوطار: ۴/۹۸)

دفن سے فراغت کے بعد میت کے لیے استغفار کرنا مستحب ہے اور اس کی تثبیت (ثابت قدمی) کے لیے دعا کرنا کہ وہ منکر نکیر کے سوالات کے درست جواب دیں، بھی مستحب ہے۔ چنانچہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ جب کسی میت کی تدفین سے فارغ ہوتے تو اس کی قبر پر کھڑے ہو کر فرماتے:

﴿استغفروا لاخیکم وسلوا اللہ لہ التثبیت فانہ الآن یسال﴾

"اپنے بھائی کے لیے استغفار کرو اور اللہ سے اس کی تثبیت کا سوال کرو کیونکہ اب اس کا سوال و جواب ہو رہا ہے۔"

اور سنت یہ ہے کہ قبر زمین سے ایک بالشت اونچی ہو (زیادہ اونچی نہ ہو) تاکہ پتہ چلے کہ یہ قبر ہے، اس کو نہ روندا جائے نہ اس پر بیٹھا جائے یعنی قبر کا احترام و اکرام کیا جائے۔ پتھر یا لکڑی کی کوئی نشانی وغیرہ قبر پر رکھنی تاکہ پتہ چلے کہ یہ قبر ہے (یا فلاں کی قبر ہے) جائز ہے۔ (فقہ السنہ: ۱/۵۵۰)

مرنے والے کے محاسن بیان کرنا:

ہر مرنے والے کے محاسن اور معائب دونوں ہوتے ہیں لیکن شریعت نے اس کے معائب بیان کرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ صرف محاسن بیان کرنے کی تلقین کی۔

چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

﴿اذكروا محاسن موتاكم﴾

(رواہ ابوداؤد والترمذی فی کتاب الجنائز: ۱۰۱۹)

''اپنے مرنے والوں کے صرف محاسن کا تذکرہ کرو۔''

ایک روایت میں ہے:

﴿وكفوا عن مساويهم﴾

''یعنی اس کے نقائص اور برائیوں سے اعراض کرو۔''

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿لاتسبوا الاموات فتوذوا الاحياء﴾

''اپنے مرنے والوں کو برا بھلا نہ کہو اس سے زندوں کو تکلیف ہوتی ہے۔''

(اخرجہ الترمذی: ۳/۳۵۳، رقم: ۱۹۸۲، ابن حبان: ۷/۲۹۲، رقم: ۳۰۲۰، مسند احمد: ۱/۲۰۵، رقم ۱۷۵۱)

اس مضمون کی اور بھی کئی احادیث ہیں۔ (الفتح الکبیر: ۱/۱۴۳، ۲/۱۷، ۲/۳۲۲)

مردہ کا اکرام تو اسلام نے کیا ہی ہے، اسلام نے تو قبروں کا بھی احترام کیا ہے اور قبر کا احترام بھی دراصل مردہ کا احترام ہی ہے۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کوئی تم میں سے آگ کے انگارے پر بیٹھنا پسند کرے جس سے اس کے کپڑے اور جلد جل جائے لیکن کسی قبر پر نہ بیٹھے۔ (اخرجہ مسلم: ۲/۶۶۷، رقم: ۹۷۱)

یہ بھی اکرام میت میں سے ہے کہ میت کے جسم کی پوری پوری حفاظت کی جائے اور اس کے جسم کی کسی شے کو نہ تو نکالا جائے اور نہ ہی اس کی کسی ہڈی کو توڑا

جائے۔ بعض مرتبہ لوگ مرنے والے کی آنکھیں نکال لیتے ہیں۔ شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

﴿کسر عظم المیت ککسرہ حیا﴾

''کسی میت کی ہڈی کو توڑنا ایسا ہی ہے جیسے کسی زندہ کی ہڈی کو توڑنا۔'' (رواہ ابوداود فی کتاب الجنائز رقم: ۳۲۰۷، واحمد فی مسندہ: ۶/۸۵)

اہل میت کے لیے تعزیت:

مرنے والے کی موت کے بعد بھی اس کے اکرام کے لیے اسلام نے اس کے گھر والوں کے ساتھ تعزیت کرنے کو کہا ہے کیونکہ انہیں مرنے والے کی موت سے سخت تکلیف پہنچی ہے۔ چنانچہ شریعت نے گھر والوں کے ساتھ تعزیت کرنے کے لیے کہا ہے۔ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو مومن اپنے بھائی کی مصیبت میں تعزیت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو بزرگی کا حلہ پہنائے گا۔'' (رواہ ابن ماجہ فی الجنائز: ۱۶۰۱ والبیہقی بسند حسن)

میت کا سوگ:

میت کے اکرام کے لیے شریعت نے اس کے لیے سوگ کی بھی اجازت دی ہے۔ چنانچہ مرنے والے کی بیوی کے لیے فرمایا کہ وہ چار ماہ دس روز کے لیے زیورات اور ہر قسم کے میک اپ اور زیب و زینت اور خضاب وغیرہ لگانا ترک کردے، اور اس کی عدت بھی شریعت نے چار ماہ دس روز رکھی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً یتربصن بانفسھن اربعة اشھر وعشرا﴾ (بقرہ: ۲۳۴)

''اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں، اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ (عورتیں) اپنے آپ کو چار ماہ دس روز روکے رکھیں۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیوہ عورت کی عدت کا ذکر فرمایا ہے۔ وہ مدت جس میں عورت شوہر کے گھر میں بغیر نکاح کے ٹھہری رہے اور بغیر عذر شرعی کے گھر سے باہر نہ نکلے تاکہ

اس کے رحم کا استبراء ہو جائے، یا شوہر کی موت پر سوگ ہو۔ مطلقہ کے لیے یہ مدت تین حیض ہے اور بیوہ کے لیے یہ عدت چار ماہ دس دن ہے۔ اور جو عورت حاملہ ہو اس کی عدت وضع حمل ہے خواہ شوہر کی موت کے ایک ساعت بعد وضع حمل ہو جائے۔ عدت وفات میں مدخول بہا اور غیر مدخول بہا کا کوئی فرق نہیں ہے۔ چار ماہ دس دن تک سوگ کرنا صرف شوہر کی موت کے ساتھ خاص ہے، اور کسی عزیز رشتہ دار کی موت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرنا جائز نہیں ہے۔

بخاری میں روایت ہے: زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں سرکار دو عالم ﷺ کی زوجہ محترمہ سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئی۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''جو عورت اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کی موت پر تین روز سے زیادہ سوگ کرے سوائے شوہر کے اس پر چار ماہ دس روز سوگ کرے۔ پھر جب سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے بھائی فوت ہو گئے تو میں ان کے پاس گئی، انہوں نے خوشبو منگا کر اپنے جسم پر لگائی اور فرمایا کہ مجھے خوشبو لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، البتہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سنا ہے کہ جو عورت اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لیے کسی میت پر تین روز سے زیادہ سوگ کرنا جائز نہیں البتہ خاوند کی موت پر چار ماہ دس روز تک سوگ کرے۔'' (بخاری: ۱/۱۷۱)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''کوئی عورت کسی پر تین روز سے زیادہ سوگ نہ کرے سوائے خاوند کے جس کا سوگ چار ماہ دس روز ہے۔ اس دوران میں وہ کوئی رنگ دار کپڑا نہ پہنے اور نہ خوشبو اور سرمہ وغیرہ کا استعمال کرے، البتہ جب وہ حیض سے پاک ہو تو تھوڑی سی خوشبو استعمال کر سکتی ہے۔'' (رواہ مسلم، المختصر رقم: ۹۳۸)

میت کے لیے دعا:

میت کے لیے دعا کرنا بھی اس کا ایک حق ہے کیونکہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے سارے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، لیکن

تین عمل ایسے ہیں جن کا ثواب اس کو مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔(1) صدقہ جاریہ، (2) ایسا علم جس سے نفع اٹھایا جائے اور (3) نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔

(مسلم، رقم: ۱۶۳۱، مسند احمد: ۳۷۲/۲، ابوداؤد، رقم: ۲۸۸۰، ترمذی، رقم: ۱۳۷۶، نسائی: ۲۵۱/۶)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت کے لیے دعا کرنی چاہیے اور خصوصی طور پر اولاد کو دعا کرنی چاہیے۔

زیارت قبر:

میت کے اکرام کے لیے شریعت نے اس کے لیے زیارت قبر بھی مشروع کی ہے۔ زیارت قبر سے میت کا اکرام بھی ہے اور زندوں کے لیے وعظ ونصیحت بھی۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿كنت نهيتكم عن زيارة القبور، فزوروها، فانها تزهدني الدنيا وتذكر الآخرة﴾

''میں تمہیں قبروں کی زیارت سے روکا کرتا تھا، اب تم قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ اس سے دنیا سے بے رغبتی اور زہد اور آخرت کی یاد آتی ہے۔'' (ابن ماجہ: ۵۰۱/۱، رقم: ۱۵۷۱، مسلم، کتاب الجنائز، رقم: ۹۷۷)

چنانچہ رسول اللہ ﷺ بھی قبروں کی زیارت کیا کرتے تھے اور ان کے لیے دعا بھی کرتے تھے۔ (ابوداؤد: ۲۱۸/۳، ابن ماجہ: ۱۵۷۲، مسلم: ۶۷۱/۲)

جو شخص قبروں کی زیارت کے لیے جائے وہ قبرستان میں جا کر کہے:

﴿السلام عليكم دار قوم مومنين، وانا انشاء الله بكم لاحقون﴾

''اس قبرستان میں رہنے والے مومنو! تم پر سلام، ہم بھی ان شاء اللہ جلد تم سے ملنے والے ہیں۔''

(ابوداؤد: ۳۲۳۲، مسلم، رقم: ۹۷۵، نسائی: ۹۴/۴)

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ
(القرآن)

قصص بخاری

حدیث شریف کی اہم ترین کتاب "صحیح بخاری"
سے ماخوذ مستند ترین واقعات کا ایک خوبصورت مجموعہ

مؤلف
مولانا محمد ظفر اقبال سلمہ
(فاضل جامعہ [illegible])

بیت العلوم
۲۰- نابھہ روڈ، چوک پرانی انارکلی، لاہور۔ فون [illegible]

بھوک اور فاقہ کشی کے فوائد
اور
بسیار خوری کے نقصانات

اردو ترجمہ

کتاب الجوع

مصنف

ابن ابی الدنیا

ترجمہ و فوائد

مفتی ثناء اللہ محمود

بیت العلوم

۲۰ نابھہ روڈ، پرانی انار کلی لاہور۔ فون [illegible]

اطاعتِ والدین

والدین کی عظمت، اُن کی فرمانبرداری اور ان کے
حقوق کا مفید اور معلوماتی جامع تذکرہ

جناب حکیم محمود احمد ظفر

بیت العلوم
۲۰۔ نابھہ روڈ، پرانی انارکلی، لاہور۔ فون: [illegible]

دُنیا سے بے رغبتی

زہد و تقویٰ جیسے اہم موضوع پر امام بخاری کے استاذ شیخ عظیم محدث کبیر [illegible]
امام عبداللہ بن مبارک کی مستند و معروف عربی کتاب الزہد والرقائق کا پہلی بار
مکمل اردو ترجمہ جس کا مطالعہ ہر عام و خاص کے لیے یکساں مفید ہے اور [illegible]

اردو ترجمہ

کتاب الزھد

مؤلف

حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ

ترجمہ

لجنۃ المصنفین

بیت العلوم

۲۰ نابھہ روڈ، چوک پرانی انارکلی، لاہور

دیگر شہروں میں بیت العلوم کے اسٹاکسٹ

﴿ملتان﴾	﴿کراچی﴾	﴿راولپنڈی﴾
بخاری اکیڈمی مہربان کالونی ملتان	ادارۃ الانور بنوری ٹاؤن کراچی	الخلیل پبلشنگ ہاؤس راولپنڈی
کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان	بیت القلم گلشن اقبال کراچی	﴿اسلام آباد﴾
ٹکس بکس گلگشت کالونی ملتان	کتب خانہ مظہری گلشن اقبال کراچی	مسٹر بکس سپر مارکیٹ اسلام آباد
کتاب گھر حسن آرکیڈ ملتان	دارالقرآن اردو بازار کراچی	المسعود بکس F-8 مرکز اسلام آباد
فاروقی کتب خانہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان	مرکز القرآن اردو بازار کراچی	سعید بک بینک F-7 مرکز اسلام آباد
اسلامی کتب خانہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان	عباسی کتب خانہ اردو بازار کراچی	پیر بک سنٹر آبپارہ مارکیٹ اسلام آباد
دارالحدیث بیرون بوہڑ گیٹ ملتان	ادارۃ الانور بنوری ٹاؤن کراچی	﴿پشاور﴾
﴿ڈیرہ غازی خان﴾	علمی کتاب گھر اردو بازار کراچی	یونیورسٹی بک ڈپو خیبر بازار پشاور
مکتبہ زکریا بلاک نمبر ۲ ڈیرہ غازی خان	﴿کوئٹہ﴾	مکتبہ سرحد خیبر بازار پشاور
﴿بہاولپور﴾	مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ	لندن بک کمپنی صدر بازار پشاور
کتابستان شاہی بازار بہاولپور	﴿سرگودھا﴾	﴿سیالکوٹ﴾
بیت الکتب سرائیکی چوک بہاولپور	اسلامی کتب خانہ بھولوں والی گلی سرگودھا	بخش بک ڈپو اردو بازار سیالکوٹ
﴿سکھر﴾	﴿گوجرانوالہ﴾	﴿اکوڑہ خٹک﴾
کتب مرکز فریئر روڈ سکھر	والی کتاب گھر اردو بازار گوجرانوالہ	مکتبہ علمیہ اکوڑہ خٹک
﴿حیدرآباد﴾	مکتبہ نعمانیہ اردو بازار گوجرانوالہ	مکتبہ رحیمیہ اکوڑہ خٹک
بیت القرآن چھوٹی گلی حیدرآباد	﴿راولپنڈی﴾	﴿فیصل آباد﴾
حاجی امداد اللہ اکیڈمی جیل روڈ حیدرآباد	کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی	مکتبۃ العزیزی ستیانہ روڈ فیصل آباد
امداد الغربا کورٹ روڈ حیدرآباد	فیڈرل اسلام ہاؤس چاندنی چوک راولپنڈی	ملک سنز کارخانہ بازار فیصل آباد
بھنڈی بک ڈپو کورٹ روڈ حیدرآباد	اسلامی کتاب گھر خیابان سرسید راولپنڈی	مکتبہ اہلحدیث امین پور بازار فیصل آباد
﴿کراچی﴾	بک سنٹر ۳۲ حیدر روڈ راولپنڈی	اقراء بک ڈپو امین پور بازار فیصل آباد
ویلکم بک پورٹ اردو بازار کراچی	علی بک شاپ اقبال روڈ راولپنڈی	مکتبہ قاسمیہ امین پور بازار فیصل آباد